نئے افسانے کا معنوی استعارہ

(انتخاب اور تجزیہ)

ریوتی سرن شرما، بلراج کومل، گلزار، فیاض رفعت، ناصرہ شرما، عبدل بسم اللہ، سید محمد اشرف، حسین الحق، ساجد رشید، اعظم راہی، مظہر الزماں خاں، شوکت حیات، شموئل احمد، پیغام آفاقی، حسن جمال، طارق چھتاری، محسن خان، اسرار گاندھی، انجم عثمانی، حبیب کیفی، م۔ق۔خان، مشتاق احمد نوری، قمر جہاں، سلطان سبحانی، عارف ایوبی، اقبال انصاری، مشرف عالم ذوقی، نورالحسنین، ابواللیث جاوید، خورشید اکرم، دیپک بدکی، شاہد اختر، غزال ضیغم، احمد صغیر، اختر الاسلام، محمود شیخ، نفیس بانو شمع، قنبر علی، اظہار الاسلام، ناصر راہی۔۔۔۔

مقدمہ و ترتیب

راشد انور راشد

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO :+92 307 2128068 - +92 308 3502081

نئے افسانے کا معنوی استعارہ

(انتخاب اور تجزیہ)

مقدمہ و ترتیب

راشد انور راشدؔ

مکتبہ استعارہ

۲۴۸، غفار اپارٹمنٹس، غفار منزل ایکسٹینشن

استعارہ لین، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

© ''بحق استعارہ''

NAYE AFSANEY KA MAANVI ISTEARA

(Anthology with critical analysis)

by

Rashid Anwar Rashid

نام کتاب	:	نئے افسانے کا معنوی استعارہ
مصنف	:	راشد انور راشد
مستقل پتہ	:	اولڈ ہزاری باغ روڈ، اپوزٹ چونا بھٹہ پوسٹ جی پی او، رانچی۔ ۸۳۴۰۰۱ (جھارکھنڈ)
پتہ:	:	۲۲۲/۲، ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵
تعداد	:	۵۰۰
سالِ اشاعت	:	۲۰۰۱ء
کمپوزنگ	:	محمد اکرام خان
طابع	:	پرنٹ سینٹر، دریا گنج، نئی دہلی۔۲
ناشر	:	مکتبہ استعارہ، ۲۴۸، غفار اپارٹمنٹس، غفار منزل ایکسٹینشن استعارہ لین، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

تقسیم کار:

- مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ممبئی، علی گڑھ
- الکتاب، یتیم خانہ کمپلیکس، اراریا
- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ
- مکتبہ دین و ادب، امین الدولہ پارک، لکھنؤ
- آزاد کتاب گھر، ساکشی بازار، جمشید پور
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ علی گڑھ
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی
- ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

انتساب

والدین کے نام

جن کی انگلیاں تھام کر میں نے چلنا سیکھا اور لکھنا بھی!!

ترتیب

○ نیا افسانہ	پروفیسر گوپی چند نارنگ	۷
○ فکشن کی تنقید سے متعلق چند سوالات	محمد صلاح الدین پرویز	۱۱
○ اعتراف	مرتب	۱۳
○ نئے افسانے کا معنوی استعارہ	راشد انور راشد	۱۷

باب افسانہ:

○ باب افسانہ کا دیباچہ (ہاؤسنگ سوسائٹی)	قرۃ العین حیدر	۵۵
○ باب افسانہ کا دیباچہ (پنجرہ)	خالدہ اصغر	۵۷
○ آندھی وقت کی	ریوتی سرن شرما	۵۸
○ کنواں	بلراج کومل	۶۴
○ مائیکل اینجلو	گلزار	۷۰
○ گریہ	فیاض رفعت	۷۴
○ کنیز بچہ	ناصرہ شرما	۷۹
○ پیڑ	عبدل بسم اللہ	۹۴
○ قدیم معبدوں کا محافظ	سید محمد اشرف	۹۸
○ خانم	حسین الحق	۱۰۱
○ راکھ	ساجد رشید	۱۰۵
○ کبوتری	اعظم راہی	۱۱۱
○ ایک شہر جو کبھی آباد تھا	مظہر الزماں خان	۱۱۶
○ فرشتے	شوکت حیات	۱۱۹
○ منرل واٹر	شموئل احمد	۱۲۵

کوآپریٹو سوسائٹی	پیغام آفاقی	۱۳۰
ادھرمت بہو ہوا	حسن جمال	۱۳۸
برف اور پانی	طارق چھتاری	۱۴۸
نیند	محسن خان	۱۵۵
نالی میں اُگے پودے	اسرار گاندھی	۱۶۰
شہر گریہ کا مکیں	انجم عثمانی	۱۶۶
دھارا	حبیب کیفی	۱۶۹
ان کہی کہانی	م۔ق۔خان	۱۷۶
جن کی سواری	مشتاق احمد نوری	۱۸۱
انتظار	قمر جہاں	۱۸۷
مجسموں کے شہروں کا منظر نامہ	سلطان سبحانی	۱۹۱
حبوط	عارف ایوبی	۱۹۵
بھرے ہاتھ	اقبال انصاری	۲۰۰
فزکس، کیمسٹری، الجبرا...	مشرف عالم ذوقی	۲۱۱
پچھلے پہر کی خوشبو	نورالحسنین	۲۲۷
تیسری سمت کا سفر	ابواللیث جاوید	۲۳۰
قصہ ایک بے لطف شام کا	خورشید اکرم	۲۳۳
مانگے کا اجالا	دیپک بدکی	۲۴۱
دو پاؤں کا گھوڑا	شاہد اختر	۲۴۸
فیڈ آؤٹ فیڈ آن	غزال ضیغم	۲۵۳
انا کو آنے دو	احمد صغیر	۲۶۵
ایک فرشتے کا جنم	اختر الاسلام	۲۶۹
ماگندیا	محمود شیخ	۲۷۴
خالی کمان	نفیس بانو شمع	۲۷۷
بابا	قنبر علی	۲۸۳
موہن دھیر	اظہار الاسلام	۲۸۷
شبھ راتری	ناصر راہی	۲۹۰

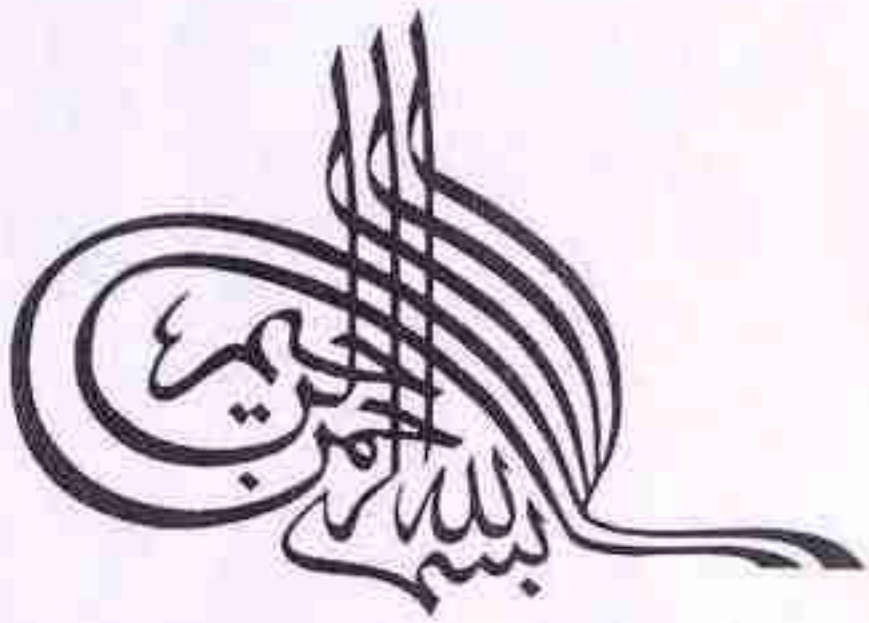
بسم الله الرحمن الرحيم

نیا افسانہ

علامتی اور تمثیلی کہانی کے مقلدین کے ہاتھوں اس کہانی کے مستقبل کو شدید خطرہ درپیش ہے۔ اب علامتی تمثیلی کہانی بھی ایک فیشن اور فارمولا بن گئی اور بہت سے نئے لکھنے والوں نے اسے رواجاً اختیار کر رکھا ہے۔ اس لیے لکھنے والوں کی تخلیق اور نئی کہانی دونوں کو نقصان پہنچا ہے۔ نئے افسانہ نگار بعض غلط فہمیوں کا شکار ہیں، ان غلط فہمیوں کا ازالہ بیحد ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو یہی بات غلط ہے کہ نئے افسانے کا سفر مختصر افسانے کی موت سے شروع ہونا چاہیے۔ یہاں مختصر افسانے سے عموماً غلط معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ ہمارے افسانہ نگار یہ بھول جاتے ہیں کہ مختصر افسانے میں ان کا انحراف کس چیز سے تھا، ترقی پسندی کی خطیبانہ رومانیت، جذباتیت اور فارمولا زدہ کہانی سے، ٹائپ کی سطحیت سے، اخلاقی آدرشوں کے کھوکھلے پن سے، نظریہ بازوں کی اشتہاریت سے اور خارجی تقاضوں کے تحت زندگی کی ادھوری، سطحی اور یک طرفہ ترجمانی سے یا اپنے لاشعور کے نہاں خانوں میں پڑی بھولی بسری کتھا اور کہانی کی روایت سے بھی، جو انسان کے صدیوں کے تجربوں اور ان سے حاصل ہونے والی دانش کا نچوڑ پیش کرتی ہے، انسان کی ازلی اور ابدی الجھنوں کو آئینہ دکھاتی ہے اور اس کی فطرت کے بھیدوں کو فاش کرتی ہے۔ یہ یاد رہنا چاہیے کہ ادب میں کتنی اور کیسی ہی تبدیلیاں کیوں نہ آئیں، ادب کا گہرا رشتہ ہمارے اجتماعی لاشعور کے صدیوں پرانے تقاضوں، نسلی اثرات اور تہذیبی مزاج و افتادِ طبع سے ضرور رہے گا۔ چنانچہ ایک ایسے معاشرے میں جو پنچ تنتر اور کتھا سرت ساگر کی دھرتی سے تعلق رکھتا ہو اور جس کی ذہنی تشکیل میں الف لیلہ، طلسم ہوش ربا اور حکایات گلستاں کا حصہ بھی رہا ہو، نیز جو زمانۂ قدیم سے قصے، کہانی، حکایت اور داستان کا رسیا رہا ہو اور جس میں کہانی کی روایت کتھا اور حکایت سے جڑی ہوئی ہو، اس میں کہانی کتنی ہی نئی کیوں نہ ہو جائے، وہ کہانی پن سے کلیۃً دامن کیسے چھڑا سکتی ہے۔ ایسا کرنے سے خدشہ ہے کہ خود کہانی کو نقصان پہنچے گا۔ چنانچہ اردو میں اس وقت یہی ہو رہا ہے۔ بلاشبہ شاعری میں جب مذاق بدلے گا تو ذوق کی تربیت کا تقاضا کیا جائے گا، لیکن کہانی میں اظہار کے مسائل خواہ علامتی ہوں یا استعاراتی، کہانی کا کہانی کے طور پر پڑھا جا سکنا بنیادی بات ہے۔ مثال کے طور پر اس دور کی کسی اہم کہانی کو لیجیے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے خواہ وہ قرۃ العین حیدر کی "ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی" ہو یا انتظار حسین کی "کایا کلپ" مین را کی "وہ" سریندر پرکاش کی "بدو شنک کی موت" انور سجاد کی "کونپل"، جوگندر پال کی "رسائی" خالدہ اصغر کی "سواری" یا بلراج کومل کی

''کنواں'' تو ایسی تمام کہانیوں میں یہ خوبی ملے گی کہ یہ علامتی و تمثیلی کہانی کے اعلیٰ ترین تخلیقی تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہیں اور ان میں بنیادی کہانی پن بھی ہے، یعنی ان میں اپنی صنف بیانیہ کی پہچان بھی ہے۔ ان کہانیوں کو، قطع نظر ان کے استعاراتی یا تمثیلی نظام یا تخلیقی معنویت کے، ایک عام کہانی کے طور پر بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ لیکن کتنی نئی کہانیاں اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ میرے نزدیک کہانی سے کہانی پن کا اخراج غیر افسانوی عمل ہے اور اس کی مذمت کرنی چاہیے۔ البتہ کہانی سے غیر ضروری رومانیت، جذباتیت یا فارمولا اندیشی کا اخراج تخلیقی عمل کا لازمہ ہے۔ کتنے نئے افسانہ نگار یہ سوچتے ہیں کہ بحیثیت کہانی کار کے ان کی اصل ذمہ داری کیا ہے۔ علامت یا تمثیل ذرائع ہیں، احساسِ حقیقت کے اظہار کے، یہ فن کی ایک سطح ہیں کل فن نہیں۔ اگر تجربے کی شدت یا احساس کی پیچیدگی اسکا تقاضا کرتی ہے کہ اظہار علامتی و تجریدی ہو، یعنی اس کے بغیر بات کہنی ممکن ہی نہیں، جیسا چھٹے دساتویں دہے کے بعض افسانہ نگاروں کے یہاں تھا، نیز جو، ان کی طرح استعاراتی و علامتی اظہار پر قادر بھی ہوں، تو فبہا، ورنہ کیا ضروری ہے کہ ہر کس و ناکس علامتی تمثیلی انداز میں کہانی لکھے۔ موضوع یا احساس کی بنا پر یا سوچنے کے رویے کے تقاضے کے طور پر یعنی اگر تخلیقی جواز ہو تو علامتی پیرایۂ بیان ناگزیر تسلیم کیا جاسکتا ہے، ورنہ اگر ہر بوالہوس حسن پرستی شعار کرنے لگے تو آبروے شیوۂ اہل نظر کا جاتے رہنا سامنے کی بات ہے۔ چنانچہ ہر افسانہ نگار کا بغیر کسی تجرباتی یا تخلیقی جواز کے علامتی انداز اختیار کرنا نئے افسانے کے حق میں مضر ثابت ہو رہا ہے۔ یہ بھی خاطر نشاں رہنا چاہیے کہ صرف شدید طور پر تخلیقی تناؤ Tension میں جکڑا ہوا ذہن ہی، استعاراتی و تمثیلی وسائل کو فنی اعتبار سے اطمینان بخش طریقے پر برت سکتا ہے، ورنہ کہانی الفاظ کا گورکھ دھندا ہو کر رہ جاتی ہے اور اپنا منہ چڑانے لگتی ہے۔ مختلف الجہات استعاروں کے ذریعے یا علامتی و تمثیلی پیرایے میں محسوسات یا تجریدات کو اس طرح بیان کرنا کہ کہانی کا حق بھی ادا ہو جائے اور استعاراتی معنویت بھی ابھر آئے، ہر لکھنے والے کے بس کی بات نہیں۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ نیا افسانہ لکھنا، نہایت آسان ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ افسانہ لکھنا شعر گوئی سے زیادہ مشکل ہے۔ ان دنوں اس بات سے تکلیف ہوتی ہے کہ مقلدین کی بھیڑ میں ان لوگوں کی آواز بھی کھو سی گئی ہے۔ جنھوں نے اردو افسانے کو نئے تجربوں کی تازگی دی تھی اور اسے نئی منزلوں کی طرف بڑھایا تھا۔ موجودہ حالات میں اس بات پر ضرور غور کر لینا چاہیے کہ اگر نئی کہانی، کہانی نہیں ہے تو پھر یہ کیا ہے؟ بعض حضرات تو اس کا کوئی دوسرا ''اچھا سا'' نام ڈھونڈتے پھرتے ہیں کیونکہ ایسی ناپختہ تحریروں کو نہ کہانی کہا جاسکتا ہے نہ انشائیہ، اگرچہ ایسے افسانوں میں جو کوشش ملتی ہے، وہ انشا پردازی ہی کی ذیل میں آتی ہے۔ دراصل تقلید کے جوش میں یاروں نے بستیاں بہت دور بسالی ہیں اور کہانی کے بنیادی تقاضوں ہی کو فراموش کر دیا ہے یا پیرایۂ اظہار یا وسیلۂ بیان ہی کو مقصود بالذات سمجھ لیا ہے۔ اردو افسانے میں اس وقت زیادہ تعداد ایسے لکھنے والوں کی ہے جن کے فکر و احساس میں چونکہ تازگی کی آگ نہیں، اس لیے ان کے پاس نئے

تجربوں کے فنی ادراک پر قادر تازہ کار نظر بھی نہیں۔ استعاراتی یا علامتی اظہار لفظوں، علامتوں، یا مجردات کا ڈھیر لگانے کا نام نہیں، نہ ہی یہ صنعت اہمال میں لفظوں کے بے ہنگم استعمال کا نام ہے۔ ایسی تحریروں کو نہ افسانہ کہا جاسکتا ہے نہ انشائیہ نہ کچھ اور۔ ایسی تحریروں کو کوئی ادبی درجہ دینا بھی شاید ادبی دیانت داری کے خلاف ہوگا۔ ان حضرات سے درخواست کرنی چاہیے کہ وہ علامتی و تمثیلی طریقۂ اظہار اختیار کرنے کے بجائے سیدھی سادی کہانی لکھیں، کیونکہ علامتی یا تمثیلی کہانی ہی تو کل کہانی نہیں۔ سیدھی سادی کہانی کی گنجائش بہرحال ہمیشہ رہے گی، کیونکہ یہ انسانی فطرت کے ایک بنیادی تقاضے کو پورا کرتی ہے، اور اس کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی۔ علامتی، استعاراتی کہانی صرف ان فنکاروں کے لیے ہے جن کے تجربات یا حسی رویے بالواسطہ Oblique پیرایۂ بیان کا تقاضا کرتے ہوں یا جن کے پاس کہنے کو کچھ ایسی بات ہو۔ بیانیہ کے کسی دوسرے انداز میں نہ کہی جاسکتی ہو، ورنہ دوسروں کے لیے بیانیہ Narrative کی وسیع دنیا ہے جس کو نظر انداز کرنے سے کہانی کو بھی اور زبان کو بھی نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ (۱۹۸۰)

(۲)

نئے افسانے نے بغاوت کی جو آگ روشن کی تھی تقریباً چوتھائی صدی کے سفر کے بعد اب وہ آگ ٹھنڈی پڑنے لگی ہے اور نیا افسانہ ایک ایسے دوراہے پر آگیا ہے جہاں نئے سوال پیدا ہونے لگے ہیں کہ اب اس کا سفر کس سمت میں ہوگا۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ نئی کہانی انحراف سے زیادہ اجتہاد اور انقطاع کے لمحوں کی پیداوار تھی۔ نئے افسانہ نگار فکر و احساس اور اظہار و اسلوب کے یکسر نئے مسائل سے دوچار تھے۔ ان کے دلوں میں ایک انجانا کرب اور نئی آگ تھی، جس کی وجہ سے نئے افسانے کا آبگینہ تندی صہبا سے پگھلنے لگا تھا۔ اردو میں پریم چند سے لے کر منٹو اور پھر بیدی تک حقیقت نگاری میں کچھ ایسی سطحیں تھیں، جن سے علامتی مفاہیم کا اکھوا پھوٹ سکتا تھا، لیکن باقاعدہ علامتی کہانی کا آغاز ۶۰-۱۹۵۵ء کے لگ بھگ پاکستان میں انتظار حسین اور انور سجاد اور ہندوستان میں بلراج مینرا اور سریندر پرکاش کی نسل سے ہوا، انکے ساتھ ساتھ دوسرے افسانہ نگار اٹھے اور دیکھتے دیکھتے اردو افسانے کے زمین و آسماں بدل گئے۔ نئی کہانی کا سب سے بڑا مسئلہ حقیقت کا بدلتا ہوا تصور تھا، یعنی حقیقت صرف وہ نہیں ہے جو دکھائی دیتی ہے بلکہ اصل حقیقت وہ ہے جو اسما و اشکال کی دنیا سے پرے حواس سے اوجھل رہتی ہے اور جسے لفظ کو محض نشان کے طور پر استعمال کرنے سے نہیں بلکہ لفظ کو استعارے اور علامت کے طور پر استعمال کرنے سے ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ نیز یہ کہ کہانی صرف شعوری یا منطقی رشتوں کا نام نہیں، اس میں لاشعور کی کارفرمائیوں کا بھی عمل دخل ہے۔ چنانچہ وقت کے منطقی رشتے اور زبان و مکاں کی تعبیریں مسترد قرار پائیں اور وقت کا تصور ایک تسلسل کے طور پر در آیا۔ تخلیقی رویے کی اس بنیادی تبدیلی کے ساتھ ساتھ پچھلے دور کی سطحی رومانیت، کھوکھلی جذباتیت، اشتہاریت، برہنہ

مقصدیت اور خارجیت سب زد میں آئے اور ان پر خط تنسیخ کھنچ گیا۔ نئی کہانی نے اپنی سب سے بنیادی پہچان تصور حقیقت اور اظہار کے پیرایوں میں تبدیلی سے کرائی۔ یعنی لفظ نرے لفظ نہیں تھے بلکہ ایسے استعاروں اور علامتوں کے طور پر استعمال ہونے لگے، جن کے مفاہیم کو منطقی طور پر Paraphrase کرنا ممکن نہیں۔ فرد کی فردیت، اس کے معمولی پن میں اس کی Uniqueness چھوٹے چھوٹے دکھ سکھ اور بنیادی صداقتیں، یعنی زندگی کی نوعیت اور ماہیت، خوشی اور غم کی حقیقت، وجود کا اختیار اور جبر، جنس کی سچائی، عرفانِ ذات کی دہشت نیز طرح طرح کے موضوعات کی رنگارنگی کہانی کی دنیا میں اپنی کیفیت دکھانے لگی۔ کہانی کی قدر شناسی کی سطح پر بڑی تبدیلی یہ آئی کہ موضوع سے چونکہ ادب کی تشکیل نہیں ہوتی، اس لیے موضوع اور اظہاری پیکر سے مل کر جو تخلیقی وحدت وجود میں آتی ہے وہ افسانہ ہے۔ یوں ہندوستان اور پاکستان کے نوجوان باغی افسانہ نگاروں نے نئی فنی بلندیاں سر کیں اور بہت سے ایسے افسانے لکھے جو عہد جدید کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ ناموں کے دہرانے سے کچھ حاصل نہیں ہے کیونکہ ایسے افسانوں پر بہت گفتگو ہو چکی ہے۔ لیکن پچھلے چند برسوں سے جو مسئلہ پریشانی کا باعث ہے، وہ یہ ہے کہ ۱۹۷۰ء کے بعد نئی کہانی کا جو منظر نامہ مرتب ہو رہا ہے اس میں بعض چیزیں صاف نہیں ہیں۔ نئی نسل کچھ تو تقلید کے چکر میں پڑ کر ادبِ لطیف اور انشائیے کو افسانہ سمجھ بیٹھی ہے اور کچھ دوراہے پر ''تھکی تھکی سی ہوئی ہے'' اور نہیں معلوم کہ کدھر جائے۔ افسوس کی بات ہے کہ نئی تنقید کو بھی اس بارے میں جو فرض ادا کرنا چاہیے وہ ابھی اس سے عہد برا نہیں ہو پائی۔

یہ بات بھی خاطر نشان رہنی چاہیے کہ افسانے کے بھی کچھ اپنے صنفی تقاضے ہیں۔ ''نری علامت نگاری'' کے چکر میں پڑ کر انہیں یکسر فراموش کرنا اور مہمل نگاری اور ہذیان گفتاری کا شکار ہو جانا بھی کوئی قابلِ فخر بات نہیں۔ افسانے یا کہانی کی تعریف میں کتابوں کے صفحے کے صفحے بھرے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ بات نظر انداز کر دینے کی نہیں کہ بحیثیت ایک صنف کے کہانی کا اپنا ایک جوہر ہے۔ اسے کہانی کا Kernel کہیے یا تھو، یہ جوہر تو لازماً افسانے میں ہونا ہی چاہیے۔ اس جوہر کی حفاظت میں ہمارے اساطیر، کتھاؤں، اور حکایتوں نے صدیاں کھپا دیں۔ اس جوہر کو کلیۃً مسترد کرنا دراصل خود اپنے رد کو دعوت دینا ہوگا۔ شاید اسی جوہر کے جمالیاتی فشار کے لاشعوری تقاضوں کی بنا پر ہمارا نیا افسانہ اتنا علامتی نہیں جتنا تمثیلی ہے، اور تمثیلی ہوتے ہوئے استعاراتی تفاعل کی معنیاتی تہہ داری سے بے نیاز نہیں۔ چنانچہ افسانہ خواہ تمثیلی ہو یا حقیقت نگاری کا ہو، اگر وہ کہانی کے صنفی جوہر سے تہی دامن نہیں، اور اظہار کے گہرے معنیاتی تفاعل سے ذہن و شعور کی نئی سطحوں کو پیش کرتا ہے۔ نیز آج کے نئے مسائل سے بھی بے تعلق نہیں، تو وہ یقیناً نیا افسانہ ہے اور ایسے افسانے میں بغاوت کا شعلہ کبھی بجھ نہیں سکتا۔ (۱۹۸۵ء)

— پروفیسر گوپی چند نارنگ

فکشن کی تنقید سے متعلق چند سوالات

بیسویں صدی کے کاندھوں پر لدے ہوئے بہت سے سوالات کی گرد کو ہم ابھی تک پوری طرح جھاڑ نہیں سکے ہیں کہ اکیسویں صدی کے پہلے حصے میں بہت سارے نئے پرشن ہمارے سامنے کھڑے ہو گئے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان سوالوں میں گذشتہ صدی کے باقی ماندہ بہت سے سوالات بھی بدستور ہمارے ذہنوں کے بوجھ کا حصہ ہیں۔

شاعری کا معاملہ تو الگ ہے لیکن اردو فکشن، موجودہ دور میں بعض بہت بڑے سوالات کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک کے افسانہ نگاروں نے جس طرح فکشن کی کائنات کو انسانی مسائل سے ہم آہنگ کیا۔ اس کی بہت سی توجیہات اسی عہد میں پیش کی گئیں، تاہم منٹو نے نہ صرف اردو بلکہ برصغیر کی دوسری زبانوں کے سامنے کئی اہم سوالات مجسم کیے۔ مثلاً فکشن کی حدود، انسانی تجربے اور اس کے لمحات گزراں کا کہاں تک احاطہ کرتی ہے۔ منٹو کے ادب نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ شاعری اور فکشن کے مسائل اور حلقے الگ الگ ہیں۔ شاعری جہاں پر نہیں مار سکتی، وہاں منٹو کا افسانہ ایک ہمہ گیر آسمان کی طرح انسانی اذیتوں اور اندوہناکیوں کی مثال بن جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا فکشن کی تنقید میں بیدی اور منٹو کا مکمل احاطہ کر لیا گیا ہے، آج بھی فکشن کی تنقید ایسے اسٹیشنوں پر پہنچی ہوئی ہے جہاں سے گاڑیاں کہیں کے لیے روانہ نہیں ہوتیں۔ نارنگ صاحب اور بعض دوسرے ناقدوں کی تنقیدات پڑھ کر یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ان حضرات کی تنقیدیں بازار میں نصب گھنٹہ گھر سے اپنی گھڑیاں ملانے کی کوشش نہیں ہیں لیکن یہاں بھی کچھ سوالات ابھر کر آئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ بیدی اور منٹو کی عظمت، انفرادیت اپنی جگہ لیکن کیا فکشن کے نئے تخلیق کار کوئی اعتبار حاصل کر سکے ہیں یا نہیں؟

تاہم اب جو میں سوالات قائم کر رہا ہوں، ان پر غور کرنا اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ نئے عہد کو فکشن کا عہد قرار دینے کے باوجود فکشن کی کوئی انفرادی تنقید یا اس تنقید کے معیارات مقرر کرنے کا کوئی کام نہیں ہوا۔ پرانی روایت قائم رہی اور Big Ban سے اپنی گھڑی ملانے کا پرانا تصور برقرار رہا۔ یہی میرے سوالات تھے جن کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ جب کہ فکشن کے ادب کی کائنات بے حد وسیع ہو کر ہمارے سامنے نئے سوالات اور نئے مطالبات کے ساتھ مجسم ہے۔ تخلیق کاروں کے تجربات اور بیان کے لیے ایک نئی دنیا ہمارے مقابل ہے۔ فکشن نگار بیدار ہیں اور ناقد سو رہا ہے۔ بڑی زبردست تبدیلیاں واقع

ہورہی ہیں لیکن تنقید ہنوز پنبہ در گوش ہے۔

آخر ہماری فکشن کی تنقید اپنی پرانی سمفنی سے کب تک نئے عہد کے مطالبات کو پورا کرتی رہے گی۔ نئے فکشن نگار کب تک یہ انتظار کریں گے کہ انکی بھرپور صلاحیتوں کو تنقید کی سطح پر پرکھا جائے۔ نئے اسالیب، نئے موضوعات اور فکشن کے نئے وژن کو پرکھنے والی نظر کہاں ہے؟ اور اگر نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے؟

مسلسل افسانوی مجموعے شائع ہورہے ہیں۔ مثال کے طور حسین الحق کا 'سوئی کی نوک پر رکا لمحہ' شموئل احمد کا 'سنگھاردان' مظہر الزماں خاں کا 'دستکوں کا ہتھیلیوں سے نکل جانا' مشرف عالم ذوقی کا 'صدی کو الوداع کہتے ہوئے' محسن خان کا 'خواب کہانی' جو نئے فکشن کے ایسے خوابناک در کھولتے ہیں جو اس سے پہلے کبھی کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکے تھے۔ اور پھر عمر شیخ مرزا (شمس الرحمٰن فاروقی) کا 'سوار اور دیگر کہانیاں' جو روایتی بیانئے کی اہم مثال ہیں اور حال ہی میں شائع ہونے والا سید محمد اشرف کا مجموعہ 'بادصبا کا انتظار' اس کے بعد طارق چھتاری کا 'باغ کا دروازہ' اور دو بالکل تازہ کار مجموعے شاہد اختر کا 'برف پر ننگے پاؤں' اور احمد صغیر کا 'انا کو آنے دو' وغیرہ کیا یہ ثابت نہیں کرتا کہ یہ عہد فکشن کا عہد ہے۔

گزرے ہوئے زمانوں کی طرف دیکھتے ہیں تو فکشن کی تنقید کا ایک بڑا ذخیرہ ہمارے سامنے محدود اور محفوظ ہوجاتا ہے۔ ممتاز شیریں کا نام، ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے کی طرح ذہن کو عافیت دیتا ہے۔ محمد حسن عسکری کو پڑھ کر ذہن میں بے پناہ وسعتیں پیدا ہوتی ہیں اور منٹو کے علاوہ غلام عباس کے فکشن کا معیار بھی سامنے آتا ہے۔ وقار عظیم کا تذکرہ کرنا اس لیے ضروری نہیں کہ ان کی تنقید یونیورسٹی کے طلباء کے نہیں بلکہ ہائی اسکول کے پڑھنے والوں کے لیے تھی۔ اسکے بعد نام تو بہت سے آتے ہیں۔ لیکن فکشن کی تنقید کا میدان دادا گیری کے باوجود یکسر خالی ہے۔ فکشن پر مربوط تخلیقی تنقید کے امکانات آج بھی ناپید ہیں۔

سوال یہ ہے کہ منٹو، بیدی اور دوسرے بڑے افسانہ نگاروں کی عظمت کو تسلیم کرنے کے بعد کیا اردو تنقید کو، فکشن کی تنقید کی اپنی باقی عمر شاہ نشیں پر حقہ پیتے ہوئے بسر کرنی چاہیے۔ یا زندگی کے نئے مناظر اور افسانے کے نئے منظر ناموں کی طرف نظر ڈالنی چاہیے—

پرانے نام ہمیشہ اہم رہتے ہیں۔ لیکن پرانے ناموں کو پاؤں کی زنجیر بنالینا، تنقید کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ ہمارے عہد کے شعراء کے ساتھ بھی تنقید نے اس پابہ زنجیری کا مظاہرہ کیا۔ فکشن کی کائنات ابھی پوری طرح ان ناقدوں کے حلقہ زنجیر کی آواز سے بھی محروم ہے۔

وقت کے اپنے تقاضے ہیں۔ نئے فکشن کی نئی منزلیں ہمارے سامنے ہیں۔ تنقید کی بے بسی، محرومی، لاچاری اور پابہ زنجیری کا منظر بھی ہم دیکھ رہے ہیں۔ یہی ہمارے عہد کا پرشن بھی ہے اور اتر بھی، کیا ہم تنقید کے زنداں خانے میں مردہ پڑے ہوئے ناقدوں کے فریب اور ان کے خوف سے آزاد ہوکر ان کی جانب کوئی رحم کی نظر ڈال سکتے ہیں۔ یا ان کی بخشش کی دعائیں مانگ سکتے ہیں۔؟

— محمد صلاح الدین پرویز

اعتراف

ایک تخلیق کار بنیادی طور پر قاری ہوتا ہے، لیکن اس خاص قاری کی حیثیت، ادب کے عام قاری سے ان معنوں میں مختلف ہوتی ہے کہ وہ مسلسل سوچنے اور غور کرنے کے بعد ذہن میں جنم لینے والی ترنگوں کو محسوسات کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ وہ تخلیقی عمل کے جاں گسل مرحلے سے بعد میں گزرتا ہے۔ پہلے وہ کائنات کے مظاہر کا سنجیدگی سے مطالعہ کرتا ہے، اس کی متعدد قرأتوں سے معنی و مفاہیم کی نئی دنیاؤں تک رسائی حاصل کرتا ہے اور تخلیق کے پھوٹتے ہوئے چشموں کو بہت حد تک اپنے اندر جذب کرنے کے بعد ہی اظہار خیال کے لیے قلم کو جنبش دیتا ہے۔ وہ فن کاری سے اپنے جذبات کو گویائی عطا کرتا ہے، لیکن متن کی تخلیق کے بعد تخلیق کار کا ذاتی وجود پس پشت جا پڑتا ہے، اور ایک بار پھر مذکورہ متن سے اس کا رشتہ قاری کے طور پر قائم ہو جاتا ہے۔ یعنی بہ حیثیت قاری وہ اپنے تخلیقی فن پارے کی نئے سرے سے قرأت کے لیے مجبور ہوتا ہے۔ اس میں ترمیم و اضافے کے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض کی گنجائشیں نکالتا ہے اور ہر لحاظ سے اپنی تخلیق کو کارگر بنانے کے درپے دکھائی دیتا ہے۔ تخلیق کار کے اندر کا قاری جب تک فعال اور سرگرم رہتا ہے، اس کی تخلیقی سرگرمیاں نئے امکانات کا پتہ دیتی ہیں۔ ساتھ ہی اس کی تخلیق، نئی آب و ہوا اور نئے موسموں کی تلاش میں معاون بھی ہوتی ہے۔ لیکن جب تخلیق کار کے اندر کا قاری اونگھنے لگتا ہے یا کسی وجہ سے اسے گہری نیند آجاتی ہے تو پھر تخلیقیت کی دھار دار کیفیت پر شدید ضرب پڑتی ہے اور ذہن پر مرتب ہونے والے مثبت تاثرات، اچانک ہی منفی تاثرات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا تخلیق اور تخلیق کار کے ساتھ ہی ساتھ قاری کا رشتہ بھی آپس میں بہت گہرا ہوتا ہے، کیونکہ یہ تثلیث ایک دوسرے کے بغیر کسی طرح مکمل نہیں ہو سکتی۔ جہاں کہیں بھی ان پہلوؤں کو نظر انداز کرنے کی بھول کی جاتی ہے، نہ صرف تخلیق کار اپنے مقصد میں بری طرح ناکام ہوتا ہے بلکہ تخلیق بھی چاروں خانے چت دکھائی دیتی ہے۔

اس تناظر میں اگر ہم موجودہ عہد میں لکھے جا رہے اردو کے افسانوں کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ تخلیق، تخلیق کار اور قاری کی تثلیث کو ان افسانوں میں قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان افسانوں میں ادب کے عام قارئین کے محسوسات کی شمولیت بھی ہے، جب کہ ادب کے خاص قارئین یعنی خود تخلیق کاروں کو بھی ان افسانوں میں اپنا مافی الضمیر ادا کرنے میں کامیابی ملی ہے، کیونکہ انہوں نے اپنے اندر کے قاری کو زندہ اور متحرک رکھا ہے جس نے ہر قدم پر ان کی رہنمائی کی ہے اور اس طرح موجودہ افسانوں کے حوالے سے ایک بہتر سماجی ڈسکورس کی ابتدا ہوئی ہے۔ موجودہ عہد میں لکھے جا رہے اردو کے افسانے ترسیل

کی نا تکمیلیت سے بہت حد تک پاک ہیں اور اس بنا پر ان افسانوں نے براہ راست قارئین سے اپنا رشتہ استوار کیا ہے۔ نام نہاد نقاد کی انگلیاں تھام کر افہام و تفہیم کی منزلیں طے کرنے کے بجائے قارئین نے اپنے ذہنی استعداد کے مطابق ان افسانوں کے اسرار و رموز منکشف کرنے میں دلچسپی دکھائی ہے۔ ظاہر ہے یہ رویہ ادب کے مثبت نظریوں کے استحکام میں معاون ثابت ہوگا اور تخلیق کے ساتھ ہی ساتھ تخلیق کاروں کو سمجھنے کی ایک نئی راہ ہموار ہوگی۔

یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ فکشن کی تنقید جس توجہ اور سنجیدگی کا تقاضہ کرتی ہے، وہ اب تک اردو تنقید میں عام نہیں ہو پائی ہے۔ تقریباً ایک صدی کے افسانوی سفر کے دوران ہزاروں افسانے معرضِ وجود میں آئے، جن میں بعض افسانے بلاشبہ تاریخی اہمیت کے حامل ہیں، لیکن جہاں تک ان کی تفہیم اور صحیح پرکھ کا سوال ہے، افسانے کی مروجہ تنقید ان کے ساتھ خاطر خواہ انصاف نہیں کر پائی ہے۔ معدودِ چند باشعور پارکھوں کے علاوہ افسانے کی تنقید میں ایسے ناموں کا فقدان ہے جنہوں نے نظریاتی اختلافات سے بلند ہوکر صدق دل سے افسانوں اور افسانہ نگاروں کے مطالعے میں دلچسپی دکھائی ہے۔ تنقید میں پوری طرح غیر جانبدار ہوکر کوئی لائحہ عمل مرتب نہیں کیا جا سکتا، البتہ یہ کوشش ضرور کی جا سکتی ہے کہ مطالعے اور تجزیے کے دوران زیادہ سے زیادہ معروضی ہوکر کوئی بات کہی جائے۔ موجودہ عہد میں افسانے کچھ زیادہ ہی تیز رفتاری کے ساتھ لکھے جانے لگے ہیں۔ اس تناظر میں افسانے کی تنقید جو پہلے سے ہی کچھ سست رفتار رہی ہے، اس تیزی کا ساتھ نہیں دے پا رہی ہے۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں افسانہ نگاروں کا معترض ہونا ناگزیر ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس ضمن میں سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ گفتگو کی بہتر فضا ہموار ہو۔

موجودہ عہد میں لکھے جا رہے افسانے عصری حسیت سے مملو ہونے کی بنا پر جہاں آج کی زندگی کی منظر نامہ پیش کرتے ہیں وہیں ان افسانوں کے متن سے گزرتے ہوئے ہمیں یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ یہ افسانے اپنی مستحکم روایت کے خمیر میں بھی گندھے ہوئے ہیں۔ یہ افسانے بدلتے ہوئے میکانیکی عہد سے تعلق رکھنے کے باوجود جذبات کی سطح پر ہمیں اندر سے جھنجھوڑتے ہیں۔ مواد اور اسلوب کی سطح پر بھی ان افسانوں میں جہاں آج کی زندگی ہر لحہ دھڑکتی ہوئی محسوس کی جاتی ہے، وہیں ان میں کہانی پن کا عنصر بھی خاص سلیقے کے ساتھ شامل دکھائی دیتا ہے۔ دو تین دہائیوں قبل ایک خاص رجحان اور رویے کے زیر اثر افسانے سے کہانی پن کا عنصر سرے سے ہی ختم کر دیا گیا تھا۔ نتیجے کے طور پر کہانی تفہیم کی بھول بھلیوں میں بہت حد تک گم ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ کہانی کی تلاش میں بھٹکتا ہوا سنجیدہ قاری بھی شعور کی بھول بھلیوں میں الجھ کر ذہنی انتشار کا شکار ہوگیا تھا۔ علامت اور استعارے کے بیجا اور کثرت استعمال کے سبب بیشتر افسانے چیستان بن چکے تھے۔ افسانے سے بیانیہ کی رخصتی ہو چکی تھی اور بے ہنگم طرز تحریر نے زندگی کی طرح فن پارے کو بھی حد درجہ پیچیدہ بنا دیا تھا۔ شکر ہے کہ لاسمتیت کا یہ سفر طویل عرصے جاری نہ رہ سکا اور فضاؤں میں قلابازیاں کھانے کے بعد اردو افسانہ ایک بار پھر اپنی زمین پر واپس آ گیا۔ رفتہ رفتہ افسانے میں کہانی کی واپسی

ہونے لگی اور بیانیہ کے ذریعے افسانے کا فن ایک مرتبہ پھر زندگی نقیب بن گیا۔ موجودہ عہد میں لکھے جارہے افسانے زندگی کے حقیقی منظرنامے کو پیش کرنے میں بہت حد تک کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ ان افسانوں میں کردار، پلاٹ، مکالمہ، ابتدائیہ اور اختتامیہ کے ساتھ ہی ساتھ مصنف کے مخصوص نقطۂ نظر کی وضاحت میں بھی خاصی تبدیلی آئی ہے، لیکن کہنا چاہیے کہ یہ تبدیلی بدلتے ہوئے عہد میں ہمارے مزاج کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔

میں نے اپنی محدود واقفیت کے حوالے سے تخلیق کے ساتھ ہی تخلیق کاروں کو سمجھنے کی ادنیٰ سی کوشش کی ہے۔ میں افسانے پڑھتا ہوں اور بہت شوق سے پڑھتا ہوں پھر مطالعے کے بعد مختلف پہلوؤں پر غور بھی کرتا ہوں۔ شاعری سے خاصی شغف رکھنے کے باوجود کسی بھی رسالے کا افسانوی حصہ ہی سب سے پہلے میرے مطالعے میں آتا ہے۔ شاید افسانوں سے میری جذباتی وابستگی اور دلچسپی کا ہی سبب ہے کہ میری تنقیدی تحریروں میں بھی بعض جگہوں پر فکشن کا گمان گزرتا ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگوں کے نزدیک فکشن کی تنقید کا یہ رویہ، زیادہ مستحسن نہ ہو، لیکن میں ذاتی طور پر تخلیقی تنقید کے مکتبۂ فکر سے وابستہ ہوں اور تنقید کی گنجلک، خشک اور جناتی زبان مجھے متاثر نہیں کر پاتی۔ اس کتاب میں شامل افسانے سہ ماہی 'استعارہ' کے فکشن نمبر میں میرے طویل تجزیے کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔ مشمولہ افسانوں کے مختصر تجزیے کا جواز صرف اتنا ہے کہ موجودہ عہد میں لکھے جارہے افسانوں کے حوالے سے بھی گفتگو کی فضا ہموار ہو، تاکہ فکشن کا بدلتا ہوا منظرنامہ ہمارے پیش نگاہ رہ سکے۔ اس تجزیے کے متعلق میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ میں مشمولہ افسانوں کے ساتھ خاطر خواہ انصاف نہیں کر پایا۔ زبان، ٹریٹمنٹ اور اپروچ کی سطح پر یہ افسانے جس وضاحت کے متقاضی تھے میں بعض وجوہات کے سبب چاہ کر بھی ان کی گنجائش نہیں نکال پایا۔ انشاءاللہ اپنی آئندہ کوششوں میں، میں ان خامیوں کا اعادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔

'استعارہ' کا یہ خصوصی شمارہ جو بلاشبہ دستاویزی حیثیت کا حامل ہے، اردو فکشن کی موجودہ صورت حال، سمت و رفتار، مسائل اور امکانات کا اشاریہ کہا جاسکتا ہے۔ اس شمارے میں شامل چالیس افسانے ہندوستانی فنکاروں کے قلم سے وجود میں آئے ہیں۔ دوسرے ممالک کے افسانہ نگاروں کی تخلیقات اس انتخاب میں شامل نہیں ہیں۔ منجھے ہوئے نمائندہ قلم کاروں کے ساتھ اس کارواں میں کچھ نئے فن کار بھی شامل ہیں اور اس مشترکہ افسانوی سفر کے دوران تمام فن کار حصول منزل کی کوششوں میں پیش پیش ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ان چالیس افسانوں میں سے کچھ افسانے شائع شدہ ہیں، لیکن دوبارہ ان کی اشاعت کی گنجائش اس لیے نکالی گئی کیونکہ بہت سے قارئین تک ان افسانوں کی رسائی ممکن نہ ہو سکی تھی۔ باقی وہی افسانے اس انتخاب میں شامل ہیں جو استعارہ کے فکشن نمبر میں اشاعت کے لیے موصول ہوئے تھے۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کچھ اہم ناموں کی بے توجہی کے سبب ان کے افسانے اس انتخاب میں شامل نہیں ہو سکے۔

'استعارہ' کا فکشن نمبر، اشاعت سے قبل ہی خاص طور پر تذکرے میں تھا۔ بڑے پیمانے پر اس کی تیاری کا کام کئی مہینوں سے چل رہا تھا۔ 'استعارہ' کے روح رواں صلاح الدین پرویز صاحب کی خواہش تھی کہ اس خصوصی نمبر میں شامل تمام افسانوں کا مختصر ہی سہی، لیکن تجزیہ ضرور پیش کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام تھوڑا مشکل ان معنوں میں تھا کہ سبھی افسانوں پر کچھ نہ کچھ لکھنے کی گنجائش نکالنی تھی اور ایسا بہت کم ہو پاتا ہے کہ نظر سے گزرنے والی تمام تحریریں اظہار خیال کے لیے اندر سے بے چین کریں۔ اس ضمن میں فکشن کی بہتر پرکھ رکھنے والے چند ''مخلص کرم فرماؤں'' سے پرویز صاحب نے رابطہ قائم کیا اور کرم فرماؤں نے حسب عادت فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وعدہ بھی کرلیا، لیکن افسوس کہ بعض وجوہات کی بنا پر ان کرم فرماؤں نے اپنی نام نہاد علمیت اور چودھراہٹ کے زعم میں اپنی اہمیت جتانی شروع کردی اور بار بار تقاضہ کرنے کے باوجود اس سلسلے میں انہوں نے کوئی پیش رفت نہیں کی۔ استعارہ کی جانب سے تمام افسانے کئی کئی مرتبہ ان کے مطالعے کے لیے روانہ کیے گئے، لیکن انہوں نے خلاف توقع خاموش رہنا ہی مناسب جانا۔ صلاح الدین پرویز صاحب نے یہ ذمے داری میرے سپرد کی تو مجھے اپنی کم مائیگی اور فکشن کی تنقید سے عدم واقفیت کا احساس شدت سے تڑپانے لگا۔ تنقیدی تحریروں کے نام پر اگرچہ میں ادب کی مختلف اصناف پر لکھتا رہا ہوں، لیکن بہ طور خاص فکشن کی تنقید سے میرا کوئی واسطہ نہیں رہا ہے۔ بہ یک وقت ڈھیر سارے افسانوں پر تجزیے کا کام، مجھے اس لیے بھی مشکل لگا کہ فکشن کے نام نہاد پارکھوں نے اپنے راستے بدل لئے تھے۔ نتیجے کے طور پر اس نئی وادی کی چھان بین میرے حصے میں آئی۔ راستے انجان تھے اور منزل کی تلاش میں ٹیڑھے میڑھے، اوبڑ کھابڑ راستوں پر سفر کرنا تھا۔ بہرحال اس کام کو میں نے ایک چیلنج کے روپ میں قبول کیا اور باری باری تمام افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد تجزیے کی کچھ حد تک گنجائش نکال ہی لی۔ مجھے احساس ہے کہ ان افسانوں کے متن سے گزرتے ہوئے اور پھر ان افسانوں کے متعلق تجزیے کے دوران میری حیثیت صرف اور صرف قاری کی رہی ہے اور میں نے تنقید کی مبہم، غیر معیاتی اصطلاحوں اور عبارتوں سے گریز کرتے ہوئے ان افسانوں کی مرکزی اور کلیدی خصوصیات پر ہی اپنی نگاہ مرکوز رکھی ہے، لیکن اپنے مقصد میں مجھے کس حد تک کامیابی ملی ہے، اس کا فیصلہ تو آپ ہی کریں گے۔ 'استعارہ' کے فکشن نمبر میں شامل میرے تجزیے کو 'استعارہ' کے قارئین نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اب جب کہ دوست احباب کے اصرار پر تجزیے کے ساتھ انہیں افسانوں کو علیحدہ طور پر کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے، مجھے آپ سب کی آراء اور مفید مشوروں کا بے صبری سے انتظار رہے گا۔

میں شکر گزار ہوں جناب صلاح الدین پرویز صاحب کا جنہوں نے مکتبہ استعارہ کے اشاعتی پروگرام کے تحت اولین ترجیح پر اس کتاب کی اشاعت میں دلچسپی دکھائی۔ پیارے بھائی حقانی القاسمی صاحب کا شکریہ بھی واجب ہے جنہوں نے ادارتی نوٹ کے طور پر اپنے تاثرات قلم بند کیے۔

—— راشد انور راشد

راشد انور راشد

نئے افسانوں کا معنوی استعارہ

زندگی ہر لمحہ تبدیل ہوتی رہی ہے۔ آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے بلکہ آج کی زندگی کچھ زیادہ ہی تیز رفتاری کے ساتھ نت نئے روپ اختیار کرنے لگی ہے، اپنے آپ کو بدلنے لگی ہے اور اس پورے عمل میں آنے والا ہر لمحہ گزرے ہوئے لمحے سے قطعی مختلف دکھائی دینے لگا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا کہ اس مختلف لمحے کی تفہیم فکشن کے حوالے سے زیادہ بہتر طور پر ممکن ہوسکتی ہے کیونکہ فکشن کے ذریعے ہی وقت سماج، اور معاشرے کی تبدیلیوں کی آہٹ کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ فکشن کے ذریعے ہی عصری زندگی کے مسائل کھل کر ہمارے سامنے آتے ہیں، ہمیں غور وفکر کے لیے اکساتے ہیں، مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے حوصلہ بخشتے ہیں، اور اس طرح زندگی کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کا ایک زاویہ ہمارے ہاتھ آتا ہے۔ ناول میں زندگی اپنی تمام تر وسعتوں اور گہرائیوں کے ساتھ قدرے تفصیل کے ساتھ اظہار کے پیرائے میں ڈھلتی چلی جاتی ہے، لیکن افسانے کی گرفت میں زندگی کے مخصوص لمحے ہی آپاتے ہیں مگر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ وہ لمحے تشنہ نہیں ہوتے اور مخصوص کیفیات کو سمیٹنے میں بہت حد تک کامیاب ہوتے ہیں۔

آج کا اردو افسانہ، عصری زندگی اور اس کے مسائل کی عکاسی میں پیش پیش ہے۔ محسوسات کی سطح پر تمام تر تبدیلیوں کا ردعمل اردو افسانے میں بھی جگہ پانے لگا ہے۔ وقت کی آواز پر لبیک کہنے کا رجحان بڑھتا جارہا ہے۔ مختلف زبانوں میں لکھا جارہا فکشن براہِ راست یا ترجمے کے ذریعے ہمارے مطالعے میں آنے لگا ہے۔ بندھے ٹکے دائرے سے باہر آکر زندگی کے ایک بڑے کینوس پر اپنی نگاہ مرکوز کرنا ہماری مجبوری ہوگئی ہے، کیونکہ یہ احساس اب ہمیں زیادہ شدت کے ساتھ کچوکے لگانے لگا ہے کہ وقت کی دوڑ میں کہیں ہم پیچھے نہ رہ جائیں۔ تصور کی حسین وادیوں میں پناہ لینے کے بجائے حقیقت کے پرخار راستوں کی جانب ہمارے قدم بڑھنے لگے ہیں۔ زندگی کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کی روش اردو افسانے میں بھی عام ہوئی ہے۔ اب نہ صرف وقوع پذیر واقعہ ہماری حسیت کو جھنجھوڑتا ہے بلکہ مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات اور حادثات کا خوف بھی ہمیں لرزہ براندام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ ماضی کی تڑپ، اور حال کے اضطراب کے ساتھ ہی ساتھ اب مستقبل کے اندیشے بھی ہمارے ذہن میں حشر برپا کئے ہوتے ہیں۔ کوئی بھی واقعہ اب ہمارے لیے ایک عام سا ردعمل نہیں رہ گیا ہے۔ ہم اس کی تہہ میں جاتے ہیں۔ اس کے اسباب تلاشتے ہیں اور اس کے منفی یا مثبت اثرات پر غور وفکر کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ اس پورے عمل میں مستقبل کے اندیشے اور غیر یقینی صورت حال کے پیش نظر زندگی کے تئیں ہمارا نقطۂ نظر مسلسل تبدیل ہوتا رہتا ہے، جو بدلتے

ہوئے وقت کے ساتھ خود ہمارے بدلنے کا اشاریہ ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ آج کا اردو افسانہ عصری حسیت سے مملو ہونے کی بنا پر ہمارے محسوسات کی ترجمانی میں زیادہ کامیاب دکھائی دینے لگا ہے۔ موجودہ عہد میں اب کچھ بھی محفوظ نہیں رہ گیا ہے۔ ابھی جو کچھ ہماری نظروں کے سامنے ہے وہ اگلے ہی پل صفحۂ ہستی سے معدوم ہوسکتا ہے۔ ہم آج جس نہج پر سوچ رہے ہیں، عین ممکن ہے کہ آنے والے کل میں ہمارے غور وفکر کا پیمانہ سرے سے ہی تبدیل ہوجائے... زندگی کے جو لمحات آج ہماری خوشگوار یادوں کا حصہ ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے وہی ہمارے کرب میں اضافے کا باعث ہوسکتے ہیں۔ اس عہد میں کچھ بھی ممکن ہے۔ کچھ بھی ایسا نہیں جسے ناممکنات میں شامل کیا جائے۔ آئے دن ڈھیر سارے ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتے۔ لیکن وہ سب کچھ رونما ہوتا ہے اور المیہ یہ ہے کہ اب اس نوعیت کے واقعات زندگی کے معمول میں شامل ہوچکے ہیں۔ یہ کوئی معمولی تبدیلی نہیں ہے۔ ہماری سوچ میں حیرت انگیز انقلاب برپا ہوا ہے۔ سوچنے سمجھنے کے گذشتہ سارے پیمانے ریزہ ریزہ ہوکر بکھر چکے ہیں۔ ہر لمحہ اب ہمیں نئے مسائل کا سامنا ہے۔ ہر پل ہمیں ہوش مندی اور باخبری کے سخت مرحلے سے گزرنا پڑ رہا ہے کہ ذرا سی کاہلی، لمحے بھر کا تغافل ہماری موت کا سبب ہوسکتا ہے۔ ان مسائل کے درمیان سانس لیتا ہوا آج کا اردو افسانہ اپنے زندہ ہونے کا ثبوت فراہم کررہا ہے۔ ہوش مندی اور باخبری کے سخت مرحلوں سے گزر رہا ہے۔ ہمیں وقت کے ساتھ ساتھ چلنے کی ترغیب دے رہا ہے اور تفہیم زندگی کا نسبتاً نیا منظرنامہ پیش کررہا ہے۔

یہاں ایک سوال ذہن میں یہ آتا ہے کہ موجودہ عہد میں لکھے جارہے اردو افسانوں کے حوالے سے کیا مجموعی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے؟ اس سے متعلق ایک دوسرا سوال یہ قائم کیا جاسکتا ہے کہ مشمولہ افسانوں کو اردو افسانے کی موجودہ سمت ورفتار میں کیا کوئی جگہ دی جاسکتی ہے؟ یہاں مختصر طور پر ان باتوں کی نشان دہی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ موجودہ عہد میں لکھے جارہے افسانوں میں عصری حسیت کو برتنے کا رجحان عام ہوا ہے۔ اب ان افسانوں میں تخلیقیت کی سطح پر فن کاری کس حد تک پیدا ہوئی ہے اور اگر کسی طرح کی فنکاری وجود میں آئی ہے تو اسے مقبولیت حاصل ہوگی یا نہیں، یہ ایک الگ بحث ہے۔ عصری حسیت کی پیش کش میں موجودہ لکھنے والوں کے قدم اکثر لغزشوں کا شکار ہوئے ہیں، لیکن اس نازک مرحلے پر کچھ لوگوں نے اپنے بلند حوصلے کا ثبوت پیش کیا ہے اور بادِ مخالفت کا سامنا کرتے ہوئے امیدوں کا چراغ روشن رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ ایک خوش آئند عمل ہے اور ایسے فنکاروں کے قلم سے وجود میں آئے افسانے، اردو افسانے کا وقار باقی رکھنے میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔ میں ناموں کی فہرست سازی میں یقین نہیں رکھتا۔ ادب کے سنجیدہ قارئین ان سے اچھی طرح واقف ہیں۔ تخلیق کاروں کے بجائے اگر افسانوں کے بدلتے ہوئے مزاج اور ان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو ہم پیشِ نگاہ رکھیں تو ہماری یہ کوشش زیادہ بامعنی ہوسکتی ہے۔ موجودہ عہد کے باشعور افسانہ نگاروں نے جن کی تعداد مختصر ہے، اندرونِ ذات اور کائنات کے متعدد مسائل کو جس طرح اپنے افسانوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ

بلاشبہ ایک اہم کارنامہ ہے جس سے ایک مخصوص عہد کی شناخت ممکن ہو پائی ہے۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی لکھنے والے تو بہت ہیں لیکن اپنی تحریروں سے چونکانے والی خاصیت ان میں کم کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ البتہ اتنی بات تو بلا جھجک کہی جاسکتی ہے کہ ایسے بہت سے لکھنے والوں کی تحریروں میں بھی عصری حسیت کی تلاش ممکن ہے۔ یعنی دوڑ میں پیچھے رہنے کے باوجود انہیں وقت کی سمت و رفتار کا اندازہ ہے اور بذات خود یہ بات کافی اہم ہے۔ اوپر کی سطروں میں جو دوسرا سوال میں نے قائم کیا ہے، اس کے جواب میں میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ مشمولہ افسانوں کو پڑھ کر اردو افسانے کی موجودہ سمت و رفتار کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ان میں سے کئی افسانے نمائندہ تخلیق کاروں کے قلم سے وجود میں آئے ہیں جن کی انفرادی حیثیت ادب میں تسلیم کی جاچکی ہے، جب کہ بہت سے افسانے ایسے لکھنے والوں کے ہیں جن کا تخلیقی سفر حال ہی میں شروع ہوا ہے، لیکن ان کی تحریروں کو امکانات کے زاویے سے پرکھا جاسکتا ہے اور اگر ادبی حلقوں میں کسی نہج پر ان کے حوالے سے گفتگو کی فضا ہموار ہوتی ہے تو میرے خیال میں یہ مکالمہ زیادہ بامعنی ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ آنے والے عہد میں اردو فکشن کا کارواں انہیں لوگوں سے منسوب ہوگا۔

مشمولہ افسانے زندگی کے مختلف گوشوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ موضوعات کی سطح پر ان میں ہمہ گیریت کا احساس ہوتا ہے۔ محسوسات کی سطح پر بھی ان میں وہ کیفیات شامل ہیں جن کی بدولت ذہن و دل مضطرب ہوجاتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو شاید بیجا نہ ہوگا کہ ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے ہم سرسری طور پر نہیں گزر سکتے۔ کئی افسانے ہمیں چونکاتے ہیں۔ ہمیں غور و فکر کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ کوئی واقعہ اپنے حیرت انگیز اختتام کی بنا پر ہمیں تحیراتی اور استعجابی کیفیتوں میں مبتلا کرتا ہے تو کوئی کردار اپنے غیر یقینی رویے اور ردِ عمل کی بنا پر افسانے کی ترتیب وار کڑیوں کو اچانک ہی منتشر کردیتا ہے۔ کبھی حالات کی ستم ظریفیوں سے دیکھتے ہی دیکھتے خوابوں کا محل چکنا چور ہوجاتا ہے تو کبھی جذبات کا بپھرتا ہوا سیلاب سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔ کبھی امنگوں کی پھواروں سے احساس کا گلشن سرسبز و شاداب ہوجاتا ہے تو کبھی زندگی درد کے صحرا میں تبدیل ہوجاتی ہے، جہاں جھلستی ہوئی ریت اور ہوائیں وجود کو خاکستر کرڈالتی ہیں۔ مشمولہ افسانوں میں اس نوعیت کی کیفیات قدم قدم پر محسوس کی جاسکتی ہیں۔ یہ افسانے وحدتِ زماں اور وحدتِ مکاں کے تصور سے آزاد دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ افسانوں کی مدت چند لمحوں تک محدود ہے تو کچھ افسانے زندگی کے وسیع منظرنامے کا احاطہ کرتے ہیں۔ پہلے کے افسانوں میں فن کے اصول و ضوابط کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اجزائے ترکیبی کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ لیکن آج کے افسانوں میں یہ سارا منظرنامہ سرے سے ہی تبدیل ہوگیا ہے۔ اب افسانے میں پہلے سے کچھ بھی طے نہیں ہوتا ہے۔ کسی بھی لمحے کہانی میں کوئی حیرت انگیز موڑ آجاتا ہے اور کہانی خود اپنی تکمیل کے لیے تخلیق کار کو مجبور کردیتی ہے۔ مشمولہ افسانوں میں بھی یہ کیفیات محسوس کی جاسکتی ہیں۔ ان افسانوں میں واقعات کے بیان میں حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ پہلے واقعات کا ایک خاص تسلسل ذہن میں موجود ہوتا تھا اور کہانی اسی تسلسل کے ساتھ فطری بہاؤ میں بیان ہوتی چلی جاتی تھی۔

آج کا افسانہ اس نوعیت کی تمام تر بندشوں سے پوری طرح آزاد ہو چکا ہے۔ مشمولہ افسانوں میں بھی قدم قدم پر یہ آزادی دیکھی جاسکتی ہے۔ ان افسانوں میں واقعات بے ترتیب ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے آج کا انسان اور اس کا ذہن بری طرح انتشار کا شکار ہے۔ ان افسانوں میں پہلے کا واقعہ بعد میں اور بعد کا واقعہ پہلے بیان ہوا ہے۔ ان واقعات کو یا تو مصنف خود بیان کرتا ہے یا کسی کردار کی زبانی یا محض مکالمے کے حوالے سے ان کا بیان ہوتا چلا جاتا ہے۔ مشمولہ افسانے علامتی انداز میں بھی بیان ہوئے ہیں لیکن یہ کہنا شاید بیجا نہ ہوگا کہ اردو افسانوں میں ایک بار پھر بیانیہ کی واپسی ہوئی ہے۔ پوری طرح علامتی افسانوں کا خاتمہ تو نہیں ہوا ہے لیکن ان کی پیش کش میں حیرت انگیز کمی آئی ہے۔ مشمولہ افسانوں میں بھی علامتی افسانے چند ہی ہیں۔ بیشتر افسانے بیانیہ کی تکنیک میں لکھے گئے ہیں لیکن اس ضمن میں یہ خاص دھیان رکھا گیا ہے کہ واضح اور راست انداز بیان افسانے کے معیار پر اثر انداز نہ ہو اور فن کے طور پر اس کی حرمت، شائستگی اور سنجیدگی پر حرف نہ آئے۔ جو علامتی افسانے اس شمارے میں شامل ہیں وہ محض گنجلک اور پیچیدہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔ اگرچہ وہ ہماری ذہنی سطح کا امتحان ضرور لیتے ہیں لیکن ان افسانوں کے حوالے سے بھی گفتگو کی جاسکتی ہے۔ زبان کے تعلق سے بھی مشمولہ افسانوں میں قدرے نکھری ہوئی فضا کا احساس ہوتا ہے۔ کہیں سیدھی سادھی زبان کے سہارے واقعات کا بیان ہوا ہے، کہیں تخلیقی زبان کی خوبصورتی ہمارے اذہان پر دستک دیتی ہے۔

مشمولہ افسانوں کے تعلق سے ایک بات جو واضح طور پر کہی جاسکتی ہے وہ یہ کہ مشمولہ افسانے روایتی افسانے سے قطعی مختلف ہیں۔ اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روایتی افسانوں سے ہماری مراد کیا ہے اور مشمولہ افسانے روایتی افسانوں سے کس حد تک اور کیسے الگ ہیں؟ روایتی افسانہ کہنے سے عام طور پر جو تصور ذہن میں ابھرتا ہے، وہ یہ ہے کہ عنوان اور ابتدائی چند سطریں پڑھنے کے بعد ہی ہم افسانے کی روح، واقعات کے تسلسل اور انجام سے بہت حد تک واقف ہو جائیں۔ اس ضمن میں تفصیل اور وضاحت کے ساتھ مزید گفتگو کی جاسکتی ہے۔ لیکن فی الوقت مناسب یہی جان پڑتا ہے کہ مشمولہ افسانوں کے حوالے سے کچھ باتیں ہوں تاکہ اردو افسانے کا موجودہ منظر نامہ اور بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ رونما ہونے والی تبدیلیاں پیش نگاہ رہ سکیں۔ اس طرح تبدیلیوں کے زیر اثر افسانوں میں آئے اتار چڑھاؤ کے حوالے سے مکالمے کی فضا بھی ہموار ہو سکتی ہے۔ مشمولہ افسانے اس اعتبار سے انفرادی حیثیت کے حامل ہیں کہ ان میں محسوسات کی ایک دوسری دنیا ہی آباد نظر آتی ہے۔ ان افسانوں کی قرأت جب تک پوری طرح مکمل نہیں ہو جاتی ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتے۔ بیشتر افسانے کا آخری جملہ تأثرات کی بکھری ہوئی کڑیوں کو سمونے میں معاون ہوتا ہے اور کاغذ پہ ختم ہونے کے بعد کہانی دوبارہ ہمارے ذہن میں شروع ہو جاتی ہے۔ یہی اچھے افسانے کی خوبی بھی ہے۔ یہاں میں اس بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ مشمولہ تمام افسانوں پر میری اس رائے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یقیناً اس شمارے میں شامل کچھ افسانے فنی اعتبار سے کمزور بھی ہیں۔ ٹریٹمنٹ

اور اپروچ کی سطح پر بھی وہ بہتر تاثر قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے لیکن کہا جاسکتا ہے کہ ان کی تعداد بہت کم ہے اور مجموعی طور پر مشمولہ افسانے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں ان افسانوں کے تعلق سے کوئی مثبت یا منفی رائے پیش کرنے سے احتراز کررہا ہوں، کیونکہ اس کی وضاحت کے لیے اچھے خاصے صفحات درکار ہوں گے اور یہاں اس کا موقع نہیں ہے۔ میں اس مضمون میں مشمولہ افسانوں پر ایک مجموعی تاثر پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

☐ ریوتی سرن شرما کا افسانہ ''آندھی — وقت کی'' دل کے دیرینہ جذبات اور محسوسات کو گویائی عطا کرتا ہے۔ انہوں نے وقت کی آندھی اور پھر اس کے بعد کی تباہ کاریاں فن کارانہ طریقے سے بیان کی ہیں۔ وقت کی آندھی میں سب کچھ تباہ ہوجاتا ہے۔ کچھ بھی سالم نہیں رہ جاتا۔ صرف یادیں رہ جاتی ہیں جو رہ رہ کر تڑپاتی ہیں، اور کرب میں اضافہ کرتی رہتی ہیں۔ ریوتی سرن شرما نے وقت کی اس آندھی کا ذکر کیا ہے جس کے زیر اثر قصبوں اور دیہاتوں کی اپنی شناخت، گئے دنوں کی یاد بن کر رہ گئی ہے۔ اب وہاں شہر کی مصنوعی تہذیب نے قبضہ کررکھا ہے۔ زندگی کی بنیادی قدریں قصہ پارینہ میں تبدیل ہوجاتی ہیں، جھگی جھونپڑیوں کی جگہ کئی منزلہ عمارتیں کھڑی ہوجاتی ہیں۔ مفادیت کے زیر اثر ہم روحانی سکون سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ جو فضائیں ہمارے ذہنوں کو تازہ دم کیے ہوتی تھیں، وہ پلک جھپکتے ویرانیوں اور اداسیوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔ جس ماحول سے ہمارا قلبی لگاؤ تھا، وقت کی آندھیوں سے پوری طرح تباہ و برباد ہوجاتا ہے۔ جن باغوں میں غضب کا حسن برقرار تھا، جن کے کھٹے میٹھے پھلوں سے ایک خاصی قسم کی جذباتی وابستگی تھی، وہ باغ رفتہ رفتہ آنکھوں سے اوجھل ہونے لگتے ہیں اور ایک دن ایسا بھی آتا ہے جب نگاہوں سے زندگی کی بنیادی رمق بھی چھن جاتی ہے۔ ریوتی سرن شرما نے وقت کی آندھی میں تباہ ہوتی ہوئی زندگی کو درد و کرب کی شدت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسی زندگی جو کبھی اپنی بنیادی شناخت رکھتی تھی، لیکن وقت کی آندھی میں وہ شناخت ہمیشہ کے لیے ہم سے چھن گئی۔

☐ بلراج کومل کا افسانہ ''کنواں'' انسان کے اس بنیادی خوف کو ظاہر کرتا ہے جس کی ہیبت ناکی سے صحیح معنوں میں وہ خود بھی واقف نہیں۔ جب کبھی بھی حسیت کی ایسی کوئی منزل آتی ہے، انسان اپنے آپ سے ناآشنا ہوجاتا ہے۔ چہار سمت اسے دھندلکوں کا گماں ہوتا ہے اور اس دھندلکے میں اپنا وجود گم ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ زندگی کا سارا حسن اس کے لیے بے معنی ہوجاتا ہے۔ کوئی شے اسے اپنی جانب نہیں کھینچتی۔ ایسے میں اس کی بس ایک ہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کردے اور تمام تر مسائل سے نجات حاصل کرلے۔ حالانکہ جیتے جی بھی کسی قسم کا کوئی مسئلہ اسے پریشان نہیں کرتا۔ اس افسانے میں جس کردار کا المیہ بیان کیا گیا ہے، وہ دنیا و مافیہا سے پوری طرح بے خبر ہوچکا ہے۔ اس لیے عام انسانوں کے مسائل اس کی ذہنی صعوبتوں میں اضافہ نہیں کرپاتے اور وہ زندگی سے قطعی لاتعلق ہوتا موت کے دامن میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ وہ جذبات کی سرحد سے نکل چکا ہے۔ رشتوں کی زنجیریں ٹوٹ گئی ہیں۔ دور تک نگاہوں میں تاریکیوں

کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ جب روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہ دے تو تاریکیوں کے بلامتناہی غار میں داخل ہونے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ وہ غار ہے جس میں داخل ہونے کے بعد وجود پلک جھپکتے ہی معدوم ہو جاتا ہے۔ بلراج کومل نے موت کے اسی غار کو اپنے افسانے میں کلیدی طور پر پیش کیا ہے۔ موت کا یہ غار دراصل ایک ایسا کنواں ہے جو آبادیوں سے دور ایک ویران علاقے میں ہیبت ناکی کا دلدوز منظر پیش کر رہا ہے لیکن صحیح معنوں میں اس کی ہیبت ناکی افسانے کے کرداروں پر پوری طرح واضح نہیں ہے۔ افسانے کے دو کردار زندگی کے دو متضاد رویوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ایک کردار زندگی کے جوش و خروش کا نمائندہ ہے جب کہ دوسرا کردار زندگی کی بنیادی رمق سے بھی محروم ہے۔ ایک کردار زندگی میں سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے، اسے اپنی صلاحیتوں پر ناز ہے۔ اپنے اندر وہ غضب کا اعتماد رکھتا ہے اور کسی بھی طرح کے مقابلے کے لیے ہر لحہ تیار دکھائی دیتا ہے۔ دوسرا کردار وہ ہے جسے زندگی، کامیابی اور مقبولیت سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ خاموشی کے ساتھ اپنی زندگی کو ختم کر لینا چاہتا ہے۔ خودکشی کا خیال اسے خوف کے بجائے تسکین بخشتا ہے اور وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے آبادی سے دور ایک قدیم اور ہیبت ناک کنواں کا انتخاب کرتا ہے۔ یہ وہی کنواں ہے جسے پہلا کردار اپنے مقابلے کی تیاری کے لیے منتخب کرتا ہے۔ لیکن آخرکار جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور یہ منظر دیکھ کر زندگی سے مایوس کردار جو موت کو گلے لگانے کے لیے بے چین تھا حواس باختہ شہر کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ درختوں کے جھنڈ کو چیرتا اور سرسبز و شاداب کھیتوں کو اپنے پاؤں تلے روندتے ہوئے شہر کی طرف بھاگنا دراصل زندگی کی تلاش اور زندگی سے محبت کا اشاریہ ہے۔ بلراج کومل کا یہ افسانہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ جب تک ہم موت کا کرب اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیتے اس وقت تک موت کے خوف سے غافل رہتے ہیں اور بلاجھجک موت کے دامن میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ لیکن جس لمحے بھی صحیح معنوں میں موت کا خوف ہمیں اپنے حصار میں لیتا ہے اسی لمحے ہمیں زندگی سے پیار ہو جاتا ہے اور پھر اس کے تحفظ کا خیال ہمیں شدت سے تڑپانے لگتا ہے۔

□ گلزار کا افسانہ "مائیکل اینجلو" تاریخ کے ایک اہم واقعے سے متعلق ہے۔ اس نوعیت کے افسانے معرضِ وجود میں ضرور آنے چاہئیں، تاکہ تاریخ کے اہم واقعات ہمارے ذہن میں محفوظ رہ سکیں۔ گلزار نے بڑی فن کاری کے ساتھ تاریخی واقعے کو فکشن کا روپ دیا ہے، جس سے درمیان میں حائل صدیاں بے معنی ہو جاتی ہیں اور زمان و مکان سے ماورا ہو کر یہ کہانی موجودہ عہد کی حسیت کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ مائیکل اینجلو جو پندرہویں صدی کا شہرت یافتہ مصور تھا، اسے پوپ جولیس نے سینٹ پیٹرز کے سسٹین چیپل کے گنبد اور دیواروں پر نئے اور پرانے عہد نامے کے اہم واقعات منقش کرنے کی ذمے داری سونپی تھی۔ اینجلو نے اس کام کو انجام دینے کے لیے حامی بھر لی، کیونکہ بلاشبہ یہ ایک غیر معمولی کام تھا اور اس کی تکمیل کے بعد تاریخ کے زریں صفحات میں اس کا نام ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتا۔ مائیکل اینجلو اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ پانچ سال کی مسلسل محنت کے بعد اس نے بہت حد تک اپنے خوابوں کو حقیقت کی شکل دے دی، لیکن منزل کے

بہت قریب پہنچ کر بھی وہ جیسے منزل سے بہت دور تھا۔ چیپل کی نقاشی اب آخری حصے تک آ گئی تھی۔ اینجلو چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد عیسیٰ کا ''لاسٹ سپر'' منقش کر لے، لیکن اس خیال کو حتمی شکل دینے سے قبل بار بار اسکے ذہن میں یہودہ کی شبیہ کوند کر آتی اور اس چہرے پر آ کر اس کا سارا تخیل خالی ہو جاتا۔ یہ وہی یہودہ تھا جو عیسیٰ کا تیرہواں شاگرد تھا، لیکن جس نے سونے کے تیس ٹکڑوں کے لیے اپنے پیر و مرشد کو رومیوں کے حوالے کر دیا تھا اور پھر عیسیٰ کو صلیب پر چڑھا دیا گیا۔ مائیکل اینجلو، یہودہ کی شبیہ سنگ مرمر میں تراشنے کے لیے بے چین تھا، لیکن بے پناہ کوشش کے باوجود اسے کامیابی نہیں مل پا رہی تھی۔ اس ضمن میں وہ تخیل کا سہارا لینے کا سخت مخالف تھا، کیونکہ ایسی صورت میں شبیہوں پر حقیقت کا گمان نہیں ہوتا تھا۔ دن بدن اس کی پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اینجلو کی بے چینیوں کو دیکھ کر پوپ جولیس کا مضطرب ہونا بھی فطری تھا۔ بالآخر کافی تلاش کے بعد ایک دن اچانک روم کے ایک چھوٹے سے گندے پب میں اسے یہودہ مل گیا۔ اینجلو کو یوں محسوس ہوا کہ اسے کھوئی ہوئی منزل مل گئی۔ اس نے گندے سے پب میں ملے اس نوجوان کی شبیہ نقش کرنے کے بدلے میں اسے ڈھیر ساری دولت دینا منظور کر لی۔ لیکن کہانی کے آخر میں اسی نوجوان کے ذریعے یہ انکشاف کیا جاتا ہے کہ وہ کوئی اور نہیں، بلکہ وہی بچہ ہے جسے کبھی مائیکل اینجلو نے ننھے یسوع کے روپ میں نقش کیا تھا۔ کہانی کا اختتام اس جملے پر ہوتا ہے جو مائیکل اینجلو کو مخاطب کرتے ہوئے مارسولینی یعنی اسی نوجوان کے ذریعے کہا گیا ہے۔ ''میں وہی یسوع ہوں جسے تم یہودہ نقش کر رہے تھے۔'' گلزار نے اس افسانے میں اپنی جانب سے کچھ بھی شامل نہیں کیا ہے۔ یوں بھی تاریخی واقعے کو فکشن کا روپ دینے میں دیگر پہلوؤں کی شمولیت کی گنجائش کم ہی رہ جاتی ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ فکشن رائٹر تاریخی واقعے کی پیش کش میں کہاں تک کامیاب ہو پایا ہے۔ اس تناظر میں غور کریں تو گلزار کا افسانہ پسندیدگی کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے۔

☐ فیاض رفعت کا افسانہ ''گریہ'' اس ہیبت ناکی کو واضح کرتا ہے جس کی بنا پر آنسوؤں کی خشک ندی سرخ دریا میں تبدیل ہو جاتی ہے اور جس کی چیختی چنگھاڑتی خوفناک موجوں کی زد میں آ کر وجود پلک جھپکتے ہی معدوم ہو جاتا ہے۔ جب کبھی بھی ایسی ہیبت ناکی ذہن و دل پر حاوی ہوتی ہے، سانسیں گھٹنے لگتی ہیں اور غنکبوتی اندھیرے میں دیدے پھیل جاتے ہیں۔ فیاض رفعت نے اس افسانے میں قصباتی زندگی اور اس کے روز و شب کو تجسیم کا روپ دیا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں رہتے ہوئے ہم اپنی جڑوں سے کٹنے لگتے ہیں اور مٹی کی یادیں ذہن سے محو ہونے لگتی ہیں، لیکن فیاض رفعت ان فنکاروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے بڑے شہروں میں زندگی گزارنے کے باوجود قصبوں اور دیہاتوں کی کہانیاں لکھنے میں دلچسپی دکھائی ہے۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں میں زندگی اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اجاگر ہوتی ہے، جسے کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خوشیوں، امنگوں کی فضاؤں میں یکلخت گریہ وزاری کا غلبہ ہو جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ماحول سوگوار ہو جاتا ہے۔ سوگواری کا یہ ماحول محض ہمارا ذاتی المیہ نہیں، بلکہ مہذب سماج اور

معاشرے کا المیہ بھی ہے۔ اس افسانے میں شعور کی رو، واقعات کی بکھری ہوئی کڑیوں کو سمیٹنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ خیالات کا ایک ہجوم ہے جو راوی کے ذہن پر مسلسل دستکیں دے رہا ہے۔ یادوں کا ایک سلسلہ ہے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے۔ یہ یادیں خوشگوار بھی ہیں اور کسی قدر تلخ بھی اور تلخ یادوں کے اژدہام میں تنہا وجود شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح لرزتا ہے۔ پیلی آندھیوں کے غبار میں سب کچھ کھو جاتا ہے اور گریہ وزاری کی صدائیں امنگوں اور خواہشوں کا سینہ چاک کرتی ہوئی اذہان پر حاوی ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہ گریہ ہمارے اپنے خاتمے کا اشاریہ بھی ہوسکتا ہے کیونکہ ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے امنگوں اور خوشیوں کا گلا گھونٹا ہے۔

☐ ناصرہ شرما کا افسانہ ''کنیز بچہ'' قدروں کے تصادم کو بہتر طور پر پیش کرنے میں کامیاب ہے۔ انہوں نے ان قدروں کی بازیافت میں دلچسپی لی ہے جو رفتہ رفتہ ہم سے رخصت ہوتی جارہی ہیں۔ تہذیب اور رکھ رکھاؤ کا ایک چلن تو وہ ہے جس میں انسان خلوص اور اخلاق کی بنیادی قدروں سے وابستہ ہوتا ہے۔ خواہ اس عمل میں اسے کتنا بھی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ چونکہ یہ جذبہ اس کی سرشت میں شامل ہوتا ہے اس لیے کسی بھی مرحلے پر سود و زیاں کا احساس اسے پریشان نہیں کرتا۔ وہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ محبتوں کا سلسلہ کسی طرح جاری رہے۔ دوسروں کے لیے کچھ کرگزرنے کا جذبہ مادی حصول سے کوسوں دور رہتا ہے۔ بدلے میں صرف وہ محبت کا متقاضی ہوتا ہے۔ محبت جو تمام تر مسائل کا بنیادی حل ہے اگر اس کا چلن عام ہوجائے تو دنیا سے نفرت ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گی۔ محبت میں اگر سچائی ہو تو ایک نہ ایک دن اس کی فتح ضرور ہوتی ہے اور محبت کی راہوں میں کانٹے بچھانے والے اپنی آلودہ ذہنیت پر نادم ہوتے ہیں۔ اسی سے وابستہ ایک دوسرا رویہ بھی ہے جس میں بیجا انانیت ہر لمحہ ذہن پر حاوی ہوتی ہے اور خاندانی وقار کا نشہ سر چڑھ کر بولتا رہتا ہے۔ تکبر کا یہ نشہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ دوسروں کی زندگی اس نشے کے آگے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ نشے کی اس آگ میں سب کچھ جل کر آگ ہوجاتا ہے۔ خود انسان کا اپنا وجود بھی اس آگ سے محفوظ نہیں رہ پاتا۔ وہ اپنے اندر آگ کی لپٹیں محسوس کرتا ہے، لمحہ لمحہ اپنے آپ کو خاکستر ہوتا ہوا دیکھتا ہے لیکن وہ چاہ کر بھی اس آگ کو بجھا نہیں پاتا ہے کیونکہ اس کی بیجا انانیت اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ خاندانی وقار کو بالائے طاق رکھ کر انسانیت کی بنیادی قدروں کو اپنائے۔ وہ نفرت کے شعلوں میں جھلستا رہتا ہے۔ پل پل تڑپتا ہے لیکن محبت کی ہواؤں کو گلے نہیں لگا پاتا۔ یہ الگ بات ہے کہ نفرت اور محبت کی جنگ میں جیت ہمیشہ محبت کی ہی ہوتی ہے۔ ناصرہ شرما کے اس افسانے میں بھی محبت کی فتح ہوتی ہے اور نفرت کو بالآخر شکست تسلیم کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑا ہے۔ اس افسانے میں بڑی بیگم اس بات کو کسی طرح قبول کرنے کے لیے تیار نہیں کہ ان کی سوت عزت اور وقار کے معاملے میں ان سے کوئی برابری کرے۔ وہ زندگی بھر اسے معمولی کنیز ہی گردانتی رہیں اور بھولے سے بھی اپنے گھر کی چوکھٹ پر قدم رکھنے نہ دیا۔ یہاں تک کہ اس کے بچے کو زندگی بھر کنیز بچہ ہی کہتی رہیں تاکہ وہ کسی طرح جائیداد میں حصے داری کی بات نہ کرے۔ لیکن

ایک دن وہی کنیز بچہ جب کلکٹر بن کر ان کے شہر میں آتا ہے تو بڑی بیگم کا سارا سکون غارت ہو جاتا ہے۔ یہ سوچ سوچ کر ان کی طبیعت ہلکان ہوئی جاتی ہے کہ اب سرکاری عہدے کا رعب دکھا کر وہ کنیز بچہ جائیداد میں اپنا حصہ حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن آخر میں بڑی بیگم کے سارے خدشات دور ہو جاتے ہیں اور وہ نیک صفت عورت جسے بڑی بیگم ساری عمر کنیز کے نام سے ہی یاد کرتی رہیں، اپنی جائیداد میں اپنے لخت جگر کے ساتھ بڑی بیگم کے صاحبزادے یعنی اپنے سوتیلے بیٹے کو بھی شامل کرتی ہیں اور اس طرح محبت کی ایک انوکھی مثال سامنے آتی ہے۔ کنیز بچہ دراصل علامت ہے انسان کے اس شدید نفرت کا جو ہمارے اذہان پر قابض ہوتا ہے۔ جس کے تحت ہم اپنی زندگی میں، اپنے مرتبے اور وقار میں کسی اور کی شمولیت برداشت نہیں کر سکتے لیکن محبت اگر سچی ہو تو نفرت پہ قابو پایا جا سکتا ہے۔

□ عبدل بسم اللہ کا افسانہ 'پیڑ' مذہب کی کھوکھلی بنیادوں پر گہرا طنز ہے۔ مذہب کے اصل مفہوم سے ہماری واقفیت تک نہیں ہوتی لیکن مذہب کے نام پر انسانوں کو بانٹنے میں ہم کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ ہم ہندو مسلمان سب کچھ تو ہوتے ہیں لیکن انسان نہیں ہوتے۔ انسانی قدروں کا احساس مردہ ہو جاتا ہے اور عجیب سی گھٹن زندگی کا حصہ بن جاتی ہے۔ تنگ نظری کی چکی میں پستا ہوا انسان ہر لمحہ کرب و اذیت سے دوچار ہوتا ہے اور جب درد انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور برداشت کی قوت جواب دینے لگتی ہے تو پھر تمام سرحدیں خود بہ خود ٹوٹ جاتی ہیں۔ عبدل بسم اللہ نے اسی کیفیت کو افسانے میں پیش کیا ہے۔ گاؤں کا ایک سیدھا سادھا آدمی باغبانی کے ذریعے زندگی کی گاڑی کسی طرح کھینچ رہا ہوتا ہے کہ اچانک اس کی زندگی کا سارا سکون درہم برہم ہونے لگتا ہے۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف گشت کرنے لگتی ہے کہ بقریدی کے باغ میں ایک بڑے سے پیڑ پر ہنومان جی پدھارے ہیں۔ سیدھے سادے گاؤں والوں کے لیے یہ واقعہ معمولی نہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تل کا تاڑ بن گیا۔ پنڈتوں نے اسے بھاگیہ کا واسطہ دے کر ہنومان جی کے لیے نت مستک ہونے کا مشورہ دیا تو گاؤں کے مولوی ملاؤں نے اسے آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے مذہب کی دہائی دی۔ بے چارے بقریدی کی زندگی اجیرن ہوگئی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ اس مسئلے کا کوئی مناسب حل نکل آئے اور اسے سکون حاصل ہو لیکن جب اسے بات کسی طرح بنتی ہوئی دکھائی نہیں دی تو اس نے بالآخر وہ پیڑ ہی کاٹ ڈالا۔ جب زندگی میں قدم قدم پر اڑچنیں آنی شروع ہو جاتی ہیں تو انسان شاد و ناشاد اس نوعیت کا فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آج ہم نے مذہب کا دائرہ اس قدر تنگ کر دیا ہے کہ ذرا سی آنچ سے مذہب خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ ہم اس حقیقت سے انجان ہیں کہ ایسا کر کے ہم نے خود اپنے لیے کتنی مصیبتیں مول لی ہیں۔

□ سید محمد اشرف کا افسانہ 'قدیم معبدوں کا محافظ' تحیراتی اور استعجابی اسلوب میں زندگی کی ایک تلخ حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ اس حقیقت سے آگاہی کراتا ہے جو ہمارے ذہن سے محو ہوگئی۔ ہم نے خود اپنے آپ کو فراموش کر دیا۔ ماضی سے ہمارا کوئی بھی رشتہ باقی نہیں رہا۔ تنہائی اور تاریکی ہمارے دلوں پر قابض ہے۔

لیکن ہم اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ ہمیں اس گھٹن کا احساس تک نہیں ہے۔ روشنی اور تازہ ہواؤں کی تلاش میں ہم در در بھٹکتے ہیں۔ لیکن ہماری یہ جستجو کارگر ثابت نہیں ہو پاتی اور ہر لمحہ زندگی میں تنہائیوں اور تاریکیوں کی گرفت بڑھتی جاتی ہے۔ بے حسی کا شکنجہ کستا چلا جاتا ہے اور ہم رفتہ رفتہ چلتی پھرتی لاش میں تبدیل ہونے لگتے ہیں جس کے پاس جذبات کا کوئی سرمایہ نہیں ہوتا۔ جو حسیت کی تمام تر کیفیتوں سے مبرا ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اگر اس کے اسباب پر غور کیا جائے تو موجودہ عہد کے تمام تر مسائل اپنی گوناگوں کیفیات کے سہارے ہم سے ہم کلام ہوں گے۔ سید محمد اشرف کا یہ افسانہ مختصر ہونے کے باوجود ڈھیر سارے پہلوؤں پر غور وفکر کے لیے ہمیں اکساتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ زندگی کے تئیں اپنے سابقہ رویے میں تبدیلی کے لیے مجبور بھی کرتا ہے۔ ارتقا کی منزلیں طے کرتے ہوئے ہم نے گزرے لمحات کی سرحد کو سرے سے ہی نظر انداز کر دیا اور تیز رفتاری کے دھند میں بہت سے ایسے مقامات کو ٹھہر کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا جن سے خود ہماری اپنی شناخت وابستہ رہی ہے۔ بلکہ وہ شناخت ہنوز ہماری موجودگی کا جواز فراہم کرتی ہے۔ ظاہر ہے تیز رفتاری کی دھن میں اگر ہم نے زندگی کے اس بنیادی جذبے کو فراموش کر دیا تو وقت خود ہم سے اس بے حسی کا جواب طلب کرے گا۔ لیکن اس وقت ہماری لکنت زدہ زبان کسی بھی طرح کے تاثر کا اظہار کر پانے میں ناکام ہوگی۔ اور پھر اچانک روشنی اور تازہ ہواؤں کا گزر بند ہوتا ہوا دکھائی دے گا۔ تاریکی اور تنہائی پوری طرح ہمارا مقدر بن جائے گی۔ گھٹن کا کرب مسلسل عذاب میں تبدیل ہو جائے گا۔ اشرف نے اپنے افسانے میں معبدوں کا ایسا منظر نامہ پیش کیا ہے جو قدامت کے باعث اپنا وقار کھو چکے ہیں۔ جس کے ظاہری خدوخال بہت حد تک مسخ ہو چکے ہیں اور احترام کا جذبہ پس پشت جا پڑا ہے۔ جن معبدوں نے ان عمارتوں کی تعمیر کی تھی خود ان کے لیے بھی وہ در و دیوار اجنبی ہو چکے ہیں۔ وہ بھولے بھٹکے ان معبدوں کا رخ کرتا ہے جو اب بہت حد تک بوسیدہ ہو چکے ہیں۔ شکستہ در و دیوار کو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ دیواروں پر آویزاں نقش و نگار جو کبھی خود اپنے ہاتھوں سے وجود میں آئے تھے، آج اس کے لیے قطعی انجان ہیں۔ حس مردہ ہو چکا ہے اور وہ خود اپنے زوال سے ناواقف ہے۔ اشرف نے اس کہانی میں حسیت کی دو سطحوں کو پیش کیا ہے۔ ایک سطح تو وہ ہے جہاں محسوسات پژمردہ ہو چکے ہیں اور خود اپنے زوال سے ناواقفیت عام ہو چلی ہے۔ دوسری سطح وہ ہے جہاں قدروں کی شکست کا احساس ہنوز باقی ہے اور اپنے زوال کا نوحہ پڑھنے کے بجائے بہتر حالات کے استحکام کا رویہ ذہن پر حاوی ہے۔

□ حسین الحق کا افسانہ ''خانم'' تاریخ کو فکشن کا روپ دینے کی ایک بامعنی کوشش ہے۔ تاریخی پس منظر میں فکشن کا تانا بانا تیار کرنا بے حد دشوار امر ہے جہاں ذرا سی کوتاہی کے باعث تمام تر محنتوں پر پانی پھر سکتا ہے۔ اس نازک مرحلے پر تاریخی شواہد کے پیش نظر تخلیقی توانائیوں کا کارگر استعمال وہی کر سکتا ہے جسے تاریخ اور فکشن کا بنیادی فرق معلوم ہو۔ حسین الحق اس فرق سے بخوبی واقف دکھائی دیتے ہیں جس کا ثبوت انہوں نے اپنے اس افسانے میں پیش کیا ہے۔ لیکن مجھے ان کی اس تحریر کو باقاعدہ افسانہ کہنے میں ذرا تامل ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے حسین الحق کی یہ تحریر دراصل ان کے تاریخی ناول ''شیر شاہ'' کا ایک مختصر اور نامکمل باب ہے جس میں شیر شاہ، یعنی فرید خاں کی والدہ محترمہ ''خانم'' کی ذہنی الجھنوں کا بیان ہے۔ حسن خاں یعنی شیر شاہ کا باپ علاقائی صوبیدار تھا، اور سہسرام کے قرب و جوار میں اس کی زبردست دھاک تھی۔ خانم اپنے شوہر حسن خان کا خاص خیال رکھتی تھی۔ اس کے باوجود وہ خانم کی گرفت میں نہیں آتا تھا اور یکے بعد دیگرے اس نے تیسری شادی بھی کر لی تھی۔ خانم کی رگوں میں راجپوت سرداروں کا خون گردش کر رہا تھا۔ لہٰذا یہ بات اسے کیسے برداشت ہوتی کہ اس کا شوہر اس کی سوتنوں میں اضافہ کرتا رہے۔ وہ شوہر کی ان خصلتوں سے بہت پریشان رہتی ہے اور چاہتی ہے کہ کسی طرح اس مسئلے کا حل تلاش کیا جائے۔ کافی غور و خوض کے بعد اسے یہ خیال آتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے فرید خاں کی تربیت میں سنجیدگی سے توجہ دے تاکہ بڑا ہو کر وہ اپنے باپ پر غالب آسکے اور اس طرح بلاواسطہ طور پر اسے خود حسن خاں پر غلبہ حاصل کرنے کا موقع مل سکے۔ خانم اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے فرید خاں کی دیکھ ریکھ میں زیادہ دھیان دینے لگتی ہے اور پیار محبت سے اپنے بیٹے کا دل اپنے قبضے میں کرنے کے لیے ہمہ تن مصروف ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اپنے نظرانداز کیے جانے کا احساس اسے دوبارہ تڑپاتا ہے اور اسی کیفیت میں افسانے کا اختتام ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے سلسلے وار کہانی کا ایک نامکمل حصہ ہونے کی بنا پر تشنگی کا احساس باقی رہ جانا فطری ہے۔ بہرحال اس کہانی کو مکمل طور پر پڑھنے کا اشتیاق ادب کے سنجیدہ قارئین کو ضرور ہوگا، البتہ تاریخی واقعات زبان کی سطح پر جس پختگی کا تقاضہ کرتے ہیں، اس کی کمی اس تحریر میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

□ ساجد رشید کا افسانہ 'راکھ' محبت کے بنیادی جذبے کو مذہب پر فوقیت دیتا ہے۔ اس افسانے کے ذریعہ انہوں نے یہ واضح کیا ہے کہ سچی محبت کسی بھی طرح کی مصلحت اندیشی سے بالکل پاک ہوتی ہے۔ جسم ضرور فنا ہو جاتا ہے لیکن روح کبھی نہیں مرتی اور جب روح زندہ ہوتی ہے تو پھر ذہن و دل میں اٹھنے والی محسوسات کی لہروں میں ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوتا اور ڈوبنے ابھرنے کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک روح کی صداؤں پر ہم لبیک نہیں کہتے۔ بلاشبہ دل کی آواز کو اپنا رہبر تسلیم کرنے میں ہمیں ڈھیر ساری دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن صحیح معنوں میں سکونِ قلب سے ہم تبھی ہمکنار ہوتے ہیں۔ محسوسات کی ایک منزل ایسی بھی ہوتی ہے جب ہم دنیا کی قطعی پرواہ نہیں کرتے۔ مذہب کی سرحدیں اور تہذیب و معاشرے کے بندھے ٹوٹے اصول کوئی مفہوم نہیں رکھتے اور ذہن و دل ایک ایسی ڈگر پر چلنے پہ آمادہ ہو جاتا ہے، جدھر سے کبھی کسی قافلے کا گزر نہ ہوا ہو۔ بیشتر اوقات یوں ہوتا ہے کہ ذہن کسی اور مسئلے سے برسرِ پیکار دکھائی دیتا ہے جب کہ دل میں جذبات کی ایک دوسری ہی جنگ جاری ہوتی ہے۔ ذہن اور عقل کی کارفرمائی دل سے قطعی مختلف ہوتی ہے اور دونوں بالکل متضاد راستوں پر گامزن دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات زندگی کے کسی موڑ پر ایک پڑاؤ ایسا بھی آتا ہے جب ذہن اور دل کے متصادم رویے مشترک محسوسات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یعنی آگ میں بے خطر کودنے میں دل کے ساتھ عقل کی بھی شمولیت ہو جاتی ہے۔ ساجد رشید

نے اپنے افسانے میں فنکاری کے ساتھ انہیں کیفیات کو پیش کیا ہے۔ مذہب کی سرحدوں کو توڑتے ہوئے انہوں نے سماج اور معاشرے کے بوسیدہ نظام پر سخت چوٹ کی ہے۔ معاملہ دل کا ہو اور تعلق جذباتی تو پھر مذہب کی جکڑ بندیاں بھی آڑے نہیں آسکتیں اور کبھی یہ مسئلہ سامنے آتا بھی ہے تو پھر ذہن اور دل جو مختلف راستوں کے مسافر ہوتے ہیں اسی موڑ پر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور پھر شروع ہوتا ہے ایک مشترکہ راستے کا سفر جو زندگی کا ایک نیا منظرنامہ پیش کرتا ہے۔ اس افسانے میں جمال، سیما کی محبت میں اس قدر دیوانہ ہو چکا ہے کہ تبدیلیٔ مذہب کا مسئلہ بھی اس کے عزم اور ارادے میں قدغن لگانے سے قاصر ہے۔ وہ کسی بھی طرح سیما کو حاصل کرنا چاہتا ہے کہ اب اس کے بغیر زندگی کا کوئی تصور ممکن نہیں۔ یہی کیفیت سیما کی بھی ہے۔ وہ بھی جمال کو دیوانہ وار چاہتی ہے اور جلد از جلد شادی کے بندھن میں بندھ کر ہمیشہ کے لیے ایک ہو جانا چاہتی ہے۔ لیکن مذہب کی اڑچن دونوں کی راہ میں حائل ہے۔ سیما کے حصول کے لیے جمال ہندو مذہب قبول کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہے لیکن سیما کے والد جو کٹر برہمن ہیں، کسی بھی طرح اس کی اجازت نہیں دیتے۔ مجبور ہو کر سیما خود اپنا مذہب قبول کر لیتی ہے اور مسلمان بن کر جمال کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگتی ہے۔ جمال کے گھر والوں نے سیما کو دل سے قبول کر لیا ہے۔ گھر والوں کا دل جیتنے کے لیے سیما بھی کوئی کوتاہی نہیں برتتی ہے۔ اپنے رکھ رکھاؤ، بات چیت اور اخلاص سے اس نے گھر کے سبھی لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ وہ سنجیدگی سے احکامات مذہب کی پابندی بھی کرتی ہے اور اسے دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنا مذہب تبدیل کر کے حال ہی میں مسلمان ہوئی ہے۔ تمام لوگ اس کی مثالیں دیتے ہیں۔ ہنسی خوشی زندگی گزارتے ہوئے ایک سال کا عرصہ گزر جاتا ہے کہ اچانک ایک سنگین مرض کی چپیٹ میں آ کر سیما سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ جمال کے لیے تو زندگی بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ گھر میں مرحومہ کے غسل کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ جمال، سیما کی یادوں میں اداس اور گم صم بیٹھا ہے۔ اچانک جذبات کا سمندر ابل پڑتا ہے اور وہ ایک ایسا فیصلہ کرتا ہے جسے سن کر گھر میں افراتفری کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ سیما کو دفنانے کے بجائے اس کے داہ سنسکار پر اٹل ہے۔ کیونکہ اس کی شریک حیات نے مجبوری میں اپنا مذہب تبدیل کیا تھا اور اب جب کہ وہ تمام تر بندھنوں سے آزاد ہو چکی ہے جمال چاہتا ہے کہ سیما کی روح کو سکون مل سکے۔ وہ اپنے گھر والوں کی ہزار مخالفتوں کے باوجود سیما کی لاش اپنے کاندھوں پر اٹھائے سیما کے گھر جاتا ہے تاکہ جسم کے بجائے کم از کم سیما کی روح کو اس کے والدین کو سونپ سکے۔ ساجد رشید کا یہ افسانہ ٹریٹمنٹ اور اپروچ کی سطح پر ہمیں چونکاتا ہے۔ اس افسانے میں کئی نازک موڑ ایسے آتے ہیں جب تخلیق کار کا قلم لغزشوں سے دوچار ہو سکتا تھا لیکن ساجد رشید کٹھن منزلوں سے نہایت کامیابی کے ساتھ گزر گئے ہیں۔

□ اعظم راہی کا افسانہ ''کبوتری'' زندگی کی گتھیوں کو سلجھاتا ہے۔ زندگی میں جہاں خوشیاں حاصل ہوتی ہیں وہیں غموں سے بھی انسان کا پالا پڑتا ہے۔ اتار چڑھاؤ، دھوپ چھاؤں، سکھ دکھ کا سلسلہ مسلسل جاری رہتا

ہے لیکن انسان کو چاہیے کہ وہ مسائل سے نہ گھبرائے اور خاموشی کے ساتھ منزل کے حصول میں لگا رہے۔ جب ذہن اور تصور کے سہانے خواب بکھر جاتے ہیں تو زندگی میں ہر طرف اندھیرا چھا جاتا ہے۔ زندگی اجاڑ ہو جاتی ہے لیکن انسان چاہے تو وہ اپنی کوششوں سے زندگی کی اُداس راہوں میں خوشیوں کے پھول بکھیر سکتا ہے۔ اعظم راہی کا افسانہ اسی جذبے سے متعلق ہے۔ اس افسانے میں ہاجرہ محبت کے تلخ تجربات سے گزرتی ہے اور پھر زندگی سے اتنی نالاں ہو جاتی ہے کہ آئندہ محبت کے تصور سے ہی گھبرانے لگتی ہے۔ لیکن محبت تو وہ جذبہ ہے جو دل کے کسی نہ کسی گوشے میں ہمیشہ قائم رہتا ہے اور نظر انداز کرنے پر اس کا درد مزید تڑپاتا ہے۔

☐ مظہر الزماں خاں کا علامتی افسانہ ''ایک شہر جو کبھی آباد تھا'' ایک ایسے شہر کا نوحہ پیش کرتا ہے جو اب پوری طرح تباہ و برباد ہو چکا ہے اور سیاح اس کو دیکھ کر عبرت حاصل کر رہے ہیں۔ لیکن یہ شہر ماضی کی بھولی بسری داستان نہیں بلکہ حال کا ایک عبرت ناک سانحہ بھی ہو سکتا ہے۔ آج کے صنعتی اور مادی مفادات سے پر معاشرے میں جس تیزی کے ساتھ قدروں کا زوال ہو رہا ہے، وہ دراصل ہمارے اپنے انتشار کا نوحہ ہے۔ ہماری نگاہوں کے آگے بے حسی کی دھند اس قدر چھائی ہوئی ہے کہ ہم خود اپنی تباہی کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اچھی طرح نہیں پہچان پا رہے ہیں۔ آخر اس بے حسی کی وجہ کیا ہے؟ کیا ہم نے جان بوجھ کر تلخ سچائیوں سے منہ پھیرنے کا اعادہ کر لیا ہے۔ یا پھر مادّی آسائشوں نے ہمیں اتنا لاپرواہ بنا دیا ہے کہ تبدیلیوں کی آہٹ کا احساس بھی نہیں ہو پا رہا ہے۔ مظہر الزماں کا یہ افسانہ اس جیسے اور بھی بہت سے سوالات اٹھاتا ہے۔ وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو لیکن اب تو یہی سچائی ہے کہ قدروں کی گرتی ہوئی دیواروں کو کوئی روکنے والا نہیں۔ وہ شہر جو کبھی دل میں آباد تھا، رفتہ رفتہ ویران ہوتا جا رہا ہے، لیکن ہم اتنے بے بس اور مجبور ہیں کہ اس شہر کی لٹتی ہوئی رونق کو دوبارہ بحال کرنے کی صلاحیت ہم میں نہیں۔ خاموش تماشائی کی مانند ہم صرف قدروں کی شکست و ریخت کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ مظہر الزماں خاں کے اس افسانے میں سیاحوں کے حوالے سے طنز کے جو کلمات ادا کیے گئے ہیں، دراصل وہ خود اپنی خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ سیاح جو موجودہ عہد کے انسانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ باہری دنیا کی منہدم عمارتیں اور بوسیدہ کھنڈرات دیکھنے میں دلچسپی تو رکھتے ہیں لیکن پل پل ٹوٹتے بکھرتے ذات کے شکستہ کنگورے انہیں دکھائی نہیں دیتے۔

☐ شوکت حیات کا افسانہ ''فرشتے'' زندگی کے کھوکھلے پن پر شدید طنز ہے۔ شاعر، افسانہ نگار اور نقاد — اس تثلیث کے پردے میں زندگی کے گہرے اسرار و رموز کو افسانے میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کبھی کبھی سب کچھ پا لینے کے بعد بھی انسان نا تکمیلیت کے احساس سے اندر ہی اندر گھٹتا رہتا ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کچھ نہ ہونے کے باوجود مکمل سیرابی حصے میں آتی ہے اور زندگی سے جو موقع بھی انہیں غنیمت مل جاتا ہے، وہ اسے پوری طرح جینے کی کوشش کرتے ہیں۔ شوکت حیات نے اپنے اس افسانے میں ایک چھوٹے سے شہر کی کہانی پیش کی ہے جس کے پس پردہ بڑے شہر میں رہ رہے لوگوں کی ذہنیت بھی آشکار

ہوتی ہے۔ بڑے شہر کے لوگ اس زعم میں رہتے ہیں کہ ادب کا تاج صرف اور صرف انہیں کو زیب دیتا ہے۔ ان کے علاوہ کوئی بھی اس کا مستحق نہیں۔ لیکن چھوٹے شہروں میں مسائل سے جوجھتے ہوئے لوگ جس طرح شعر و ادب کی تخلیق میں مصروف رہتے ہیں، دراصل انہیں تحریروں میں زندگی کی تلخ سچائیاں زیادہ بہتر طریقے سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس افسانے کے تین کردار جو افسانہ نگار، شاعر اور تنقید نگار ہیں، وہ زندگی کے دشوار ترین وقت کو خوشی خوشی جھیلنے پر بھی آمادہ ہیں۔ وہ زندگی کی صعوبتوں سے پریشان نہیں ہوتے ہیں اور ان کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اسی طرح زندگی کا لطف حاصل کرتے رہیں۔ افسانہ نگار جو حقیقت پسند واقع ہوا ہے، اسے معاشرے کی ان ناہمواریوں کو دیکھ کر بڑی وحشت ہوتی ہے اور وہ ان کے خلاف بڑی شدت کے ساتھ آواز بلند کرتا ہے۔ شاعر جو نسبتاً متوازن ذہن کا مالک ہے تخیل کی وادیوں میں اکثر کھویا رہتا ہے۔ لیکن وہ اپنی شعری تخلیقات کی نغمگی سے ذہنوں کو مسحور کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ منجھے ہوئے شعراء اس کے سامنے اپنا چراغ روشن نہیں رکھ پاتے اور اس کی مقبولیت سے خار کھاتے ہیں۔ تنقید نگار وقفے وقفے سے اپنی دور رس نگاہوں کا ثبوت پیش کرتا ہے اور اپنی باریک بینی اور ذہنی براقی کی بدولت اہم نقطوں کی نشان دہی کرتا ہے جس سے تخلیق میں چار چاند لگ جاتا ہے۔ شاعر اور افسانہ نگار دونوں ہی صاحب نظر کے قائل دکھائی دیتے ہیں۔ ان تینوں میں بہت گاڑھی چھنتی ہے۔ تینوں ایک ساتھ کسی محفل میں شریک ہوتے ہیں اور اپنی ذہانت سے حاضرین کے دل پر انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ بڑے شہروں سے آنے والے ادیب و شاعر ان کی صلاحیتوں کو نظر انداز نہیں کر پاتے۔ ان تینوں کو خود بھی اپنی اہمیت کا احساس ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو تیسری دنیا کی مخلوق نہیں سمجھتے ہیں اور زمین سے جڑے ہوئے لوگوں کی مانند ان میں تکبر کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ اپنے خیالوں کی دنیا میں مست رہتے ہیں اور زندگی کو اپنے ڈھنگ سے گزارنے میں یقین رکھتے ہیں۔ شوکت حیات کا یہ افسانہ ادیب و شاعر اور فنکار کی ذہنی آزادہ روی کو ظاہر کرتا ہے جس کی بنا پر عام لوگوں کی فہرست میں شامل ہونے کے باوجود حسیت کے اعتبار سے وہ نمایاں فرق رکھتا ہے۔

□ شموئل احمد کا افسانہ ''منزل واٹر'' خواب اور حقیقت کی سرحدوں کو واضح کرتا ہے۔ کبھی یہ سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، تو کبھی ان میں بہت واضح فرق کا احساس ہوتا ہے۔ یہ سرحدیں زندگی کے متصادم رویوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ان سرحدوں میں واضح فرق کا احساس اس بات کا ثبوت ہے کہ سماج اور معاشرہ طبقاتی بندشوں سے اب تک آزاد نہیں ہو پایا ہے، جب کہ دو متضاد سرحدوں کا ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا اس بات کا اشاریہ ہے کہ فطری جذبات کسی قسم کی بندشوں سے پوری طرح آزاد ہوتے ہیں۔ شموئل احمد نے اپنے افسانے میں بہ یک وقت دونوں کیفیات کو اجاگر کیا ہے، اس لیے کہ زندگی، جذبات کے اسی اتار چڑھاؤ سے عبارت ہے۔ دھوپ چھاؤں کا یہی سلسلہ زندگی کو معنویت بخشتا ہے۔ حالانکہ شموئل احمد نے اس افسانے میں جو واقعہ قلم بند کیا ہے، وہ آئے دن رونما ہونے والا واقعہ نہیں،

بلکہ اس کی وقوع پذیری پہ شبہات بھی قائم کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ اس نوعیت کا واقعہ وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ بعض اوقات فطری تقاضے اتنے شدید ہوتے ہیں کہ جسموں کا ملن کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتا اور پھر فرط و انبساط کی بے کراں لہروں میں ڈوبنے ابھرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ چند لمحوں کے لیے خواب حقیقت میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور چاندنی ملگجی اندھیرے میں گھلنے لگتی ہے۔ شموئل احمد کے افسانوں میں جنس کلیدی حیثیت رکھتا ہے، لیکن جنس کے پس پردہ وہ زندگی کے دیگر پہلوؤں پر بھی اظہار خیال کی گنجائش نکال لیتے ہیں۔ اس افسانے میں بھی یہ خوبی موجود ہے۔

☐ پیغام آفاقی کا افسانہ 'کوآپریٹیو سوسائٹی' جدید معاشرے کی شاطرانہ چالوں سے ہمیں آگاہ کراتا ہے۔ یہ معاشرہ بظاہر ہمیں ایک آئیڈیل معاشرہ لگتا ہے اور جس کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہم نہیں تھکتے لیکن دراصل یہ معاشرہ اندر سے اس قدر آلودہ اور کھوکھلا ہو چکا ہے کہ اگر اس کا حقیقی روپ ہم دیکھ لیں تو وحشت ہونے لگے۔ سنجیدگی سے غور کیا جائے تو یہ معاشرے کا نہیں بلکہ خود ہمارا اپنا زوال ہے۔ خود ہماری شکلیں اتنی مسخ ہوگئی ہیں کہ احساس کی آنکھیں کھول کر اپنے وجود کا سامنا کرنے کی ہمت ہم میں نہیں رہی۔ ہم آدرش کی بات تو کرتے ہیں لیکن صحیح معنوں میں ہم اس کے مفہوم سے واقف نہیں۔ یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنے رہنے میں ہمیں زیادہ عافیت محسوس ہوتی ہے۔ ایک مچھلی کے ذریعے سارے تالاب کو گندہ کرنے کی بات اب پرانی ہو چکی ہے۔ فی الوقت صورت حال یہ ہے کہ تالاب کی ساری مچھلیاں گندی ہو چکی ہیں، لیکن اس کے باوجود تالاب بظاہر گندہ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ البتہ غور سے دیکھنے پر اس کی گندگی پوری طرح نمایاں ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ نظر بھی معدوم ہوتی جارہی ہے جو بظاہر صاف ستھرے لیکن بباطن گندے تالاب کی غلاظت پر نگاہیں مرکوز کر سکے۔ ظاہر ہے ایسے میں گورکھ دھندوں کا ارتقاء لازمی ہے۔ جب آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوں تو سامنے کا منظر دکھائی بھی کیسے دے سکتا ہے۔ لیکن ایک کھرا آدمی بصارت کی اس بندش کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر پاتا اور پوری شدت سے وہ صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ وہ کھرا آدمی سود و زیاں کی سرحد سے نکل آیا ہے اور چاہتا ہے کہ ہر غلط کام کے خلاف آواز اٹھائے۔ قدم قدم پر ہونے والی ناانصافیوں اور سازشوں کا منہ توڑ جواب دے لیکن وہ چاہ کر بھی مجبور ہے۔ بہت بے بس اور لاچار ہے۔ اس لیے کہ اس کی لڑائی صرف ایک فرد سے نہیں بلکہ پورے سماج سے ہے۔ معاشرے کے ان ٹھیکیداروں سے ہے جو زندگی کا معیار متعین کرتے ہیں اور جن کے اشاروں پر تہذیب کے زاویے تبدیل ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے اس جنگ میں اس کھرے آدمی کی شکست یقینی ہے۔ لیکن نہیں۔ بظاہر اس کی ناکامی کو مکمل شکست کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ زندگی کے تئیں اس کا جو مثبت ردعمل ہے، وہ ہار کے باوجود اس کی جیت کا ثبوت ہے۔ پیغام آفاقی نے اپنے افسانے میں زندگی کے ایسے ہی اتار چڑھاؤ کو پیش کیا ہے۔ چند ذمے دار لوگوں کی بدولت کوآپریٹیو سوسائٹی کا قیام عمل میں آتا ہے اور بعض سنجیدہ لوگوں کی انتھک جدوجہد اور محنت کے سبب سوسائٹی قلیل مدت میں ہی ترقی کی منزلیں طے کرنے لگتی ہے۔

لیکن سوسائٹی کے وہی ممبران جو آغاز میں ذاتی مفاد سے اوپر اٹھ کر سوسائٹی کی ترقی کے لیے جی جان سے جٹے تھے، وہی لوگ رفتہ رفتہ اس کی جڑیں کاٹنے میں مصروف ہو گئے۔ ایک، کھرا آدمی اپنی بساط بھر قوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑی شدت کے ساتھ تمام تر لوگوں کی توجہ ان خامیوں کی طرف مبذول کراتا ہے لیکن ہر قدم پر اسے ناکامی ہوتی ہے۔ اس کی آواز سینے میں ہی گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ اس کھرے آدمی کی آواز اگرچہ بڑی ہنرمندی کے ساتھ دبا دی جاتی ہے۔ لیکن اس بے حس معاشرے میں بذاتِ خود اس کھرے آدمی کا موجود ہونا ہی اپنے آپ میں روشنی کی بشارت ہے۔

□ حسن جمال کا افسانہ ''ادھر مت بہو ہوا'' رشتوں کے نفسیاتی بوجھ سے متعلق ہے۔ بعض اوقات رشتوں کا یہ بوجھ انسان کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود خاموشی کے ساتھ اس بوجھ کو ڈھونا اس کی تقدیر بن چکی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اس عمل میں اس کی پوری شخصیت بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے اور وہ سہما سہما اپنے وجود کا شیرازہ بکھرتا ہوا دیکھتا ہے۔ ایسے میں یادوں کی پروائی اس کے غم میں مزید اضافے کا باعث ہوتی ہے۔ زندگی کے رگ و پے میں شامل تلخ یادوں کے غبار سے بے چینیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے اور زندگی لحہ لحہ عذاب میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ حسن جمال نے محرومیوں کی اسی آنچ کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار اپنی تنگ حالی سے سخت پریشان ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دکھ بھرے لمحوں کا کسی طرح خاتمہ ہو۔ لیکن ہزار کوششوں کے باوجود مصائب کی بدلیاں نہیں چھٹتیں اور درد کی بارش میں اس کا وجود بھیگتا چلا جاتا ہے۔ ہر لمحہ اسے یہ احساس ڈستا ہے کہ وہ اپنی شریک حیات کے سنہرے خوابوں کو تعبیر سے ہمکنار نہ کر سکا۔ ہر پل وہ مضطرب دکھائی دیتا ہے کہ اپنی بچیوں کے بہتر مستقبل کے لیے کچھ بھی نہیں کر پایا ہے۔ درد کی یہ لہر تنہائیوں میں اسے بہت تڑپاتی ہے۔ محرومیوں کا یہ احساس اس وقت شدت اختیار کر لیتا ہے جب رشتوں کا بوجھ اسے کاندھوں پر اٹھانا پڑتا ہے۔ رشتے داروں کے طعنے اس کے سینے میں نشتر چبھوتے ہیں اور ہر لمحہ اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کا وجود اب بے معنی ہو چکا ہے۔ وہ پوری دنیا میں اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتا ہے۔ اس کا درد بانٹنے والا کوئی نہیں۔ نگاہوں کے آگے اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ دور دور تک کوشش کے باوجود کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ موجودہ عہد کا یہ المیہ ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ کیونکہ اس مجبور بے بس اور لاچار انسان میں کہیں نہ کہیں ہمارے اندر کا انسان بھی شامل ہے جسے چھوٹی چھوٹی خواہشوں کی تکمیل کے لیے ہر لمحہ اپنے آپ کو گروی رکھنا پڑتا ہے۔

□ طارق چھتاری کا افسانہ ''برف اور پانی'' جذبات کے اتار چڑھاؤ کو پیش کرتا ہے۔ جب پہاڑوں کی برف پگھلتی ہے تو وہ آبشاروں کا روپ اختیار کر کے نگاہوں کو خیرہ کرتی ہے اور پھر ٹیڑھے میڑھے پہاڑی راستوں سے اترتا ہوا صاف و شفاف پانی نغمگی اور ترنم کے ساتھ پیاسی زمین کی سیرابی میں مصروف ہو جاتا ہے۔ صدیوں سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ برف پگھلتی ہے اور دریا اپنی روانی کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے

لیکن جب ہواؤں میں خنکی بڑھتی ہے اور موسم میں انجمادی کیفیتوں کا اضافہ ہونے لگتا ہے تو دریا کو روانی بخشنے والی برف دوبارہ سے جمنے لگتی ہے اور پھر کچھ مدت کے لیے سب کچھ دھند میں کھو جاتا ہے۔ طارق چھتاری نے اپنے افسانے میں یہی کیفیت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ماضی کی تڑپ، حال کی کڑواہٹیں اور مستقبل کی بے چینیوں کے پیشِ نظر جذبات کی برف پگھلتی ہے اور پھر دور تک نگاہوں کا صحرا جل تھل ہو جاتا ہے۔ جذبات کی برف کا پگھلنا زندگی کے تئیں مثبت رویے کا غماز ہے اور یہی رویہ صورت حال کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کے لیے راہیں ہموار کرتا ہے۔ لیکن جذبات کی یہی برف جب دوبارہ سے جمنے لگتی ہے تو پھر دیکھتے ہی دیکھتے زندگی درد کے صحرا میں تبدیل ہو جاتی ہے، اذیتوں کا سلسلہ دراز ہونے لگتا ہے اور اضطرابی کیفیت انتہا تک پہنچ جاتی ہے۔ یونیورسٹی کیمپس سے متعلق اس کہانی میں خواب اور حقیقت کی سرحدیں آپس میں مدغم ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ان دونوں کے مابین حدِ فاصل کا احساس واضح طور پر ہونے لگتا ہے۔ شعور سے لاشعور اور پھر لاشعور سے شعور کی متعدد منزلوں کو ذہنی جست کے سہارے پھلانگنے کی کوشش میں طارق چھتاری کے قدم کہیں کہیں لڑکھڑائے بھی ہیں لیکن پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ذہن میں اٹھنے والی ترنگوں کو انہوں نے تحریر کی گرفت میں لے کر اپنے قارئین سے مکالمے کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

□ محسن خان کا افسانہ ''نیند'' عورت کی نفسیات کو کامیابی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی اور عام واقعات سے انہوں نے اپنی کہانی کا خام مواد تیار کیا ہے۔ لیکن ان کی کہانی میں بیان ہونے والا عام واقعہ کہانی کی بنت میں شامل ہونے کے بعد پھر ''عام'' سا نہیں رہ جاتا ہے بلکہ مشترک محسوسات کی عکاسی کے بعد اسے خاص اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ محسن خان اپنے افسانے میں قدم قدم پر سوالات کرتے ہیں اور بہت سے پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد کچھ پہلوؤں کو یوں ہی تشنہ چھوڑ دیتے ہیں۔ گویا وہ مسائل ابھارتے ہیں اور اس کی جزئیات کو واضح بھی کرتے ہیں لیکن مسائل کا حل پیش کرنے میں انہیں کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ ''نیند'' میں انہوں نے عورت کی زندگی میں پیش آنے والے اتار چڑھاؤ اور نفسیاتی الجھنوں کا بیان کیا ہے۔ لیکن اس کا کوئی حل وہ پیش نہیں کرتے۔ زندگی کے آغاز سے لے کر عمر کے آخری دہانے تک عورت کی زندگی متعدد مسائل سے دوچار ہوتی ہے۔ جب تک وہ باپ کی نگرانی میں ہوتی ہے، اسے خاص طرح کی بندشوں میں رہنا پڑتا ہے اور شادی کے بعد اپنی خواہشوں پر اسے شوہر کی خواہشوں کو فوقیت دینی ہوتی ہے۔ کتنی عجیب ہوتی ہے عورت کی زندگی۔ جب تک وہ شادی کے جھمیلوں میں نہیں پڑتی اس کی زندگی بہت حد تک آزاد ہوتی ہے۔ اسے اپنی خواہشوں پر بہت حد تک اختیار ہوتا ہے۔ لیکن شادی کے بندھنوں پر بندھتے ہی جیسے اس کی ساری آزادی سلب ہو جاتی ہے۔ اس کی اپنی تمنائیں کوئی معنی نہیں رکھتیں اور ہر قدم پر اسے دوسرے کی خوشیوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کم و بیش یہی کہانی ہر گھر کی ہے۔ خواہ وہ متوسط گھرانا ہو یا پھر اس کا تعلق اعلیٰ طبقے سے ہو۔ لیکن عورت کی حالت بیشتر جگہوں پر مایوس کن ہی رہتی ہے۔ سب سے بڑا

المیہ یہ ہے کہ عورت کی نفسیات کو سمجھنے والا کوئی نہیں۔ عورت سے تو یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ سب کا خیال رکھے لیکن اس کی اپنی بھی خواہشیں ہیں یا ہوسکتی ہیں اس سلسلے میں کسی کا دھیان نہیں جاتا۔ محسن خان کے اس افسانے میں ایک عورت نیند کے غلبے کو صرف اس لیے ختم کرنا چاہتی ہے کہ دیر سے آنے والا اس کا شوہر اسے سوتا ہوا دیکھ کر ناراض نہ ہوجائے۔ اسے شوہر کی خوشیوں کا خیال رکھنے کے لیے اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے اور تیز نمک کی چائے پی کر نیند کو خیر باد کہنا پڑتا ہے۔ لیکن نیند کی اس کیفیت سے تو کبھی کبھی واسطہ پڑتا ہے۔ اکثر تو یہی ہوتا ہے کہ ویران اور اداس آنکھوں میں دور دور تک نیند کا کہیں شائبہ تک نہیں ہوتا۔ آنکھوں سے نیند کی رخصتی کا کرب ایک ایسا کرب ہے جو بیشتر عورتوں کا مقدر بن چکا ہے۔

☐ اسرار گاندھی کا افسانہ 'نالی میں اگے پودے' موجودہ عہد کی مصنوعی زندگی کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس عہد میں سانس لینے والا ہر انسان دوہری زندگی جینے پر مجبور ہے۔ وہ اندر سے کچھ اور ہوتا ہے لیکن چاہتا یہ ہے کہ سماج میں اس کی نیک نامی کا بھرم کسی طرح قائم رہے۔ چونکہ عزت کا اسے خاص خیال رہتا ہے اس لیے بظاہر وہ ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتا جو اس کے وقار میں زوال کا باعث ہو۔ لیکن فطری خواہشوں کا دباؤ بھی اس پر ہے۔ لہٰذا اپنی تسکین کے لیے وہ بہت خاموشی کے ساتھ نت نئے حربوں کا استعمال کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ اسرار گاندھی نے اسی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے کالج کیمپس میں کہانی کا تانہ بانہ تیار کیا ہے۔ قصے کا راوی کچھ زیادہ ہی حساس ہے۔ وہ کالج اسٹاف کے غیر سنجیدہ رویوں سے اکثر نالاں رہتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ کالج میں پڑھنے پڑھانے کا آئیڈیل ماحول پیدا ہوتا کہ اسٹوڈینٹس کو اپنا کیریئر بنانے میں خاطر خواہ مدد مل سکے۔ وہ اصول کے معاملے میں بہت سخت ہے اور غیر سنجیدہ اسٹوڈنٹس کے ساتھ کسی بھی طرح کی ہمدردی کو جائز نہیں سمجھتا۔ وہ اپنی کلیگ ذکیہ کو بہت احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے کیونکہ وہ ڈھیرے سارے اسٹوڈنٹس کو اپنے گھر پر مفت ٹیوشن پڑھاتی ہے۔ لیکن راوی کو جب اس بات کی آگاہی ہوتی ہے کہ اس پڑھائی کے پیچھے جنسی خواہشات کی تکمیل کی جاتی ہے تو اسے بہت صدمہ ہوتا ہے۔ دل کے کسی گوشے میں کوئی چیز ٹوٹ جاتی ہے۔ ذہن میں ایک ساتھ ہزاروں سوالات سر اٹھانے لگتے ہیں۔ اس عہد میں حساس ہونے کا خمیازہ تو بہر حال بھگتنا ہی پڑتا ہے۔

☐ انجم عثمانی نے اپنے افسانہ ''شہر گریہ کا مکیں'' میں اس ذہنیت کا نوحہ قلم بند کیا ہے جس کے تحت ہماری اپنی مٹی ہمارے لیے اجنبی ہوجاتی ہے۔ جس کے تحت ہم اپنی ہی جڑوں سے کٹنے لگتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ اپنے وجود سے اتنے لاتعلق ہوجاتے ہیں کہ خود اپنا چہرہ بھی ہمیں اپنا نہیں لگتا۔ اپنے سائے پر غیر کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ماضی کی یادیں جو زندگی کا بیش قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں، رفتہ رفتہ دھندلی پڑنے لگتی ہیں اور ذہن منتشر خیالوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ زندگی میں عجیب سی بے کیفی شامل ہوجاتی ہے اور گزرتے لمحوں کے دوران ٹوٹنے اور بکھرنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ یہ بکھراؤ اچانک وجود میں نہیں آتا۔ کئی چیزیں اس انتشار میں شامل رہتی ہیں۔ ایک اہم وجہ یہ ہے کہ زندگی کا پورا منظر نامہ سرے سے ہی تبدیل ہوگیا ہے۔ حسیت کے

تمام تر پیمانے تبدیل ہو گئے ہیں اور انہیں تبدیلیوں کا اثر ہے کہ ہماری اپنی زندگی خود ہمارے لیے اجنبی ہو گئی ہے۔ لیکن بے حسی کا یہ عالم ہے کہ زوال کی اس منزل پر ہم اپنے آپ سے مکالمہ بھی نہیں کر سکتے۔ انجم عثمانی نے اپنے افسانے میں ماحول کی چیرہ دستیوں کو شدت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ طویل عرصے کے بعد شہر سے اپنے قصبے، اپنے گھر لوٹنے والا کردار اپنے آس پاس کی تنہائی اور چہار جانب بکھری خاموشیوں کو دیکھ کر رفتارِ زمانہ کے متعلق بہت سنجیدگی سے غور کر رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ تیزی کے ساتھ تبدیل ہو گیا ہے۔ وہی گھر اور اس کی خاموشیاں جو کبھی اسے عزیز تھیں، آج اسے خوف میں مبتلا کر رہی ہیں۔ وہی تنہائی جو کبھی اس کے مزاج سے زیادہ میل کھاتی تھی آج اسے تڑپانے لگی ہے۔ ماحول بظاہر شانت دکھائی دیتا ہے لیکن بباطن گریہ وزاری کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ سسکیوں کی گھٹی گھٹی صدائیں سماعتوں سے ٹکرا رہی ہیں۔ ان سسکیوں کا تعلق ہماری اپنی آہوں سے بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان سسکیوں میں زمانے کا درد شامل ہو۔ ہر پل ماضی کی یادیں جو اس کے اضطراب میں مزید اضافہ کر رہی ہیں کہیں نہ کہیں اس کی بے بسی کا ماتم بھی کرتی ہیں۔ کسی کی موت کی اطلاع اس کے دل پر بجلی بن کر ٹوٹتی ہے اور اس کا وجود بری طرح اس کی زد میں آجاتا ہے۔ وہ اپنے حواس مجتمع کرنا چاہتا ہے لیکن اسے کامیابی نہیں ملتی۔ وہ چاہتا ہے کہ گھر کی تنہائیاں پھر سے اس کے وجود کا حصہ بن جائیں اور وہ کچھ دیر کے لیے گزرے ہوئے دنوں میں لوٹ جائے لیکن اس رویے پر وہ زندگی کو عجیب و غریب نظروں سے دیکھتا ہے اور پھر ماضی و حال کی سرحدیں ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گزر جاتی ہیں۔ ایجاز و اختصار کے سہارے اس افسانے میں بھی انجم عثمانی نے مخصوص کیفیت کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

□ حبیب کیفی کا افسانہ ''دھارا'' موجودہ عہد کے سنگین مسئلوں پر گفتگو کی فضا ہموار کرتا ہے۔ بے روزگاری اس عہد کا ایک سنگین مسئلہ ہے۔ اچھے خاصے باصلاحیت لوگ فرسٹریشن کا شکار ہو چکے ہیں اور مجبور ہو کر اپنے آپ کو ضائع کرنے کے راستے پر چل پڑتے ہیں۔ تکلیف اس وقت اور شدید ہو جاتی ہے جب نااہلوں کی جوڑ توڑ کے باعث انہیں سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے اور بے کیفی کی زندگی گزارتا ہوا باصلاحیت اور نوجوان طبقہ زندگی کے تئیں بے حد افسردہ اور غمگین ہو جاتا ہے۔ وہ اپنا غم غلط کرنے کے لیے شراب کا سہارا لیتا ہے اور اس نشے میں اپنے آپ کو غرق کر دیتا ہے۔ لیکن زندگی کے مصائب سے نجات حاصل کرنے کا یہ مستقل حل نہیں۔ جب نشہ اترتا ہے اور جذبات کی موجیں حقیقت کی چٹانوں سے دوبارہ ٹکراتی ہیں تو ذہنی کرب کا سلسلہ پھر سے شروع ہو جاتا ہے۔ نوجوانوں کا یہ طبقہ موجودہ مسائل پر کھل کر گفتگو کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ زندگی کے ان جھمیلوں سے چھٹکارا ملے اور ذہنی آسودگی میسر آئے۔ لیکن ان کی خواہش ذہن کے ہی کسی گوشے میں دم توڑ دیتی ہے۔ ان مسائل کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ بھارتیہ کرن کی مہم ضبط کی تمام تر حدوں کو عبور کر چکی ہے۔ حبیب کیفی نے اس حوالے سے بھی اہم باتوں کی نشان دہی کی ہے۔ بھارتیہ کرن کے چکر میں ملک کے بیشتر عوام کن مسائل سے دوچار ہیں، اس کا اندازہ کسی کو بھی نہیں

ہے۔ اقتدار پر قابض طبقہ اس طرح کے حربوں سے تمام تر حساس ذہنوں کو اپنے چنگل میں جکڑ لینا چاہتا ہے۔ عام انسان کی زندگی ان اذیتوں سے کس حد تک دوچار ہوتی ہے، اس کا اندازہ حساس ذہن آسانی سے کر سکتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ قومیت اور ترقی کے دھارے میں شمولیت ان کی اپنی شناخت پر اثر انداز ہوتی ہے اور دھارے سے الگ کٹ کر رہنا موجودہ عہد میں کسی بھی طرح ممکن نہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے نجات کی سبیل فی الوقت دکھائی نہیں دیتی۔ نتیجے کے طور پر ذہنی اذیتیں انتہا کو پہنچنے لگتی ہیں۔

□ م۔ق۔ خان کا افسانہ 'اَن کہی کہانی' میں مذہبی قدروں سے متعلق اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن ان کے انسلاکات عام انسان کی زندگی سے بھی قائم کیے جاسکتے ہیں۔ یہ انسلاکات حیرت انگیز ہیں۔ لیکن ایسا نہیں کہ انہیں نا قابل یقین کہا جائے۔ اس نوعیت کے واقعات عام طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں کہ بوڑھا باپ دشوار ترین زندگی بالکل تنہا گزارتا ہے۔ اس کے بیٹے اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ یہاں تک کی اس کی شریکِ حیات بھی راستے میں ہی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ م۔ق۔ خان کے اس افسانے میں دشرتھ کا المیہ آج کے بے سہارا بوڑھے کا المیہ ہے جو بھرے پُرے گھر کے باوجود اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ لیکن یہ تنہائی یوں ہی اس کا مقدر نہیں بن جاتی۔ ایک پورے عہد کی نفسیات اس کی ذمے دار ہوتی ہے۔ پرانی نسل، نئی نسل کے تعلق سے ڈھیر سارے توقعات تو وابستہ رکھتی ہے لیکن ان دونوں کے مابین فہم و ادراک کی جو وسیع کھائی ہے، اس کا پاٹا جانا بہت مشکل ہے۔ نئی نسل جہاں اپنے عہد کی روشنیوں سے زندگی کا نیا منظر نامہ ترتیب دینے میں مصروف رہتی ہے، وہیں پرانی نسل اپنے دکھوں سے لمحہ لمحہ ٹوٹ کر بکھرتی رہتی ہے۔ وہ تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے حالات کو دیکھ کر ششدر ہے۔ پرانی نسل اس کے اسباب کا پتہ لگانے سے قاصر ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بدلتے ہوئے معاشرے میں سب کچھ تبدیل ہوگیا ہے۔ نئی نسل کی ذہنی تربیت جس ماحول میں ہوئی ہے، اس کے پیش نظر ہمیں کوئی مثبت توقع بھی نہیں کرنی چاہیے۔

□ مشتاق احمد نوری کا افسانہ ''جن کی سواری'' ذہنی پیچیدگیوں کو فن کاری کے ساتھ اجاگر کرتا ہے۔ تخلیقی عمل کے دوران وہ تخیل کی وادیوں میں سیر کرنے کے بجائے عصری ناہمواریوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ عام زندگی میں رونما ہونے والے واقعات سے کہانی کا تانا بانا تیار کرنے کی روش بہت پرانی ہے جو کامیابی کی منزلوں سے تبھی ہم کنار ہو پاتی ہے جب عام سا واقعہ فکشن کے روپ میں ڈھل جائے۔ دراصل یہیں پہ افسانہ نگار کی مہارت پرکھی جاتی ہے۔ مشتاق احمد نوری نے عام زندگی میں رونما ہونے والے واقعے کو فن کاری کے ساتھ فکشن کا روپ دیا ہے۔ ''جن کی سواری'' سیدھے سادھے انداز میں زندگی کے ایک اہم مسئلے کو بیان کرتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں بھوت پریت اور جن کے متعلق لوگوں کا عقیدہ بہت پختہ ہوتا ہے۔ گاؤں کے سیدھے سادھے لوگ ان باتوں پر بہت زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ لیکن اس افسانے میں کہانی کا مرکزی کردار یعنی راوی ان لوگوں سے مختلف رائے رکھتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ ان چیزوں میں صداقت کا قطعی دخل نہیں۔ وہ ان باتوں کو گورکھ دھندے سے تعبیر کرتا ہے۔

اس افسانے میں کہانی یوں بیان ہوئی ہے کہ گاؤں میں قمر آرا کے جن کی شہرت جب بہت زیادہ پھیل جاتی ہے تو لوگ اس کی صداقت پر ایمان لانے لگتے ہیں۔ اس لیے کہ ہر ہفتے جمعرات کے دن جب قمر آراء پر جن کی سواری آتی ہے تو ان کے آس پاس موجود ہر شخص کے متعلق وہ ایسی باتیں کہنے لگتی ہیں جس سے دنیا کسی بھی طرح واقف نہیں ہوتی۔ لیکن اسرار و رموز کی وہ باتیں صد فی صد درست ہوتی ہیں۔ ماں کے بہت اصرار کے باوجود اس افسانے کا مرکزی کردار قمر آراء کے پاس نہیں جاپاتا کیونکہ اسے ہر لمحہ یہ احساس ہوتا ہے کہ کہیں وہ جن اس کے اندر کی غلاظت اور خامیوں کو سب پر ظاہر نہ کردے۔ مشتاق احمد نوری نے اس کہانی کے ذریعے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر انسان کے اندر ایک چور چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ دنیا والے اسے دیکھ نہیں پاتے۔ لیکن جب کبھی وہ خود اپنا محاسبہ کرتا ہے تو اس کا اعتماد ڈگمگانے لگتا ہے۔ جن کی سواری علامت ہے انسان کے اس بنیادی احساس کی جس کے تحت وہ اپنے آپ کو ڈھیر ساری غلاظتوں میں الجھا ہوا پاتا ہے۔ حالانکہ باہر سے وہ بالکل صاف ستھرا دکھائی دیتا ہے اور ہر لمحہ اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ کسی کو بھی اس کے اندر کے انسان کا اندازہ نہ ہو۔

☐ قمر جہاں کا افسانہ ''انتظار'' سیاسی تنازعات کے مابین پستے ہوئے آدمی کی اذیت ناک کرب کو پیش کرتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے مابین ایک طویل عرصے سے جس طرح کی سرد جنگ جاری ہے، اس نے نہ جانے کتنے دلوں کو زخمی کیا ہے۔ ہم سرحدوں میں تقسیم تو ہو جاتے ہیں لیکن دل کا کیا کریں کہ کسی بھی طرح کا تقسیم گوارہ نہیں کرتا اور جذبات سے مغلوب ہو کر دل کی آواز پر ہر لمحہ لبیک کہنا چاہتا ہے۔ ہند پاک تنازعات کے تناظر میں ایک عام آدمی کی زندگی جس طرح تباہ و برباد ہو رہی ہے، اسی درد کو قمر جہاں نے اس افسانے میں اجاگر کیا ہے۔ ہند پاک تنازعات کے سبب شادی بھی روبرو انجام نہیں ہو پاتی اور ٹیلی فون سے ہی سارے مسئلے طے ہوتے ہیں۔ لڑکی شادی کے بعد اپنا گھر چھوڑ کر دور دیس میں چلی تو جاتی ہے لیکن میکے اور گھر والوں کی خوشگوار یادیں کسی بھی لمحے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں اور وہ چاہتی ہے کہ کسی بھی طرح گھر والوں کے درمیان رہے لیکن اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی۔ مرکزی کردار کی اذیت کو اس کہانی میں پیش کیا گیا ہے جو چاہ کر بھی اپنے بیمار باپ کو دیکھنے اپنے وطن نہیں جاپاتی ہے۔ ویزا اور پاسپورٹ کا مسئلہ حل نہ ہونے کے باعث اس کے جذبات کا خون ہو جاتا ہے اور وہ اپنے باپ کا آخری دیدار بھی نہیں کر پاتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے گھر والوں کے خطوط بھی جلانے پڑتے ہیں تاکہ سسرال والوں پر کسی بھی طرح کی کوئی مصیبت نہ آئے۔

☐ سلطان سبحانی کا افسانہ 'مجسموں کے شہر کا منظر نامہ' انسان کے متزلزل عقائد پر زبردست طنز ہے۔ علامتی انداز اختیار کرتے ہوئے سلطان سبحانی نے موجودہ عہد کا المیہ شدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس نازک دور میں جہاں زندگی ہر لمحہ نئے نئے چولے بدل رہی ہے، انسان بھی پل پل مکھوٹے تبدیل کرنے لگا ہے۔ اس عمل میں اس کی اپنی شناخت بھی کھو چکی ہے۔ اب وہ بے چہرگی کا شکار ہے۔ خود اپنے آپ کو پہچاننا بھی اس

کے لیے مشکل ہوگیا ہے۔ انسانوں کے جنگل میں حیران و پریشان وہ اپنے کو بڑی شدت کے ساتھ تلاش کررہا ہے۔ لیکن کوشش کے باوجود اسے مقصد میں کامیابی نہیں مل پارہی ہے۔ اس افسانے میں ایک سیاح اپنی زندگی میں رونما ہونے والے حیرت انگیز واقعات لوگوں کو سناتا ہے۔ ہم اسے انسان کی بے چہرگی کی داستان کہہ سکتے ہیں۔ ہم کب مرجاتے ہیں، ہمیں خود بھی احساس نہیں ہوتا۔ گھٹ گھٹ کر زندگی گزارتے ہوئے دراصل ہم کئی موت مرچکے ہوتے ہیں۔ لیکن کسی بھی لمحے اپنی زندگی یا موت کے متعلق ہمیں آگاہی نہیں ہو پاتی۔ دراصل آج کا انسان مجسمے میں تبدیل ہو چکا ہے جسے کبھی تو مہاتما بنا دیا جاتا ہے اور کبھی اسے در در کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ سلطان سبحانی کا افسانہ یہ واضح کرتا ہے کہ ہمارے آس پاس کی دنیا مجسموں کے شہر میں تبدیل ہوچکی ہے۔ جہاں بے حس زندگی جینے کے لیے ہر آدمی مجبور ہے۔ یہ مجسمے نا تو ظلم اور ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں نہ ہی آگے بڑھ کر مخالف ہواؤں کا رخ موڑنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ مجسموں کے شہر کا یہ منظرنامہ اب ہماری نگاہوں کے لیے بہت مانوس ہو چکا ہے۔

☐ عارف ایوبی کا افسانہ 'ھبوط' پستی کے سفر کو ایک چیلنج کے روپ میں قبول کرتا ہے۔ قدم قدم پر پیش آنے والے خطرات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے انسان اپنا سفر جاری رکھے تو مخالفت کی تیز آندھیوں کا سامنا کیا جاسکتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ جب قوتِ مزاحمت دم توڑنے لگتی ہے اور دل کے حوصلے رخصت ہوتے جاتے ہیں تو پھر تیز آندھیوں کا مقابلہ ناممکن جان پڑتا ہے اور وہیں سے زوال آمادہ سفر کی شروعات ہوجاتی ہے۔ سرخ آندھی کی تباہ کاریاں عروج پر پہنچنے لگتی ہیں، زرد سانپوں کا زہر رگ و پے میں سرایت کرنے لگتا ہے اور چہار سمت سے دریائی گھوڑوں کا حملہ شروع ہوجاتا ہے۔ بلائے ناگہانی کے قہر سے نجات کی کوئی سبیل نہیں ملتی اور ہر طرف موت کا سناٹا چھانے لگتا ہے۔ عارف ایوبی نے علامتی انداز میں زوال آمادہ سفر کی داستان لکھی ہے۔

☐ اقبال انصاری کا افسانہ ''بھرے ہاتھ'' بیوروکریسی کی ان دھاندھلیوں کا پردہ فاش کرتا ہے جو بالعموم عوام کی نگاہوں سے مخفی ہیں۔ سماج اور معاشرے میں جس طبقے کو عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، ان کی زندگی میں جھانکنے پر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر ذہنی طور پر قلاش ہے۔ اس طبقے کی شاہانہ زندگی کو دیکھ کر ہمیں ان کے تعلق سے بہت کچھ جاننے کی خواہش ہوتی ہے اور جب ہمیں کچھ جاننے کا موقع ملتا ہے تو زندگی کے عجیب وغریب رویے سامنے آتے ہیں۔ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ بیوروکریسی کی دھاندلے بازیاں عروج پر پہنچ چکی ہیں۔ ان کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مادیت پرستی اس قدر ہمارے مزاج میں شامل ہوگئی ہے کہ ہم اس کے سہارے زندگی کے تمام تر مرحلے طے کرنے لگے ہیں۔ اقبال انصاری کا یہ افسانہ واضح کرتا ہے کہ بیوروکریسی کے اس دور میں ہر افسر ایک دوسرے سے جنم جنمانتر کا بیر لینے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔ لوگ اس موقعے کی تلاش میں ہیں کہ کب باری آئے اور اپنی ہاری ہوئی بازی جیت لی جائے۔ ظاہر ہے بیوروکریسی کے اس سارے نظام میں براہِ راست تو کچھ بھی نہیں ہوتا لیکن اندر ہی اندر

ایک قسم کی سرد جنگ مسلسل جاری رہتی ہے۔ اقبال انصاری نے بہت اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور افسانے کے روپ میں ایک اہم موضوع کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ باہر سے افسروں کی شاہانہ ٹھاٹ باٹ دیکھ کر کوئی بھی رشک کرنے کے لیے مجبور ہوسکتا ہے لیکن اس ٹھاٹ باٹ کے لیے جس طرح کی سازشیں کی جاتی ہیں اس سے آگاہی کے بعد اس زندگی سے نفرت ہوجاتی ہے۔ بیوروکریسی کی دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں انسان کو ہر لمحہ چست اور مستعد رہنا پڑتا ہے۔ کسی بھی لمحے اسکی غفلت اسے تباہی کے دہانے پر پہنچا دیتی ہے۔ یہ افسانہ سلسلے وار طریقے سے آگے بڑھتا ہے اور اس کا کلائمیکس بطورِ خاص متاثر کرتا ہے۔ انسان اپنے کو زیادہ ہوشیار سمجھتا ہے لیکن یہ بھول جاتا ہے کہ کوئی اس سے بھی زیادہ ہوشیار ہے یا ہوسکتا ہے اور لمحاتی خامیوں کے سبب زندگی بھر اس کی اذیتوں میں اضافہ کرسکتا ہے۔ اس افسانے میں ہر قدم پر تحیر کی کیفیت برقرار رہتی ہے۔

❑ مشرف عالم ذوقی کا افسانہ 'فزکس، کیمسٹری، الجبرا' ہمیں چونکاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے بندھے ٹکے نقطۂ نظر اور رویے میں تبدیلی کے لیے اکساتا بھی ہے۔ ذوقی کو پڑھتے ہوئے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ دنیا بہت تیزی کے ساتھ تبدیل ہورہی ہے اور اس تیز رفتاری میں زندگی کی بنیادی قدریں ہر لمحہ مسخ ہوتی جارہی ہیں۔ بلکہ ہم خود اسے بے دردی کے ساتھ روندتے ہوئے آگے بڑھتے جارہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ زمانے کے ساتھ ساتھ دوڑنے بھاگنے کا یہ عمل ہماری اپنی شناخت کے لیے کس قدر نقصان دہ ہے؟ یا پھر اگر ہم اسے وقت کی اہم ضرورت سے تعبیر کریں تو یہ رفتار ہمارے لیے کس طرح مناسب ہے؟ ذوقی نے اپنے افسانے کے ذریعے ہمیں بہت کچھ سوچنے اور غور کرنے کی ترغیب دی ہے۔ ایک بے حد نازک اور اہم موضوع پر افسانہ لکھنے کے دوران ذوقی کو خود بھی ذہنی اذیتوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ کوئی بھی واقعہ خواہ کتنا ہی سنگین اور دلدوز کیوں نہ ہو، اگر اس کے بیان میں افسانہ نگار تخلیقیت کے عناصر شامل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا ہے تو ہمارا ذہن کسی بھی طرح کا تاثر قبول کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ دنیا میں روزانہ ایک سے بڑھ کر ایک دہشت ناک واقعات رونما ہوتے ہیں لیکن وہ واقعات ہمارے ذہنوں کو جھنجھوڑتے نہیں۔ تاثر کی اس کیفیت سے آشنا نہیں کراپاتے جو طویل عرصے تک ذہن سے محو نہیں ہوتے۔ ہاں اگر وہ واقعہ تخلیق کار کی گرفت میں آکر فن بن جاتا ہے تو پھر اس کا تاثر دیر تک قائم رہتا ہے۔ ذوقی نے اس افسانے میں پیش کش کی سطح پر جذبات کی جس شدت کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی بنا پر عام سا ردِ عمل تخلیقیت کے دائرے میں آجاتا ہے اور پھر ہمیں زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر از سرِ نو غور و فکر کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ ایک باپ زندگی کے ہر قدم پر اپنی لختِ جگر کو بیٹی اور صرف بیٹی کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جب بیٹی کے اندر ایک جوان لڑکی کا جسم داخل ہونے لگتا ہے تو اس کی آنکھوں سے نیند اڑنے لگتی ہے۔ وہی بیٹی جسے اپنی گود میں بٹھا کر وہ گھنٹوں دیکھا کرتا تھا اب اسی بیٹی کو آنکھ بھر کر دیکھنے کی ہمت اس میں نہیں ہے۔ اپنی بیٹی کے لیے خود اس کا وجود اجنبی معلوم ہونے لگتا ہے۔ وہ بیٹی جو بڑی امنگوں کے ساتھ

باپ کی بانہوں میں جھولا کرتی تھی، اسی بیٹی کو چھونے میں اب اسے خوف کا احساس ہوتا ہے۔ جس بیٹی کو بڑے شوق سے اپنے ہاتھوں سے نہلایا کرتا تھا اب اس کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی اس میں نہیں۔ کتنا مجبور ہے وہ باپ — ہر پل ایک عجیب سا خوف ذہن پر حاوی رہتا ہے۔ اب کیا ہوگا؟ بیٹی، جو ایک جوان لڑکی کے روپ میں تبدیل ہو چکی ہے، وہ ہر لمحہ ایک مجبور باپ کے لیے نت نئی پریشانیاں کھڑی کرنے لگتی ہے اور زمانے کے اُتار چڑھاؤ سے اچھی طرح واقف لیکن بے بس اور لاچار باپ دن بدن خوف و دہشت میں مبتلا ہونے لگتا ہے۔ ایک لاچار باپ یہی چاہتا ہے کہ اس کی بیٹی ہمیشہ چھوٹی سی ننھی منی گڑیا کے روپ میں اس کی نظروں کے سامنے رہے لیکن جب اس کی بیٹی اچانک نوجوان لڑکی میں تبدیل ہونے لگتی ہے تو جیسے اسے دھچکا سا لگتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وقت تھم جائے اور گردشِ ایام پیچھے کی طرف لوٹنے لگے۔ لیکن وقت خاموشی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھتا ہے اور تھک ہار کر مجبور باپ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو تسلیم کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ حالات سے سمجھوتہ کرتا ہے اور پھر تلخ حقیقتوں سے نپٹنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے لگتا ہے۔ ذوقی نے اس افسانے میں لڑکی اور عورت کی حمایت میں پر زور آواز بلند کی ہے جو وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔

☐ نور الحسنین کا افسانہ ''پچھلے پہر کی خوشبو'' بڑے شہروں کی کھوکھلی زندگی کو ظاہر کرتا ہے، وہ شہر جس کی ظاہری چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ دراصل باطنی طور پر تنہائی، مایوسی اور اداسی کا منظر نامہ پیش کرتا ہے، یہ شہر کوئی مخصوص شہر نہیں، بلکہ اس کا اطلاق انسانوں کے جنگل والے ہر اس خطے سے ہے جہاں مصنوعیت نے اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ اس شہر میں متعدد ذہنی اذیتوں سے دوچار فرد، کوئی مخصوص فرد نہیں بلکہ اس عہد میں سانس لینے والا ہر آدمی اس کرب میں شامل ہے۔ اس شہری تہذیب میں سب کچھ مخصوص بے حسی میں تبدیل ہو چکا ہے۔

☐ ابواللیث جاوید کا افسانہ 'تیسری سمت کا سفر' انسان کی جدوجہد کو پیش کرتا ہے۔ اس افسانے میں فسادات کے چنگل سے نجات پانے کی طلب ہر قدم پر سر اٹھاتی ہے۔ انسان خواہ کتنا ہی شر پسند ہو وہ فسادات سے بہر حال اوب جاتا ہے اور اس کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ ذہنی اذیتوں سے نجات ملے اور امن و امان کا قیام ہو۔ تھوڑی دیر ستانا اور پھر اپنی سانسوں کو بحال کرنا انسان کی مجبوری ہوتی ہے لیکن اگر اسے سکون کے چند لمحے بھی میسر نہ آئیں تو اس کی زندگی عذاب میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس سکون کے لیے وہ ڈھیر سارے جتن کرتا ہے اور اپنے اندر سر ابھارنے والے شیطان کو تھوڑی دیر کے لیے مار ڈالتا ہے تاکہ امن کا ماحول پیدا ہو سکے اور اس کی زندگی فساد کے شعلوں سے محفوظ رہ سکے۔ ابواللیث جاوید نے اپنے افسانے میں اسی نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ اپنے مفاد کی خاطر ہی سہی فساد کے خلاف ایک بھرپور آواز کا بلند ہونا دراصل انسان اور انسانیت کی فتح کا اعلان کرتا ہے۔

☐ خورشید اکرم کا افسانہ ''قصہ ایک بے لطف شام کا'' بڑے شہروں کی پوش کالونیوں کا منظر نامہ پیش کرتا

ہے جس میں صاحبِ حیثیت لوگ رہتے ہیں۔ یہ اعلیٰ طبقے کے لوگ زندگی کا ہر پل ایک خاص نفاست اور سلیقے سے بسر کرتے ہیں۔ صبح سے لے کر دیر رات گئے اپنے بستر پر دراز ہونے تک کا تمام تر وقت ایک بندھے ٹکے روٹین کے تحت انجام پاتا ہے۔ ان کا کوئی بھی کام غیر ضروری نہیں ہوتا۔ وقت کے ایک ایک پل کا استعمال کرنا وہ بخوبی جانتے ہیں۔ ان کی زندگی ایک بندھے ٹکے دائرے میں ہی گردش کرتی ہے جس سے باہر جانے کی خواہش بھی نہیں ہوتی۔ نہ ہی کبھی اس طرح کا کوئی موقع ہاتھ آپاتا ہے۔ وہ اپنے آس پاس کی زندگی سے بھی واقف نہیں ہو پاتے اور اپنی ذات کے خول میں بند رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کالونی میں رہنے والے دوسرے لوگوں سے بھی ان کی شناسائی نہیں ہوتی۔ ایک ہی بلڈنگ میں الگ الگ فلور پر رہنے والے لوگ ایک دوسرے سے قطعی انجان ہوتے ہیں۔ یہ رویہ حیران کن تو ضرور ہے لیکن اس قسم کا اجنبی ماحول رفتہ رفتہ بہت عام ہوتا جارہا ہے۔ خورشید اکرم نے ایک ایسے ہی پوش کالونی کی زندگی پیش کی ہے جس میں رہنے والے اعلیٰ طبقے کے لوگ اپنی ذات کے خول میں بند ہیں اور ایک خاص نہج پر ان کی لوگوں کی زندگی مزے سے گزر رہی ہے۔ لیکن اچانک ایک چھوٹا سا واقعہ رونما ہوتا ہے اور کالونی کی نسبتاً خاموش فضا میں ہلچل سی مچ جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض تکنیکی وجوہات کے سبب کالونی کی بجلی اچانک چلی جاتی ہے اور اتفاق سے کئی گھنٹے غائب رہتی ہے۔ کالونی میں رہنے والے لوگ جو اپنے گھروں سے کبھی نکلتے ہی نہ تھے، اپنے اپنے گھروں سے باہر آتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے لوگ ادھر اُدھر بیٹھے ہوئے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اچانک بجلی چلی جانے سے ان کی زندگی جیسے تھم سی جاتی ہے اور وہ مجبوراً اپنے گھروں سے نکل کر کالونی کے احاطے میں وقت گزاری کے لیے جمع ہونے لگتے ہیں۔ برسوں سے کالونی میں رہتے ہوئے جن لوگوں نے کبھی ایک دوسرے سے کوئی ربط ضبط نہیں رکھا تھا وہ مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہنسی مذاق کا سلسلہ چل پڑتا ہے، حالات حاضرہ پر کھل کر تبصرے ہوتے ہیں۔ بچے ہری ہری گھاس پر اچھلنے کودنے لگتے ہیں۔ ان کی مائیں بے فکری سے انہیں ہنستا کھیلتا چھوڑ کر دیگر عورتوں کے ساتھ اپنی مخصوص گفتگو میں شریک ہو جاتی ہیں۔ یہ نظارہ کالونی کے لیے نیا ہے کیونکہ سبھی لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر ہیں اور خوش گپیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ کئی گھنٹے کے بعد اچانک جب بجلی دوبارہ آجاتی ہے تو ٹولیوں میں بکھرے ہوئے لوگ پھر اپنی ذات کے خول میں بند ہو جاتے ہیں اور کچھ دیر بعد ہی کالونی کی زندگی اپنے معمول پر لوٹ آتی ہے، جہاں مکمل خاموشی ہے اور کالونی کا ہر شخص ایک بار پھر اپنی مخصوص روٹین کے سہارے سانس لے رہا ہے۔ خورشید اکرم نے موجودہ زندگی کا ایک ایسا منظر نامہ پیش کیا ہے جو ہمارا مقدر بن چکا ہے۔ زندگی جو ایک دوسرے کے دکھ میں شریک ہونے کا نام ہے، پوش کالونیوں میں قدرے مختلف دکھائی دیتی ہے۔ بدلتے ہوئے عہد میں تیزی کے ساتھ زندگی کے تبدیل ہوتے ہوئے رویے پر ہمیں حیرت تو ہوتی ہے لیکن اسے موجودہ عہد کا المیہ کہہ کر نظر انداز کرنے میں ہی عافیت ہے کیونکہ ہم چاہیں بھی تو زندگی پر حاوی ہو رہی اس مصنوعیت کو ختم نہیں کر سکتے۔

❑ دیپک بدکی کا افسانہ ''مانگے کا اجالا'' جنسی نا آسودگی کا ایک ایسا منظرنامہ پیش کرتا ہے جو غیر فطری تو نہیں، لیکن جس کا ردعمل ہمیں بہرحال چونکاتا ہے۔ شادی کے بعد بھی بہت سی عورتوں کے لیے جنسی خواہشات کی بھرپور طریقے سے تکمیل نہیں ہو پاتی۔ وہ جسمانی طور پر جتنی مضبوط ہوتی ہیں اور ان کے اندر جنسی خواہشات جس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہیں، اس کی تکمیل نہ ہونے پر وہ اخلاقی ضابطوں کو بالائے طاق رکھ کر دوسرے مردوں کی بانہوں میں پناہ لینے کے لیے مجبور ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہوتا۔ بنیادی طور پر ایک تو انہیں جنسی تسکین کی طلب ہوتی ہے، دوسرے وہ یہی چاہتی ہیں کہ وہ کسی خوبصورت بچے کو جنم دیں۔ یہ خواہش اس وقت مزید شدت اختیار کر لیتی ہے جب ان کا شوہر کسی اعتبار سے پرکشش نہیں ہوتا۔ وہ دنیاوی آسائشیں تو مہیا کر سکتا ہے، لیکن انہیں ایک خوبصورت بچہ نہیں دے سکتا، نتیجے کے طور پر اس قسم کا مزاج رکھنے والی عورتیں بہت آسانی کے ساتھ کسی جاذب نظر شخصیت کا انتخاب کر لیتی ہیں۔ دیپک بدکی نے اس افسانے میں ایک ایسی ہی عورت کی زندگی پیش کی ہے جو شادی کے بعد جنسی تسکین کی آگ میں جھلستی ہے اور بالآخر اپنی تسکین کے لیے ایک مرد سے رشتہ قائم کر لیتی ہے۔ جنسی تسکین کے ساتھ ہی ساتھ اسے اس بات کی بھی شدید خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایک خوبصورت سے بچے کو جنم دے۔ میناکشی جو کیرل کی رہنے والی ہے اور پیشے سے نرس ہے، اسے اپنے مقصد میں کامیابی بھی ملتی ہے اور پھر وہ اپنے مہربان سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتی ہے۔ بعد میں مہربان کو جب یہ علم ہوتا ہے کہ میناکشی نے ایک خوبصورت بچے کو جنم دیا، لیکن اس بچے کو اس نے اپنی ماں کے پاس کیرل میں چھوڑ دیا ہے اور اپنے شوہر کے ساتھ گلف میں نئے سرے سے خوشی خوشی زندگی گزار رہی ہے تو اسے بہت پریشانی ہوتی ہے، کیونکہ میناکشی نے صرف اس خواہش کی بنا پر اس سے جنسی تعلقات قائم کیے تھے کہ اس کی خوبصورت نشانی کو وہ ہمیشہ دل سے لگا کر رکھے گی۔ اس کہانی کے اختتام پر قاری بھی شش و پنج میں پڑ جاتا ہے کیونکہ میناکشی کی شخصیت واضح نہیں ہو پاتی اور آخر میں مہربان کو جس ذہنی اذیتوں سے دوچار دکھایا جاتا ہے، اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

❑ شاہد اختر کا افسانہ 'دو پاؤں کا گھوڑا' انسانی حسیت کی اس بدعت کو بے نقاب کرتا ہے جو صدیوں سے مہذب سماج اور معاشرے کو گھن کی طرح کھوکھلا کر رہا ہے۔ فطرت کے اصولوں کو مسخ کرنے کے دوران ہم کبھی یہ نہیں سوچتے کہ اس کے اثرات کتنے مضر ہوں گے۔ امرد پرستی کی لعنت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ شاہد اختر نے اپنے افسانے میں اسی لعنت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لعنت کی بنا پر وہ زندگی جو معصوم ہے اور ہر قدم پر محبت کی طلب گار ہے، اسے ذہنی اذیتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ادھر ان کے افسانوں میں جنس کا غلبہ کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ سیکس زندگی کا ایک اہم جز ہے لیکن ہماری تمام کاوشیں صرف اور صرف سیکس سے ہی متعلق ہوں تو یہ رویہ بھی مناسب جان نہیں پڑتا۔ زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی ہماری نگاہ ہونی چاہیے۔ کیونکہ متعدد مسائل سے چشم پوشی ہماری ذہنی

استعداد کو سوالات کے کٹگھرے میں کھڑے کرنے کے لیے کافی ہے۔ جنس کے تعلق سے بہت کچھ لکھا گیا اور اب بھی لکھا جارہا ہے۔ لیکن انہیں تحریروں کو اعتبار کا درجہ حاصل ہوا ہے جن میں سیکس کے پس پردہ سماج اور معاشرے کے دوسرے مسائل بھی فنکاری کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اپنے تخلیقی سفر کے دوران شاہد اختر اس بنیادی پہلو کو ذہین نشیں رکھتے ہیں تو امید کی جانی چاہیے کہ ان کے افسانوں میں تہہ داری کی کیفیت بھی پیدا ہو جائے گی۔

☐ غزال ضیغم کا افسانہ ''فیڈ آؤٹ فیڈ آن'' زندگی کے اتار چڑھاؤ کا محاسبہ کرتا ہے۔ انہیں عورت کی ناآسودہ زندگی بہت شدت کے ساتھ جھنجھوڑتی ہے اور وہ اس کے اسباب کی تلاش میں بے چین ہو جاتی ہیں۔ سماج اور معاشرے کے غیر منصفانہ رویے پر وہ کھل کر چوٹ کرتی ہیں۔ انہیں مرد کی اولیت ایک آنکھ نہیں بھاتی اور وہ چاہتی ہیں کہ سماج میں عورت کو کسی بھی طرح اس کا جائز مقام ملے۔ اسے محض تعیش کی شئے سمجھ کر نظرانداز نہ کیا جائے۔ ہر قدم پر عورت ہی قربانیاں کیوں دیتی رہے؟ کیا اس کے اپنے جذبات و احساسات کوئی معنی نہیں رکھتے؟ غزال ضیغم کو اس بات کی سخت شکایت ہے کہ تمام تر دشواریوں سے صرف عورت ہی کیوں دوچار ہوتی ہے؟ اس کی اپنی زندگی کیا کچھ اہمیت نہیں رکھتی؟ اس کے اپنے خواب کیا کوئی مول نہیں رکھتے؟ اس جیسے اور بھی بہت سے سوالات غزال ضیغم کے اس افسانے میں سر اٹھاتے ہیں جس میں انہوں نے عورت کی جنسی ناآسودگی کا بیان بہت شدت کے ساتھ کیا ہے۔ ایک لڑکی ہزار سپنے آنکھوں میں سجاتی ہے اور آنے والی زندگی کے لیے ڈھیر سارے جتن کرتی ہے۔ لیکن اچانک اس کی زندگی میں سب کچھ ٹوٹ سا جاتا ہے۔ شادی کے بعد اس کی زندگی ایک شدید پیاس کے صحرا میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسے اپنے شوہر سے جسمانی آسودگی اور سکون کی دولت میسر نہیں آتی اور وہ مستقل بدن کی آگ میں جلتی رہتی ہے۔ جاڑے کی سرد راتوں میں اٹھ اٹھ کر نہاتی ہے کہ بدن کی آگ کو بجھانے کی کوئی دوسری سبیل دکھائی نہیں دیتی۔ اسے اپنے نئے گھر میں زندگی کی تمام تر آسائشیں میسر ہیں لیکن وہ جسمانی سکون کی دولت سے محروم ہے۔ مجبوراً وہ اپنی زندگی کو ایک دوسرے رخ پر موڑنے کا فیصلہ کرتی ہے اور یہاں ایک ساتھی اس کی خاموش زندگی میں چپکے سے خوشیوں کی نوید لے کر آتا ہے۔ اب اس کی زندگی طمانیت کے جذبوں سے سرشار ہو جاتی ہے لیکن اس سکھ کو پانے کے لیے اسے ان گنت مصیبتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ موجودہ عہد کا یہ ایک سنگین مسئلہ ہے جس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس پہلو پر بھی غور کیا جانا چاہیے کہ اظہار خیال کی سطح پر جذبات کی ایسی شدت کہاں تک مناسب ہے!

☐ احمد صغیر کا افسانہ 'انا کو آنے دو' نکسلائٹ موومنٹ سے متعلق ہے۔ اس نوعیت کی رسہ کشی مسائل کا مثبت حل پیش نہیں کرتی اور قتل و خون کا بازار مزید گرم ہو جاتا ہے۔ نکسلائٹ موومنٹ اب ہماری زندگی کا ایک بڑا ناسور بن چکا ہے۔ خصوصاً بہار کے کئی علاقے اس کی چپیٹ میں بری طرح آگئے۔ جان کی کوئی قیمت نہیں رہ گئی ہے۔ خون کی ہولی سرِ عام کھیلی جارہی ہے۔ قتلِ عام کا تیوہار بڑے جوش و خروش کے ساتھ منایا جارہا

ہے۔نفرت اور بدلے کی آگ میں جلتا ہوا سماج اور معاشرہ دوزخ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے یہ مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہونے والا بھی نہیں۔ جب پورا سماج پورا معاشرہ ہی زہر آلودہ ہو گیا ہو تو اس میں اصلاح کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔ کسی ایک آدمی کے اٹھ کھڑے ہونے سے سب کچھ تو نہیں بدل جاتا۔ البتہ اس بات کی امید بڑھتی ہے کہ ظلم کا ننگا رقص اب زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہے گا۔ احمد صغیر نے انا کو بہتر مستقبل کا اشاریہ بنا کر پیش کیا ہے جس کی آمد تڑپتی اور کراہتی انسانیت کو تمام تر دکھوں سے نجات دلائے گی۔ یہ 'انا' کوئی ایک فرد نہیں بلکہ بیشتر دلوں میں احتجاج اور بغاوت کے جو شعلے روشن ہیں، انہیں شعلوں سے ایک نہیں بلکہ ہزاروں انا جنم لیں گے اور تبھی ظلم کی آندھیوں سے نجات ملے گی۔

☐ اختر الاسلام کا افسانہ ''ایک فرشتے کا جنم'' زمانے کی تیز رفتاری کے تحت سماج اور معاشرے میں پھیل رہی بدعنوانیوں کو واضح کرتا ہے۔ کل تک جو بھی بعید از قیاس معلوم ہوتا تھا، آج جیتی جاگتی سچائی کے روپ میں ہمارے سامنے موجود ہے، ایک عورت کا دوسری عورت کے ساتھ جنسی تعلق تو بہت پہلے سے ہی ڈھکے چھپے جاری رہا ہے، لیکن معاملہ صرف جنسی تسکین تک محدود ہوا کرتا تھا۔ آج کی سائنس نے یہ انکشاف کر کے ہمیں حیرت میں مبتلا کر دیا ہے کہ ایک عورت کا دوسری عورت کے ساتھ مباشرت بھی افزائش نسل کا سبب ہو سکتا ہے۔ بظاہر اس بات کو ذہن قبول نہیں کر پاتا، لیکن اگر ہم جنسی عمل کی جزئیات پر غور کریں تو یہ بات تسلیم کرنے کے لیے ہمیں مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اگر کوئی عورت، کسی مرد کے ساتھ مباشرت کے بعد نہائے بغیر پھر کسی عورت کے ساتھ جنسی تعلق قائم کر لے تو اس دوسری عورت کی کوکھ ہری ہونے کی پوری گنجائش رہتی ہے۔ اختر الاسلام نے اپنے افسانے میں اسی تصور کو پیش کیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار عیاش پسند واقع ہوا ہے۔ وہ نہیں چاہتا ہے کہ شادی کے جھمیلوں میں پڑ کر اس کی اپنی آزادی کو کسی طرح کا خطرہ لاحق ہو۔ لہٰذا وہ اپنے دفاع کے لیے ایک مختلف حربہ استعمال کرتا ہے۔ وہ بیوی پر یہ راز منکشف کرتا ہے کہ وہ نامرد ہے اور اسے کسی طرح شادی شدہ زندگی کا سکھ فراہم نہیں کر سکتا، اس کی بیوی ناز، بدن کی آگ میں جلتی رہتی ہے۔ لیکن زبان پر کبھی حرف شکایت نہیں لاتی۔ شادی کو اچھا خاصہ وقت گزر جاتا ہے لیکن ناز کی زندگی اسی طرح سنسان اور اجاڑ رہتی ہے۔ جب کہ شوہر کی عیاشیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور ناز کسی قسم کا شک نہیں کر پاتی۔ اسی درمیان ناز کے پیٹ میں ابھار پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ گھر والے خوش ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سے بھی خوش خبری کی تصدیق ہو جاتی ہے، لیکن شوہر کے لیے یہ اطلاع بہت پریشان کن ہے۔ وہ ناز کو بدچلن ماننے کے لیے تیار بھی نہیں۔ خود ناز کے لیے یہ ایک سنگین مسئلہ بن جاتا ہے کہ آخر یہ سب ہوا کیسے؟ بہت سوچنے کے بعد اچانک اسے یاد آتا ہے کہ ایک دن اس کی پڑوسن نے سوتے میں اس کے ساتھ مباشرت کر لی تھی۔ یہ پڑوسن وہی تھی، جس کے جسمانی تعلقات ناز کے شوہر کے ساتھ بہت پرانے تھے اور اس دن وہ جنسی عمل سے فارغ ہونے کے بعد ہی ناز سے مباشرت کے لیے مجبور ہوئی تھی اور اس طرح غیر فطری انداز میں لاشعوری طور پر ناز، ماں بننے کی راہ پر گامزن ہو جاتی ہے۔ آج کے افسانے میں موجودہ

عہد اور زندگی کی تمام تر تبدیلیاں اور پیچیدگیاں دیکھنے کو مل رہی ہیں۔ اختر الاسلام کا یہ افسانہ اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

❑ محمود شیخ کا افسانہ ''ماگندیا'' اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ بعض اوقات الفاظ کی کائنات اس لامحدود حقیقت کو بیان کرنے سے قاصر رہتی ہے جو نگاہ دیکھتی ہے اور دل محسوس کرتا ہے۔ زندگی ہر لمحہ اتار چڑھاؤ سے دوچار ہوتی ہے۔ خواہشوں کے موسم آتے ہیں، گزر جاتے ہیں اور دل پر چھوڑ جاتے ہیں ان گنت با ، کے نقوش۔ یادیں جو میٹھی بھی ہیں اور ساتھ ساتھ ان میں سچائیوں کی کڑواہٹ بھی ہے۔ ان تلخ تجربوں کے سہارے زندگی کا سفر طے کرنے کے دوران انسان گھٹ گھٹ کر لمحوں میں تقسیم ہوتا ہے لیکن وہ یادیں کسی طرح اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ احساس کے آئینے میں گزرا ہوا ہر لمحہ تجسیم کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ کائنات کی ہر شے احساس کے اس آئینے میں دکھائی دیتی ہے اور اسی آئینے میں ریزہ ریزہ بکھرتا ہوا انسان اپنے آپ کو بھی دیکھ لیتا ہے۔ روح سے جسم اور جسم سے روح کا رشتہ ہمیشہ کی طرح ہمارے ذہنوں میں ڈھیر سارے پیچیدہ سوالوں کو جنم دیتا ہے اور اس کی وضاحت کے لیے ہم حیران و پریشان اپنے آپ سے الجھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ محمود شیخ کے اس افسانے میں ''ماگندیا'' کا ماضی جتنا کربناک ہے اس کا حال اتنا ہی عبرت ناک ہے۔ ہم اس کے درد کا اندازہ تو کرتے ہیں لیکن اس کی تلافی کے لیے چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ خود ہمارا اپنا وجود پتھر کا ہو چکا ہوتا ہے۔ ایک ایسے پتھر کا جو سب کچھ دیکھتا ہے، محسوس بھی کرتا ہے لیکن حالات کا رخ موڑنے میں کسی طرح کامیاب نہیں۔ خاموش تماشائی کی مانند وہ بے حس و حرکت اپنی ذات کے خول میں بند رہنے کے لیے مجبور ہے۔ صدیاں گزر جاتی ہیں لیکن تباہی اور انتشار کا سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔

❑ نفیس بانو کا افسانہ 'خالی کمان' محبت اور انتقام کے مشترکہ جذبے کو ظاہر کرتا ہے۔ محبت وہ جذبہ ہے جس میں بظاہر نفرت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ لیکن وہی محبت جب ناکام ہونے لگتی ہے اور سہانے خواب بکھرنے لگتے ہیں تو پھر چاہے جانے کی خواہش نفرت میں تبدیل ہونے لگتی ہے اور لاشعوری طور پر انتقام کا جذبہ پروان چڑھنے لگتا ہے۔ مضطرب دل کو اس وقت تک چین حاصل نہیں ہوتا جب تک انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں پڑتی اور جب انتقام کی آگ ٹھنڈی پڑتی ہے تو پھر چہار سمت شادابیاں بکھیرتا ہوا گلشن ویرانے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور وحشتوں کی سرگوشیاں تیز ہوتی چلی جاتی ہیں۔ نفیس بانو شمع نے بیک وقت محبت اور نفرت کی انہیں سرگوشیوں کو افسانے میں قید کرنے کی کوشش کی ہے۔ چودھری حسین کا کرب اس افسانے میں پوری طرح اجاگر ہوتا ہے جو اپنی کم سن بیوی شکوری سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ وہ اسے شادی شدہ زندگی کا سکھ تو نہیں دے پاتے لیکن ان کی خواہش ہے کہ شکوری کی گود کسی طرح بھر جائے اور اس کے لیے وہ اپنے ایک دوست کی مدد حاصل کرنے سے بھی نہیں ہچکتے۔ ان کی خواہش پوری ہوتی ہے۔ دو جڑواں بچیوں کی ولادت سے ان کا گھر آنگن منور ہو جاتا ہے۔ لیکن چودھری حسین کے لیے یہ بات قابل قبول نہیں

تھی کہ ان کی کمسن بیوی ان کے علاوہ کسی اور کو بھی چاہے۔ محبت کی تقسیم انہیں کسی بھی قیمت پر گوارا نہ تھی۔ لہٰذا حد سے گزر جانے میں بھی انہیں کوئی پس و پیش نہیں ہوئی اور بیوی کے ساتھ اپنے دوست کو انہوں نے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ لیکن زندگی بھر بیوی کی یادوں نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا اور وہ مرحومہ کے غم میں اندر ہی اندر گھلتے رہے۔ یہاں تک کہ انہیں خود ہی زندگی سے نجات مل گئی۔ نفیس بانو شمع کے اس افسانے کا اختتام واقعات کی بکھری ہوئی کڑیوں کو ایک تسلسل بخشتا ہے اور محبت کے ایک مختلف زاویے سے ہمیں روشناس کراتا ہے۔

❑ قمبر علی کا افسانہ 'بابا' انسان کے ڈھونگی مزاج کو ظاہر کرتا ہے۔ انسان قدم قدم پر نت نئے مسائل سے دوچار ہوتا ہے لیکن کسی طرح وہ تمام تر دشواریوں پر قابو پالیتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے پاس ایک ذہن ہے۔ سوچنے والا ایک دماغ ہے جو ہر لحہ نت نئی ترکیبوں پر غور کرتا ہے۔ نئے نئے منصوبے بناتا ہے اور بڑے سلیقے سے انہیں عملی جامہ پہنانے میں منہمک ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے ڈھونگی ذہن کے استعمال میں اتنی سنجیدگی اور مستعدی کا مظاہرہ کرتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ مذہب کے حوالے سے انسان کا ڈھونگی ذہن زیادہ تیزی سے کام کرتا ہے اور لوگوں کی اندھی عقیدت مندی کے باعث اس قسم کے ڈھونگ کرکے کرتا دھرتا اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ دراصل ہم نے مذہب کے بنیادی پہلوؤں کو فراموش کردیا ہے۔ جس کے سبب مذہب کی آڑ لے کر لوگوں کو بے وقوف بنانے والوں کا کاروبار بہت اچھی طرح پھل پھول رہا ہے۔ قمبر علی کا افسانہ انہیں کیفیات کو اجاگر کرتا ہے۔ جس سے سماج کے دو طبقوں کے ذہنی شعور کی بدولت زندگی کے عجیب و غریب رویوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ ایک رویہ تو وہ ہے جس میں مسائل سے نجات حاصل کرنے کی بیتابی عام دکھائی دیتی ہے۔ جب کہ دوسرے رویے کے پس پشت ایک عیار ذہن کام کررہا ہوتا ہے جو تمام تر خامیوں کے باوجود ایک ہمدرد دل بھی رکھتا ہے۔

❑ اظہار الاسلام کا افسانہ ''موہن دھیبر'' انسان اور انسانیت سے ہمدردی کے بنیادی جذبات کو ابھارتا ہے۔ کہانیاں لکھنے کے لیے کوئی خاص موضوع یا کسی بڑی شخصیت کا انتخاب ضروری نہیں ہے۔ ایک عام انسان کی زندگی بھی اسی طرح پیش کی جاسکتی ہے کہ اس میں ہمارے اپنے جذبات پوری طرح شریک ہوتے ہیں۔ ''موہن دھیبر'' کی کہانی ایک ایسے ہی عام انسان کی زندگی کے چند واقعات پر مبنی ہے جس نے راوی کے ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ موہن دھیبر جو ایک معمولی انسان ہے اور بچپن سے لے کر زندگی کے سفر میں طویل عرصے تک اس کے ساتھ شریک ہے۔ وہ ہر قدم پر اپنی معصومیت کا ثبوت دیتا ہے اور اپنی سادہ لوحی کے سبب پڑھنے والے کے ذہن پر ایک خاص تاثر نقش کرتا ہے۔ موہن دھیبر جو ہزار مصیبتیں جھیلتا ہے لیکن تقدیر کا شکوہ اس کے لبوں پر کبھی نہیں مچلتا۔ وہ کسی بھی حالت میں خوش رہنا چاہتا ہے اور دشواریاں جھیلتے ہوئے دوسروں کے لیے بھی خوشی کی سوغات تقسیم کرتا ہے۔ یہ معمولی انسان جو ہر لحہ دوسروں کے جذبات کا خیال رکھتا ہے، ہماری توجہ کا خاص طور پر مستحق ہے کیونکہ ہماری تخلیقات سے ایک

عام آدمی اب رفتہ رفتہ غائب ہوتا جارہا ہے۔

□ ناصر راہی کا افسانہ ''شبھ راتری'' فساد سے قبل کی صورت حال کو پیش کرتا ہے۔ کہانی کی ابتدا ایک مسلم نوجوان کے قتل سے ہوتی ہے۔ یہ قتل اس جگہ واقع ہوا جہاں ہندو اکثریت آباد ہے۔ قتل کے بعد بے چینی، خوف و ہراس اور غیر یقینی صورت حال کا پیدا ہونا فطرت کے عین موافق ہے۔ پارس جو کہ ایک معصوم شخص ہے بلا خوف وخطر مسلم آبادی میں چلا آتا ہے جہاں پہلے سے ہی انتقام کی جوالا دہک رہی ہے لیکن بروقت پولس کی آمد کی وجہ سے وہ قصاص کے شعلوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ یہ کہانی منافرت انگیز اندھیری راہوں میں ایک ننھی سی قندیل جلانے کی کوشش ہے۔ یہ اس انسانی سوچ کی کہانی ہے جو کسی دھرم یا مذہب کے لکشمن ریکھا میں قید نہیں ہے۔ ناصر راہی نے مذہبی بنیاد پر بھگوان اور خدا کی ذہنی تقسیم اور دھرم کی بنیاد پر منطقائی تفریق کے غلط تصور کو ختم کر کے اس انسانی سوچ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو نفرت کی گھنگھور گھٹا میں بھی روشنی جلاتی ہے۔ اس کہانی میں ''دھرم نگر اور ملت نگر'' دو متضاد تہذیبی، مذہبی اور ذہنی رویوں کے غماز ہیں اور انسانی سوچ کو تقسیم کرنے والی لکیریں بھی۔ پھر بھی یہ انسانی سوچ ساری لکیروں اور ریکھاؤں کو توڑ کر انسانیت کے ایک مضبوط سلسلے سے جڑ جاتی ہے اور حیوانیت کی فضا میں بھی انسانیت کی لو کو روشن کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مذہبی بنیاد پر تقسیم اور نفرت انگیزی کا عمل انتہائی شرم ناک ہے۔ اس کہانی میں ناصر راہی نے وحدتِ انسانیت کے تصور کو فکری محور بنایا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ ایک طرف قصاص کا جذبہ و جوش حاوی ہے تو دوسری طرف معافی اور ہمدردی کی روش۔ فرقہ وارانہ خطوط پر منقسم سوچوں اور فکروں کو ایک انسانی بعد سے روشناس کراتی ہے یہ کہانی۔ اسلوب اور اظہار بیان کے اعتبار سے بھی یہ کہانی ایک اچھی اور بہتر کہانی ہے۔

مشمولہ افسانوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ آج کا انسان نت نئے مسئلوں میں الجھا ہوا ہے۔ وہ ان مسائل سے نجات چاہتا ہے اور اس کے حصول کے لیے وہ طرح طرح کی آزمائشوں سے گزرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں رونما ہونے والے حادثات سے بے حد پریشان دکھائی دیتا ہے۔ سکونِ قلب کے لیے طرح طرح کے جتن کرتا ہے، لیکن اسے کامیابی نہیں ملتی۔

ان افسانوں میں یہ خیال بھی شدت کے ساتھ تڑپاتا ہے کہ ایک خاص منزل کے حصول میں ہم اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں کہ راستے کے اہم مقامات کے پیچھے چھوٹنے کا احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ آگے بہت آگے چلے جانے کے طویل وقفے کے بعد پیچھے چھوٹے ہوئے مقامات ہمیں بہت تڑپاتے ہیں اور پھر ہاتھ ملنے کے علاوہ کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا، کیونکہ وقت ریت کی طرح مٹھیوں سے سرکتا چلا جاتا ہے اور پھر شدید پچھتاوے کا احساس ہر لمحہ کچوکے لگاتا ہے۔ ان افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کے تقاضے اپنی جگہ اہم ہیں جسے اگر وقت پر نظر انداز کر دیا گیا تو پھر ڈھیر سارے مسائل ایک ساتھ سر ابھارنے لگتے ہیں۔

مشمولہ افسانے زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے میں مدد کرتے ہیں۔ زندگی میں جہاں خوشیاں حاصل ہوتی ہیں، وہیں غموں سے بھی انسان کا پالا پڑتا ہے۔ اتار چڑھاؤ، دھوپ چھاؤں، سکھ دکھ کا سلسلہ مسلسل جاری رہتا ہے، لیکن انسان کو چاہیے کہ وہ مسائل سے نہ گھبرائے اور خاموشی کے ساتھ منزل کے حصول میں لگا رہے۔ ان افسانوں کے مطالعے سے اس بات کی تحریک ملتی ہے۔ جب ذہن اور تصور کے سہانے خواب بکھر جاتے ہیں تو زندگی میں ہر طرف اندھیرا چھا جاتا ہے۔ زندگی اجاڑ ہو جاتی ہے، لیکن انسان چاہے تو وہ اپنی کوششوں سے زندگی کی اداس راہوں میں خوشیوں کے پھول بکھیر سکتا ہے۔ یہ افسانے ہمیں حوصلہ بخشتے ہیں اور زندگی کی جدوجہد میں سرگرم رہنے کے لیے اکساتے ہیں۔ ان افسانوں میں زندگی کے منفی رویوں کے خلاف بھرپور آواز بلند ہوتی ہے جو دراصل انسان اور انسانیت کی فتح کا اعلان ہے۔ سیاسی تنازعات کے مابین پستے ہوئے آدمی کی اذیت ناکیوں کا بیان آج کے افسانوں میں خاص طور پر جگہ پانے لگا ہے۔

پڑوسی ملکوں کے مابین ایک طویل عرصے سے جس طرح کی سرد جنگ جاری ہے، اس نے نہ جانے کتنے دلوں کو زخمی کیا ہے۔ ہم سرحدوں میں تقسیم تو ہو جاتے ہیں، لیکن دل کا کیا کریں گے کسی بھی طرح کی تقسیم گوارہ نہیں کرتا اور جذبات سے مغلوب ہو کر دل کی آواز پر ہر لمحہ لبیک کہنا چاہتا ہے۔ سیاسی تنازعات کے تناظر میں ایک عام آدمی کی زندگی جس طرح تباہ و برباد ہو رہی ہے، اس درد کو سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔ مجبوریوں کی یہ دلدوز کہانی کسی ایک فرد کی کہانی نہیں ہے، بلکہ ان بندشوں کے زیر اثر بے شمار جذبات لہو لہان ہو رہے ہیں۔

آج کے افسانوں میں رشتوں کے ڈور کو سنبھالنے کی کوشش ایک بار پھر دکھائی دینے لگی ہے۔ کیونکہ یہ ڈور اگر ٹوٹ گئی تو پھر کہانیوں میں کچھ بھی ایسا باقی نہیں رہے گا جس سے محسوسات کی دنیا میں ہلچل پیدا ہو سکے۔ مشمولہ افسانوں میں بھی رشتوں کے استحکام کا زاویہ حاوی دکھائی دیتا ہے جو کہ جذبات کی نازک ڈوری سے بندھا ہوتا ہے۔ ذرا سی ضرب پڑنے پر رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ مشمولہ افسانوں میں بھی ایسے ہی رشتوں کی بازیافت کی کوشش دکھائی دیتی ہے۔ محبت کی مضبوط بنیادوں پر رشتوں کی عمارتیں ٹکی ہوں تو انہیں جذبات کا لمحاتی طوفان کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ان افسانوں کے مطالعے سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

آج کا زمانہ تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے، لیکن اسی تیزی کے ساتھ تہذیبی قدروں کا زوال بھی ہوتا جا رہا ہے۔ یہ اس عہد کی تلخ سچائی ہے اور اس سے کسی طرح چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ ایک زمانہ تھا جب اخلاقی تربیت کے پیش نظر طوائفوں کو سماج میں خاص اہمیت حاصل تھی۔ زمانہ بدلا۔ نہ وہ قدریں رہیں، نہ وہ لوگ۔ لہٰذا وہ ذہنیت ہی تبدیل ہو گئی۔ آج سماج میں طوائفوں کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہذب معاشرے کو مدنظر رکھتے ہوئے اب ایسی عورتوں اور لڑکیوں نے اپنا چولا بدل لیا ہے اور قدرے مختلف روپ میں ہمارے سامنے آ گئی ہیں۔ سماج اور معاشرے

کے آسودہ نظام کے تحت یہ لڑکیاں اور عورتیں دوہری زندگی جینے پر مجبور ہیں۔ ظاہری طور پر معاشرے میں عزت کا مکھوٹا بھی انہیں حاصل ہوتا ہے، لیکن باطنی طور پر یہ اپنی تمام خواہشات کی تکمیل میں پوری طرح مستعد رہتی ہیں۔ عزت اور وقار کی زیادہ فکر کرنے والے معزز شہری خاموشی کے ساتھ نئے جسموں سے کھیلنے میں مصروف رہتے ہیں۔ جنسی بھوک مٹانے کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے اور ان کی عزت پر بھی کوئی آنچ نہیں آتی۔ نام نہاد معاشرے میں یہ کارِ خیر بڑی پابندی کے ساتھ انجام پا رہا ہے۔ زمانے کی تیز رفتاری نے ہمیں نت نئی خواہشوں کا اسیر تو بنا دیا ہے، لیکن اس کے حصول کے ذرائع مزید پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ ایسے میں ٹیڑھے میڑھے راستوں کے سہارے منزل تک پہنچنے کی جستجو نے نت نئے مسائل کو جنم دیا ہے جن سے ہم کبھی دوچار ہیں۔ موجودہ عہد میں لکھے جا رہے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے قبل ہمارے ذہن میں سماج اور معاشرے کے تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے یہ رویے بھی ضرور موجود ہونے چاہئیں، تاکہ اس تناظر میں ہم ہم عصر زندگی کا تجزیہ کر سکیں۔

طبقاتی کشمکش بھی آج کے افسانوں کا ایک اہم موضوع ہے۔ یہ مسئلہ دن بدن سنگین ہوتا جا رہا ہے، کیونکہ جداگانہ نہج پر زبردست ذہنی کشمکش شروع ہو چکی ہے۔ مشمولہ افسانوں میں بھی کرب کی زیریں لہریں اپنے وجود کا احساس کراتی ہیں۔ ان افسانوں میں انسان کے اس خوف کو بھی ظاہر کیا گیا ہے جس میں موت کی صدائیں چھپی ہوتی ہیں۔ یہ ہیبت ناک گونج دراصل انسان کے اندرونی خوف کی علامت ہے جو ازل سے ابد تک جاری رہتی ہے اور کسی بھی طرح اس گونج سے نجات حاصل نہیں ہوتی۔ بوسیدہ اور شکستہ عمارتوں میں آوازوں کا ارتعاش جس گونج کو جنم دیتا ہے اس کی نوعیت خارجی ہوتی ہے۔ یہ گونج متعدد سماعتوں سے ٹکرا سکتی ہے اور ذہنوں کو بے چین کر سکتی ہے، لیکن وہی گونج جب خارجی نہ رہ کر داخلی صداؤں میں تبدیل ہو جاتی ہے تو شکستگی ذات کا نوحہ ناقابلِ بیان ہو جاتا ہے۔ احساس کی بوسیدہ دیواروں سے بار بار ٹکرا کر پلٹنے والی صداؤں سے ایسی گونج وجود میں آتی ہے جس کی ہیبت ناکی سے دنیا واقف نہیں ہو پاتی۔ لیکن وہ گونج اس فرد کی اندرونی شکست و ریخت کو انتہا تک پہنچا دیتی ہے۔ مشمولہ افسانوں میں شکست ذات کا نوحہ بیان کرتے ہوئے اس گونج کی شدت کو واضح کیا گیا ہے جو کہیں نہ کہیں ہمارے اندر ہی ابھر رہی ہے اور ہر پل ہمیں خوف زدہ کرتی جا رہی ہے۔ ہم چاہ کر بھی اس کیفیت میں دنیا کو شریک نہیں کر سکتے۔ اپنے لوگوں کی ہمدردیاں ہمیں حاصل نہیں ہو پاتیں، کیونکہ اندرونِ ذات کی شکستگی سے فردِ واحد کے علاوہ کوئی بھی دوچار نہیں ہوتا۔ یہ فردِ واحد کوئی اور نہیں بلکہ خود ہمارا اپنا وجود ہے جو خوف و ہراس کے سائے میں زندگی بسر کر رہا ہے اور انجانے جزیرے کا سفر اس کا مقدر بنتا جا رہا ہے۔ مشمولہ افسانوں میں زندگی کی کہانیاں لکھتے ہوئے زندگی کی بنیادی حسیتوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے اور بیشتر افسانوں میں وہ کیفیت پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی گئی ہے جس کی گونج آئندہ بھی سنی جائے گی۔

ویسے تو ہم نے آزادی کے پچاس برس مکمل کر لئے، ملک میں بڑی دھوم دھام سے اس کا جشن منایا

گیا،لیکن کیا صحیح معنوں میں ہم آزاد ہو پائے؟ کیا آزادی کے جو مقاصد تھے ان میں ہمیں کامیابی ملی۔ جب ہم ان سوالوں کا جواب تلاش کرتے ہیں تو ہمیں بڑی مایوسی ہوتی ہے کیونکہ جس صورت حال سے ہم دوچار ہیں وہ کسی بھی طرح تشفی بخش نہیں کہی جاسکتیں۔ آج بھی عورت کی زندگی گھٹن سے بھری ہوئی ہے۔ صدیوں سے عورت کا استحصال ہوتا آرہا ہے۔ کبھی مذہب کے نام پر اس کی بلی دی جاتی ہے، تو کبھی سماج کے اندھے عقیدے اسے جیتے جی مار ڈالتے ہیں۔ اس کا درد بانٹنے والا کوئی بھی نہیں۔ اسے محرومیوں کی آگ میں خود ہی جلنا پڑتا ہے۔ دکھاوے کے لیے زمانہ اس سے جھوٹی ہمدردی کرتا ہے، لیکن عورت کو مسائل سے نجات دلانے کے لیے عملی طور پر کوئی پیش قدمی کے لیے تیار نہیں ہوتا ہے۔ جب کبھی بھی ایسا کوئی موقع آتا ہے، زمانہ اس کے زخموں پر مرہم لگانے کے بجائے اسے مزید تازہ کرنے میں پیش پیش ہوجاتا ہے۔ اس طرح عورت کی زندگی میں آنسوؤں کا سیلاب کبھی نہیں تھمتا اور یہ سیلاب ایک نہ ایک دن اس کے وجود کو غرقاب کرڈالتا ہے۔ آج کے افسانوں میں اس منظرنامے کی جھلک محسوس کی جاسکتی ہے۔ مشمولہ افسانے بھی اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہیں۔

آج دہشت گردی نے معصوم ذہنوں کے استحصال میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے اور اس طرح وہ لوگ جو زندگی کے مفہوم سے ابھی پوری طرح واقف بھی نہیں ہوئے تھے، موت کے سودائی بن بیٹھے ہیں۔ پورا معاشرہ اس کی زد میں آگیا ہے۔ دہشت گرد ایک لمحے کو بھی یہ نہیں سوچتے کہ اس آگ میں پوری انسانیت جل کر راکھ ہوجائے گی۔ آج کے افسانوں میں تیزی سے مسخ ہوتی ہوئی زندگی کی کریہہ تصویریں واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ من کی شانتی ہر لمحہ ہم سے دور ہوتی جارہی ہے۔ اس احساس کو بھی آج کے افسانوں میں بڑی شدت کے ساتھ پیش کیا جانے لگا ہے۔ من کی شانتی وہ دولت ہے جس کی تلاش میں موجودہ عہد سب سے زیادہ پریشان ہے۔ آج سائنس کی تیز رفتار زندگی میں انسان نے سب کچھ حاصل کرلیا ہے، لیکن اس مرحلے میں من کی شانتی سے وہ دن بہ دن دور ہوتا گیا اور آج سکون قلب کے لیے وہ مارا مارا پھر رہا ہے۔ من کی شانتی کے لیے وہ کسی بھی طرح کا حربہ استعمال کرنے سے باز نہیں آرہا ہے۔ لیکن ہزار کوششوں کے باوجود من کی شانتی اسے نہیں مل پارہی ہے۔ جب تک ہم اپنی خواہشات پر روک نہیں لگائیں گے، اسی طرح ذہنی اذیتوں کا شکار ہوتے رہیں گے۔ سکونِ قلب کی دولت سے ہم روز بروز محروم ہوتے جارہے ہیں اور ہر لمحہ زندگی، موت کے قریب ہوتی جارہی ہے۔ ان کیفیات کو آج کے افسانوں میں کامیابی کے ساتھ برتا جارہا ہے۔ زندگی کے بنیادی تقاضوں کو آج کے افسانوں میں جگہ ملنے لگی ہے۔ مشمولہ افسانوں میں بھی زندگی کے بنیادی تقاضوں کی پیش کش پر خاص توجہ دی گئی ہے جس کی بنا پر یہ افسانے ہمعصر زندگی کا حقیقی منظرنامہ پیش کرنے میں کامیاب ہیں۔

مشمولہ افسانوں کا مطالعہ کرنے کے دوران اندازہ ہوتا ہے کہ علامتی اور تجریدی رنگ جو گذشتہ دہائی تک اردو افسانے میں بہ طور خاص شامل تھا، رفتہ رفتہ اپنی کشش کھونے لگا ہے۔ آج کا فن کار اظہار خیال کی

سطح پر نسبتاً زیادہ آزاد رہنا چاہتا ہے۔ وہ شعوری یا لاشعوری طور پر کسی قسم کی بندشوں کا قائل نہیں اسے اس بات کی شدید فکر ہوتی ہے کہ ترسیل کی ناکامی کہیں خود اس کا المیہ نہ بن جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ قارئین بھی اسی کرب سے آشنا ہوسکیں، درد کی جس کیفیت سے وہ تخلیقی عمل کے دوران گزرا ہے۔ لہٰذا وہ اس بات کا خاص خیال رکھتا ہے کہ علامت اور تجریدیت کے غیر ضروری دام میں الجھ کر پڑھنے والے کہانی کی مرکزیت اور اس کی روح سے دور نہ ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا افسانہ تخلیق کار اور قاری کے درمیان افہام و تفہیم کی ایک فضا ہموار کر رہا ہے۔ ذہنی سفر کے دوران بامعنی ترسیل کا فریضہ انجام دے رہا ہے اور زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے میں ہماری مدد کر رہا ہے۔

مشمولہ افسانے بھی ایک خاص نہج پر ان مقاصد کی تکمیل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے بیزاری کا احساس نہیں ہوتا۔ تخلیق کار اپنے قارئین سے مکالمہ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ افسانہ نگاروں نے جو کچھ بھی محسوس کیا ہے مخصوص تخلیقی کرب سے گزرتے ہوئے ان محسوسات کو کاغذ پہ منتقل کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کیفیات سے، اسی شدت کے ساتھ قارئین بھی متاثر ہوں گے، ایسا میرا اندازہ ہے کیونکہ میں نے بھی ایک عام قاری کی حیثیت سے ان افسانوں کا مطالعہ کیا ہے اور پڑھنے کے دوران افسانہ نگاروں کی تخلیقی اور اضطرابی کیفیت کو قریب سے محسوس کرنے کی کوشش کی ہے۔ مشمولہ افسانوں کے حوالے سے مختصر تاثرات قلم بند کرنے کے دوران میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ قطعی غیر جانبدار ہوکر پڑھنے والوں کو اپنے محسوسات میں شریک کرتا چلوں، لیکن اس ضمن میں یہ اعتراف بھی ضروری ہے کہ بالکل غیر جانبدار ہوکر کوئی رائے پیش نہیں کی جاسکتی۔ شعوری یا لاشعوری طور پر کہیں نہ کہیں کوئی بات ہمیں نسبتاً زیادہ متاثر کرتی ہے، ساتھ ہی ساتھ کسی نہ کسی حوالے سے منفی تاثرات بھی ذہن پر قابض ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے اس پسندیدگی یا ناپسندیدگی میں ہماری اپنی اقداری ترجیحات شامل ہوتی ہیں اور انہیں اقداری ترجیحات کی بنا پر ہم اچھے برے معیار کا تعین کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ حد درجہ احتیاط کے باوجود افسانوں کا تجزیہ کرنے کے دوران اس تحریر میں میری اپنی اقداری ترجیحات بھی شامل ہوگئی ہوں۔ مثلاً بعض افسانوں کا تجزیہ میں نے تھوڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے، جب کہ بعض افسانوں کے لیے زیادہ کچھ نہیں لکھ پایا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان ضمنی باتوں کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جانی چاہیے۔ تخلیق کار کا بنیادی تعارف اس کا اپنا فن ہے جو کسی تجزیے کا محتاج نہیں۔ تخلیق میں اگر قوت ہے تو وہ اپنا پرستار خود پیدا کر لیتی ہے۔ کسی کے لکھنے یا نہ لکھنے سے معیار ادب کے تعین میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ادب کی تاریخ میں ایسی مثالیں بھری پڑی ہیں کہ نام نہاد نقادوں نے بعض فن کاروں کی تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے اور خاص مدت تک ان کی شہرت کا ڈنکا بجتا بھی رہا، لیکن آج انہیں کوئی نہیں جانتا اور بھولے سے بھی ہمعصر تنقید اور تذکرے میں ان کے حوالے نہیں آتے۔ جن لوگوں نے بھی اپنے تخلیقی سفر کے لیے بیساکھیوں کا سہارا لیا، ان کا یہی حشر ہوا، کیونکہ ایک خاص مدت کے بعد جب تنقید کا منظر نامہ

تبدیل ہوا تو ایسے تخلیق کار دیکھتے ہی دیکھتے حاشیے میں چلے گئے۔ ایسی بھی ڈھیر ساری مثالیں مل جائیں گی کہ بعض تخلیق کاروں کو ان کی اپنی زندگی میں کوئی وقعت حاصل نہیں ہوئی۔ جیتے جی انہیں کسی نے بھی آنکھ اٹھا کر دیکھنا تک گوارہ نہیں کیا، لیکن طویل خاموشی کے بعد از سر نو ان کی بازیافت ہوئی اور آج ان کے لیے ہمارے دلوں میں ایک خاص طرح کی عقیدت ہے۔ عزت اور احترام کا جذبہ شخصیت سے وابستہ تو ضرور ہوتا ہے، لیکن تخلیق کاروں کی تعظیم میں شخصیت سے زیادہ ان کی اپنی تحریروں کا دخل ہوتا ہے کیونکہ تخلیق کبھی مردہ نہیں ہوتی۔ جب تک لفظ باقی ہے، تخلیق زندہ رہے گی، اور جب تک تخلیق ہمارے ذہنوں میں زندہ رہے گی، تخلیق کار کی موت واقع نہیں ہو سکتی۔ سچا فن کار اپنی تحریروں کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں انمٹ نقوش چھوڑتا ہے۔ وقت گزرنے کے بعد بھی ان کی اہمیت باقی رہتی ہے۔ لہٰذا مشمولہ افسانوں کو بھی اسی حوالے سے پرکھا جانا چاہیے۔

مشمولہ افسانوں کا تجزیہ کرنے کے دوران میں نے اس بات کی حتی الامکان کوشش کی ہے کہ تنقیدی یا توصیفی جملوں کے بجائے افسانوں کی روح سے مختصر طور پر واقفیت ہو سکے، ایسا میں نے اس لیے بھی کیا ہے کہ اپنے تاثرات کو میں قارئین پہ تھوپنا نہیں چاہتا۔ اس ضمن میں قارئین کرام کو مکمل آزادی ہے کہ وہ براہ راست ان افسانوں کا مطالعہ کریں، اپنے طور پر نتیجہ اخذ کریں۔ اس سے تخلیق کار اور قارئین کے مابین براہ راست ایک ترسیلی رشتہ بھی پروان چڑھے گا جو تفہیم ادب کے لیے کارگر ثابت ہوگا۔ ہر قاری اپنی ذہنی استعداد کے مطابق کسی فن پارے سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ممکن ہے جو پہلو ہماری نگاہ میں زیادہ مستحسن ہو، کسی اور کے لیے وہ اتنا اہم نہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فن پارے کا مخصوص گوشہ جو ہمیں تاثرات کی مختلف کیفیتوں سے روشناس کرا رہا ہے، کسی دوسرے کے لیے کوئی اور ہی پہلو لطف اندوزی کا سبب ہو۔ متاثر ہونے کی منزلیں مختلف ہوتی ہیں، یا ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا تنقید کی بے جا مداخلت سے جتنا گریز کیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ کسی فن پارے کا براہ راست مطالعہ کرنے سے قبل اگر اس فن پارے سے متعلق تنقیدی تحریر ہماری نظروں سے گزر جائے تو پھر متن کی متعدد قرأت کے باوجود ہم اس فن پارے کو اپنے طور پر سمجھنے میں کامیاب نہیں ہوتے، کیونکہ پھر ہمارے ذہن میں جنم لینے والا تاثر، لاشعوری طور پر مستعار ہو جاتا ہے۔ اس روش کو ختم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ فن پارے کی تفہیم کے لیے ہم خود اپنے ذہن کا استعمال کر سکیں۔ تنقید کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ میں اس حقیقت کو فراموش یا نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا، لیکن تفہیم ادب کے سلسلے میں سنجیدگی کے ساتھ ہمیں اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے کہ تنقید پر زیادہ تکیہ کرنے کی بنا پر کہیں ہم تخلیق اور اس کے بنیادی متن سے دور تو نہیں ہوتے جا رہے ہیں۔ تخلیق اور اس کے بنیادی متن سے دور رہ کر ہم ادب کی تفہیم میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تنقید ہماری رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکتی ہے۔ لیکن ٹیڑھے میڑھے اور اوبڑ کھابڑ راستوں کی مسافت تو ہمارے قدموں کو ہی طے کرنی پڑے گی۔ سفر دشوار ہو سکتا ہے، نت نئی مصیبتیں بھی آ سکتی ہیں، لیکن کسی اور کی بیساکھیوں کے سہارے سفر

کرنے کے بجائے اگر ہم اپنے کمزور پاؤں کا استعمال کریں تو پھر کسی منزل پر پہنچنے کی خوشی دوبالا ہو جائے گی اور ہم اپنے بل بوتے کچھ حاصل کرنے کی طمانیت سے بھی دوچار ہوں گے۔ اگر براہ راست متن سے رغبت عام ہو جائے تو پھر ہمارے تاثرات میں مانگے کا اجالا شامل نہیں ہوگا، ہماری اپنی آواز دوسری آوازوں کے غلبے سے محفوظ رہے گی۔ میں نے کوئی تنقیدی مضمون نہیں لکھا ہے، بلکہ قارئین سے مکالمہ کی گنجائش نکالی ہے۔ میں نے اس بات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ مشمولہ افسانوں کا نچوڑ مختصر طور پر اس تجزیے میں شامل ہو جائے تا کہ موجودہ اردو افسانوں کے تناظر میں مشمولہ افسانوں کے حوالے سے بھی گفتگو کی فضا ہموار ہو سکے۔ حالانکہ بقول بعضے یہ تحریر بھی تنقید ہی کی ایک کوشش ہے۔

مشمولہ افسانوں کا مطالعہ کرنے کے دوران اندازہ ہوتا ہے کہ اردو افسانوں کے موضوعات تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں۔ عشق و محبت کے روایتی تصور سے آج کا افسانہ بہت دور نکل چکا ہے۔ سماجی ڈسکورس آج کے افسانوں پر پوری طرح غالب آچکا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تخلیق کاروں نے ہر لمحہ اپنی آنکھیں کھلی رکھی ہیں۔ ذرا سی آہٹ پہ وہ بیدار ہو گئے ہیں اور پھر مستعدی کے ساتھ اطراف و جوانب کے مناظر پر انہوں نے اپنی نگاہیں مرکوز کر دی ہیں۔ وقت اور حالات کی بے حسی کے سبب غنودگی کا شکار وہ بھی ہوئے ہیں، لیکن اس تساہل کے باوجود ہر قدم پر ان کا تخلیقی شعور بیدار رہا ہے اور تحریری طور پر اپنی بیداری کا ثبوت دینے میں انہوں نے کوئی کوتاہی نہیں برتی ہے۔ یہ بیداری محض ذہنی بیداری تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس عمل میں تخلیقی بیداری بھی شامل ہے کیونکہ محسوسات کے بیان کے لیے انہوں نے جس طرز کا استعمال کیا ہے وہ بھی افسانوں کے گذشتہ تخلیقی رویوں سے قدرے مختلف ہے۔ یعنی (۱) کہانی پن پر توجہ (۲) بیانیہ کی بحالی (۳) قاری سے جڑنا (۴) کردار سازی اور انسانی رشتوں پر از سر نو توجہ (۵) تہذیبی فضا/ مقامیت (۶) سماجی ڈسکورس (۷) اقداری ترجیحات کا احساس (۸) براہ راست بیانیہ لیکن فنکاری پر پوری توجہ وغیرہ۔ یہ طرز گذشتہ تخلیقی رویوں سے اس لیے بھی مختلف ہے کہ اس میں جدیدیت کے بعد کے زمانے کی دھڑکنیں شامل ہیں۔ آنے والے عہد کی آہٹیں ان افسانوں میں واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہیں۔ کل ملا کر تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی دنیا ہماری نظروں کے سامنے ہے جو اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ہمارے وجود کا حصہ بنتی جا رہی ہیں۔ اس تناظر میں مشمولہ افسانوں پر براہ راست گفتگو کے لیے قارئین کرام کو خود دلچسپی لینی چاہیے۔

باب

افسانہ

...**گلاسوں میں** تیز شراب انڈیلتے ہوئے جمشید نے ان لوگوں سے کاروباری باتیں شروع کیں۔

''جمشید بھائی! تم ہمارے کو یہ بولو کہ لندن آفس سے کیبل آ گیا یا نہیں۔'' سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی گھاسلیٹ والا نے جو ابھی ابھی بار آئے تھے ذرا غرا کر اسے مخاطب کیا۔

''ابھی نہیں آیا سیٹھ صاحب—'' جمشید نے بے پروائی سے جواب دیا اور غیر ملکی تاجر کی طرف مڑا— ''ہاں تو جارج میں تم کو کیا بتا رہا تھا؟ ہاں! میں نے لندن سے درخواستیں منگوائی تھیں۔ ایک مسٹر ایس۔ ڈی۔ جانسن کا میں نے مانچسٹر آفس میں تقرر کرلیا ہے۔ مسٹر جانسن نے اپنی درخواست میں لکھا ہے کہ وہ انڈین سول سروس میں عرصے تک کلکٹر اور کمشنر وغیرہ رہ چکے ہیں اور برصغیر سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ یقیناً وہ مانچسٹر برانچ کا کام اچھی طرح سنبھال لیں گے۔ میں اپنی غیر ملکی شاخوں میں ہمیشہ وہاں کے ایسے آدمی ملازم رکھتا ہوں جو برصغیر کے معاملات سے اجنبی نہ ہوں۔''

''اپن کے تپاس کا جواب دو جمشید بھائی!''— سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی نے دوسرا گلاس چڑھا کر یک لخت بار کی چمکیلی سطح پر زور سے مکا مارا— ''اپن کا ڈیل سٹیل کیا کہ نہیں!''

اب مسٹر زاویری بھی اندر آ کر باتوں میں شریک ہوگئے۔ ثریا اس کاروباری گفتگو سے اُکتا کر اسٹول پر سے اتری۔ دوسرے کونے میں ایک صوفے پر جا بیٹھی۔ دفعتاً بار پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں جھگڑا شروع ہوگیا۔ سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی نے گلاس فرش پر پٹخ کر جمشید کا گلاش پکڑ لیا— ''سالا— تم نے ہم کو پانچ لاکھ کا دھوکا دیا— ہم تمہارے اوپر کیس چلائیں گا—''

''شٹ اَپ عیسیٰ بھائی یو اولڈ فول—'' جمشید نے گلا پھاڑتے ہوئے جواب دیا۔

''یو شٹ اَپ— یو ڈرٹی بلیک مارکیٹر—'' سیٹھ گھاسلیٹ والا گرجے۔

''اوہ— فور گاڈز سیک—'' جارج نے انگلی اٹھا کر اکتائی ہوئی آواز میں کہا۔

''سالا۔ تم خان برادرز سے اگریمنٹ کرتا اور ہم سے چار سو بیس کرتا— ہم سے پانچ لاکھ کا فراڈ کرتا— ہمارا اکھا بزنس میں لفڑا کرتا— ہمارے روکڑ میں گول مال کرتا— ہمارے ساتھ اتنا بڑا گھنالا ڈالیں گا تو ہم تم پر سوٹ فائل کریں گا— ہمارا پانچ لاکھ کا نقصان کیا— سالا موالی— چور— بے ایمان—'' سیٹھ عیسیٰ بھائی نے نشے میں دھت ہوکر جمشید کی ناک پر زور کا گھونسا رسید کیا اور ہاتھا پائی شروع کردی۔ بار میں بیٹھے ہوئے باقی احباب بھی اس مار پیٹ میں خوشی خوشی شامل ہوگئے۔

چیخ و پکار سن کر سلمیٰ اندر آئی۔ مسٹر پیٹرک نے جلدی سے ڈرائنگ روم کے سارے دروازے اندر سے بند کردیے۔ ثریا نے ڈرائی مارٹینی کا جام تپائی پر رکھا اور آنکھیں نیم وا کر کے سلمیٰ پر نظر ڈالی— ''ہیو اے ڈرنک سلمیٰ ڈیر—!'' اس نے کہا۔

مسٹر پیٹرک نے سلمیٰ کے لیے شیری سے جام بھرا۔ وہ ثریا کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی!

ہاتھا پائی کرتے ہوئے معزز مہمانوں نے تین چار سرخوشی کے نعرے بلند کیے۔ لیکن سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی پر جنون سوار تھا۔ انہوں نے جمشید کو پیٹ بھر کے گھونسے مارے۔ جمشید قالین پر گر پڑا۔ کئی گلاس جھناکے سے ٹوٹے۔ جمشید کے چہرے اور ہتھیلیوں میں کرچیں چبھ گئیں اور خون نکل آیا۔ ثریا اور سلمیٰ اطمینان سے کونے میں بیٹھی تماشا دیکھتی رہیں۔ باہر چبوترے پر تقریباً سارے مہمان کسی تازہ ترین تیز رفتار جنوبی امریکن رقص میں مصروف تھے اور ڈانس بینڈ کے ڈرم زور زور سے بج رہے تھے۔ چند لمحوں بعد دھن تبدیل ہوئی اور ڈانس بینڈ نے افریقہ کے تاریک جنگلوں کی ایک تیز و تند، وحشی تال ڈرم پر بجانا شروع کی اور رقصان جوڑے تالیاں بجا بجا کر فرش پر زور زور سے پیر پٹخنے افریقی تال پر تیز تیز چکر کاٹنے اور اچھلنے کودنے لگے۔ اندر ڈرائنگ روم میں سیٹھ عیسیٰ بھائی بنکارا کیے — ''جھوٹا — بے ایمان — سالا — چور'' مسٹر پیٹرک نے ان کا نشہ اُتارنے کے لیے پانی کا پورا جگ اُن کے سر پر انڈیل دیا۔ سیٹھ عیسیٰ بھائی موسیٰ بھائی فرش پر لمبے لمبے لیٹ کر ایک سانس میں دہرانے لگے — ''اکھا پانچ لاکھ روپیا — پانچ لاکھ روپیا — پانچ لاکھ روپیا —'' مسٹر پیٹرک نے بقیہ حضرات کے لیے تازہ گلاس بھرے۔ دفعتاً سیٹھ عیسیٰ بھائی اٹھے اور چالاک بلی کی سی تیزی کے ساتھ جھپٹ کر جمشید کو پھر دبوچ لیا — ''چور —'' وہ اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے دھاڑے۔ ''ثریا باجی — ثریا باجی! مسٹر گھاسلیٹ والا نے چور پکڑا ہے —'' سلمیٰ نے سرخوشی کے عالم میں کہا اور نازک سا قہقہہ لگایا۔

جمشید سیٹھ عیسیٰ بھائی کی گرفت سے چھٹ کر پھر فرش پر گر گیا۔ کچھ دیر کے لیے مکمل سناٹا چھا گیا۔ مسٹر زاویری، سیٹھ گھاسلیٹ والا کو کمرے سے باہر لے گئے۔ جمشید کہنیوں کے بل قالین پر سے اٹھا۔ رومال سے چہرے اور ہاتھوں کا خون صاف کیا۔ پھر وہ چاروں ہاتھ پیروں کے بل کتے کی طرح چلتا ہوا دونوں لڑکیوں کی طرف آیا۔ وہ بری طرح سسکیاں بھر کے رو رہا تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور سلمیٰ پر جھک کر بولا — ''ہم چور نہیں ہیں — ثریا — اسکو بتا دو ہم چور نہیں ہیں۔ اس کو بتا دو جمشید وا چور نہیں ہے!''

''یو آر میرلی ویری ڈرنک مسٹر جمشید —'' سلمیٰ نے بیزاری سے چہرہ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

یکا یک وہ گانے لگا — ''اگیا لاگی۔ سندر بن جل گیورے۔''

ثریا نے ایک لمبا سانس لیا اور صوفے سے اٹھی اور سلمیٰ کی مدد سے لے جا کر اسے بڑے صوفے پر لٹا دیا۔ باقی ماندہ مہمان بھی بار سے اٹھ کر جا چکے تھے۔ مسٹر پیٹرک نے جھاڑن سے بار کی تر بتر سطح کو پونچھا اور باہر چلا گیا۔ جمشید نے صوفے پر پڑے پڑے ایک اور بہت پرانا تھیٹر کا گیت شروع کر دیا —

''میں آفت کا پرکالہ ہوں ناچ نچادوں دم بھر میں — آگ لگادوں دم بھر میں — جس کی تاکا اس کو مارا۔ پوبارہ ہیں پوبارہ۔ پوبارہ ہیں پوبارہ — پوبارہ ہیں پوبارہ — ہُرے ہپ ہپ۔ ہُرے ہپ ہپ ہپ''

''**سکون— سکون— لیٹ جاؤ**—'' اس نے مجھے آہستگی سے لٹانا چاہا۔

''نہیں— تم نے ایک ان کیا معاہدہ توڑا ہے۔ تم نے مجھ سے بہت کچھ چھپایا ہے۔'' میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دینا چاہا۔ مگر مجھ میں اتنی قوت کہاں تھی۔ وہ خاموشی سے کرسی پہ بیٹھ گئی۔ میں اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر وہ خاموش رہی اور گھڑی ٹک ٹک بولتی رہی۔

''سنو— اگر سن سکتی ہو تو سنو— میں وہاں پھر گیا تھا۔ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ تم کچھ نہیں جانتیں۔ جب آج میں وہاں گیا تو ماں وہاں تخت پوش پر بیٹھی چاول چن رہی تھی اور گھر کا آنگن ایسا تھا جیسے ابھی ابھی ابا جی ناراض ہو کر بول بول کر باہر نکلے ہوں— ماں نے کہا— ''بیٹھ جاؤ۔ آج جانے کیا بات ہے اس میں کوئی آواز نہیں آرہی۔ کوئی ہل جل نہیں—''

''کس میں ہے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے برآمدے کی چھت سے لٹکے اس ڈھکے ڈھکائے پنجرہ کی طرف اشارہ کیا۔ میں لپک کر اٹھا کہ دیکھوں کیا بات ہے۔ مگر ماں نے مجھے روک دیا۔

''نہیں نہیں رہنے دو بیمار ہے، بیچارہ ڈر جائیگا۔ مر جائیگا۔ وہ آتی ہی ہوگی۔ خود ہی دیکھے گی—''

''وہ کون—''؟'' میں نے پوچھا تو اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا وہاں تم کھڑی تھیں— تم— اور تم کہتی ہو تم وہاں کبھی نہیں گئیں۔

''میں کھڑی تھی؟'' وہ مصنوعی حیرت سے بولی۔

''ہاں تم— اور پھر جانتی ہو سب سے بڑا انہتا لمحہ وہ تھا جب تم نے مجھے دیکھنے کے باوجود نہ دیکھا— تم چپکے سے آئیں پنجرہ کا غلاف اٹھایا— پھر تمہارے منہ سے عجب حقارت اور کراہت بھری آواز نکلی۔ ''اوں ہوں'' تم نے انگلی اور انگوٹھے کے درمیان اسے کنڈے سے اٹھایا۔

''اوں ہوں— سب کا سب کیڑوں سے بھرا ہے—'' تم نے پنجرے کا دروازہ کھول کر اسے زور سے باہر نالی میں الٹ دیا۔ اس کو جو اس کے اندر تھا۔ اس کے گرنے کی آواز آئی۔ میں آگے لپکا کہ دیکھوں اسے دیکھوں مگر تم راستے میں کھڑی تھیں اور مجھے اس خوف نے آدبایا کہ کہیں یہ اس نبتے لمحے کا آغاز نہ ہو اور میں رک گیا— چلا آیا— چلا آیا بھاگتا ہوا— دیکھو میرے پاؤں میں چھالے پڑے ہیں۔''

''نہیں— نہیں— مجھے نہیں دکھاؤ—'' اس نے میری پیشانی پر اپنے خوشگوار ٹھنڈک بھرے ہاتھ رکھے۔ ''مجھے نہیں دکھاؤ۔ یہ ہمارا معاہدہ ہے۔ ہم ایک دوسرے کے زخم نہیں دیکھیں گے مگر کیا تمہیں یقین ہے کل رات جو آوازیں برابر کے کمرے سے آئیں۔ وہ اسی کمرے کی تھیں، تمہاری نہ تھیں؟

ریوتی سرن شرما

آندھی ——— وقت کی!

یوں دیکھو تو اس قصبہ میں تھا ہی کیا؟ لے دے کر بس ایک ٹیڑھی میڑھی سڑک تھی، جس کے دونوں طرف کچی پکی دومنزلی، یک منزلی اور ٹین کے سائبانوں والی دکانیں تھیں جنہیں میلے کچیلے کپڑے پہنے، بڑھی داڑھیوں والے دکاندار ہاتھ کے پنکھوں سے ہوا کرتے، بیٹھے اونگھا کرتے تھے۔ اس بازار سے دونوں طرف کو تنگ آڑی ترچھی گلیاں کٹتی تھیں جو قصبہ کے ان محلوں میں جا نکلتی تھیں جہاں لڑکے گلی ڈنڈا گیند تڑی اور گولی کنچے کھیلتے اور ایک دوسرے کو سالے سے لے کر ماں بہن کی گالیاں دیتے رہتے تھے۔ انہیں محلوں میں سادہ اور نقاشی دار ڈیوڑھیوں والے مکان تھے، جن کی درباریوں میں عورتیں ایک دھوتی میں سارا بدن ڈھانپے چرخہ کاتتی، مینگیں چھیلتی اور دوسروں کی بہو بیٹیوں میں فی نکالتی اپنا زیادہ وقت گذارا کرتی تھیں۔ پورے قصبہ پر ایک گرد آلود مردنی اور بے رونقی چھائی رہتی تھی۔ نہ چہل پہل، نہ شور شغب۔ بس نہ جانے کس تحریک کے تحت ان منے کتے زبان نکالے، ہانپتے ایک گلی سے دوسری گلی اور ایک گھر سے دوسرے گھر میں جاتے دیکھتے۔

اس لیے قصبہ میں باہر سے جو لوگ رشتہ داریوں میں سج دھج کر آتے تھے، وہ بہت جلدی قصبہ کے بازار کا ایک چکر کاٹ کر اور اپنے کالے پمپ جوتوں پر کنکریلی سڑک کی دھول لے کر گھر لوٹ آتے تھے اور پھر اپنا باقی وقت سالے، سالیوں اور بھاوجوں کے ساتھ تاش، چوسر کھیلنے، گندے مذاق کرنے میں گزارتے تھے۔ اصرار کے باوجود وہ قصبہ کے باہر سکندرہ دروازے، گڑھ دروازے یا اسٹیشن سے پرے نہ جاتے جہاں آموں کے بڑے بڑے اندھیرا باغ تھے جن میں آم کے پرانے درختوں کے تنے، پرانے کھنڈرے ستونوں کی طرح زمین میں گہرے چلے گئے تھے اور ان کے پھیلے ہوئے گدے ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے قصبہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ ان کی شاخیں اتنی نیچی تھی کہ اکثر نیچے سے جھک کر گزرنا پڑتا اور پتوں کی گھنگھوریوں میں جھینگر اور مچیرے بولتے رہتے تھے جس کی وجہ سے ساری فضا جھنجھناتی رہتی تھی۔ سانجھ ہوتے ہی یہ باغات اور زیادہ تاریک اور پُراسرار ہوجاتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے یہ باغ تپسیوں کے پورانک بن میں جہاں بوڑھے رشی منی اپنی جٹائیں کھولے آنکھیں موندے، ایک ٹانگ پر کھڑے تپسیا میں مگن ہیں۔

لیکن جہاں باہر والوں کے لیے کچھ نہ تھا، وہاں قصبہ والوں کے لیے ان باغوں میں سب کچھ تھا۔ یہ باغ قصبہ والوں کے پرکھوں نے لگوائے تھے۔ جیٹھ کی بھری دوپہریوں میں تالاب سے کنستروں میں پانی لا لا کر یا سقوں سے مشکوں میں پانی بھروا کر انہوں نے آم کے لگائے ہوئے پودوں کو گرمی کی تپش اور سوکھے کے لمبے مہینوں میں ہرا بھرا رکھا تھا اور ان میں اودے رنگ کے کٹے پتے کھلائے تھے۔ ماگھ اور پوس میں

جب کڑاکے کی سردی پڑتی تھی تو پالے کے اثر سے بچانے کے لیے ان پر پھوس کے بوتگے بندھوائے تھے۔ ان کی پرورش اولاد کی طرح کی تھی۔ علی الصبح اٹھ کر رفع حاجت کے لیے باغوں کی طرف جانا تو ایک بہانہ تھا۔ اصل بات تو کم سن پودوں کی اور جو پیڑ بن گئے ان کی یکساں خبرداری رکھنا تھی۔ کسی کے پتوں کو کیڑا تو نہیں کھا رہا۔ کسی کے تنے میں دیمک تو نہیں لگی۔ کسی کو چیپا تو نہیں لگا۔ یہ پیڑ کی ٹہنی کیسے ٹوٹی۔ یہ گدا کس نے کاٹا۔ یا باغ میں تازہ گوبر کیسے نظر آرہا ہے؟ کہیں باغ میں لوگ گائے بھینس چرانے کو تو نہیں لانے لگے؟ اور یہ لال چیونٹے پیڑ کے تنے پر کیسے آتے جاتے نظر آنے لگے؟ کہیں کھٹموں نے پیڑ کی جڑوں میں تو چھتے بنانے شروع نہیں کر دیے۔ یہ تو بور کے آتے ہی اُسے چٹ کر جائیں گے۔ یہ دیکھ اور سوچ کر چہرے یکا یک لمبے ہو جاتے اور دوسرے باغ والوں سے مشورہ ہونے لگتے کہ چیونٹیوں کی روک تھام اور تیا پانچہ کیسے کیا جائے۔ اس پدرانہ شفقت کی وجہ سے باغوں کے ساتھ انہیں لگانے والوں کے نام جڑ گئے اور عرف عام ہو گئے — ''یہ گنیش بھولا کی بگیا ہے، یہ مٹھو تمباکو والے کی۔ یہ شرفو میاں کا باغ ہے۔ یہ منشی قصائی کا۔ یہ اسوڑھے والے تیاگی کا اور یہ بھانا کسیرے کا اور باغ لگانے والے ان سب نے آخری وقت میں ایک ہی وصیت کی تھی — ''سب کچھ گنوا دینا پر زمین کے اس ٹکڑے اور ان دو پیڑوں کو ہاتھ نہ لگانا، انہیں ہماری امانت اور اپنا خاندانی ورثہ سمجھنا۔ یہی اور اسی وجہ سے یہ باغ نہ بیچے گئے نہ کاٹے گئے۔ ان کے ساتھ تقدس اور جڑ گیا جب وقت کے ساتھ ان میں دیوی دیوتاؤں کی سمادھیاں اور پیروں کی قبریں بن گئیں تو یہاں ان دنوں بھی، جب فصل نہ ہوتی تھی۔ عورتوں سے لے کر طوائفیں تک منت مانگنے دیے جلانے اور چادر چڑھانے آتی تھیں۔ آم کے باغوں میں فصل کا بور بھی نخرے سے اور ترسا کر آتا ہے۔ ایک سال نہیں آتا یا نہیں کے برابر آتا ہے اور دوسرے سال ایسا بھر کے آتا کہ آم کے پتے دکھائی نہ دیتے اور بس بور ہی بور بھرا دکھائی دیتا ہے۔ گہرے ہرے رنگ کے پتوں والے پیڑ بور کی بہتات سے سنہری گچھے نظر آتے ہیں۔ چاروں طرف بور کی مدھ ماتی خوشبو پھیل جاتی اور کوئلیں دیوانی ہو جاتی ہیں۔ جو باغ دیکھنے کبھی کبھی آتے تھے، اب ہر روز باغوں میں جانے لگے۔ پیڑوں کی ان شاخوں کو بغور دیکھتے جن پر بور آ گیا تھا اور جن میں کچھ دن بعد ننھی ننھی آموں کے نگینے چمکیں گے۔

لیکن آم کی فصل نر اولاد کی طرح ہوتی ہے، جسے لاکھوں اندیشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بور، آ بھی جائے تو سوکھنے لگتا ہے، اس میں امیاں نہیں لگتیں اور لگ جائیں تو زیور میں ننھے ننھے نگینوں کی طرح جڑ جاتی ہیں۔ اگر یہ سب کچھ نہ ہو، بور پھیل جائیں اور اس میں لگے آموں کے سبز نگینے بڑھنے لگیں، فربہ ہو کر گول لمبوتری اور بیضوی شکل اختیار کر کے لمبے جھمکوں کی طرح لٹکتے دکھائی دینے لگیں، تب بھی کون کہہ سکتا تھا کہ فصل اچھی ہوگی کیونکہ آم کی فصل کی آخری دشمن ہیں آندھیاں، آندھیاں جب آگے چلی جائیں اور پیڑوں پر کچھ آمیاں چھوڑ جائیں تبھی کہا جا سکتا تھا کہ فصل نر ہوگی یا مادا۔

پرانے زمانے جیسی آندھیاں اب کہاں آتی ہیں۔ کھلے ریتیلے میدانوں کی جگہ اب کنکریٹ کے آٹھ آٹھ منزلے شہر کھڑے ہو گئے ہیں جو آندھیاں روک لیتے ہیں۔ لیکن ان دنوں قصبہ کے چاروں طرف آندھیوں کے لیے میدان کھلا ہوا تھا۔ ریگستان کی ریت لے کر چلتیں تو آن کی آن میں طوفان کا روپ

دھارن کرلیتیں۔ لڑکے محلے کے چوک میں کھیل میں مگن ہوتے کہ آسمان کالا پیلا پڑنے لگتا۔ سناٹا چھا جاتا اور ہوا رک جاتی۔ پھر ہوا کے ایک دو تیز جھونکے آتے اور آسمان میں نہ جانے کہاں سے ''چیں چیں'' کرتی ہوئی چیلیں چکراتی ہوئی آتیں اور جیسے آتیں ویسے چکراتی ہوئی اڑتی چلی جاتیں جیسے کسی نامعلوم ہوا کے تھپیڑے نے انہیں دھکیلا ہو اور پھر یکا یک مکان کی برساتیوں پر لگے ٹین کی چادریں کھڑکھڑانے لگتیں اور آسمان سے ہواؤں کے ساتھ گھاس پھوس کاغذ اور ریت گرنے لگتے۔ ''بھاگو بھاگو۔ آندھی آئی۔ کالی آندھی'' اور لڑکے اپنے گلی ڈنڈے اور گولی کنچے چھوڑ کر ایسے بھاگتے کہ کسی کو نہیں پتا کون کس سے ٹکرایا اور کس نے کس کو گرایا۔ لیکن آن کی آن میں محلوں کے چوک خالی ہوجاتے۔ لوگ دکانوں کو تالے لگا کر گھروں کو بھاگتے نظر آتے اور ''بھاڑ بھاڑ'' پتہ نہیں دروازے بند ہوتے یا ان کے کواڑ الگ ہوکر دور گرتے یا سائبانوں کی ٹین کی چادریں اُڑ کر کہاں کی کہاں گرتیں۔ کچھ دیر کے لیے قیامت کا سماں آجاتا جس میں ریت اڑتی۔ اندھیرا چھاتا اور ہوا کے تھپیڑوں کے آگے جو آتا وہ کہاں کا کہاں گیا، اس کا پتہ تب چلتا جب آندھی آکر چلی جاتی اور آدمی اس قابل ہوتے کہ گھر سے نکل کر دیکھ سکیں کہ آندھی کیا توڑ گئی اور کیا چھوڑ گئی۔

جن کے باغوں کی بہار بک چکی ہوتی وہ تو اپنے گھر بیٹھے رہتے لیکن جن کے باغوں کی بہار نہیں بکی یا جنہوں نے آم کے آنے والی بہار کے بیعانے دیئے تھے وہ باغوں کی طرف اپنے لڑکوں اور نوکروں کو چادریں اور بوریاں لے کر سراسیمہ سے دوڑنے لگتے کہ آندھی نے کچھ چھوڑا بھی ہے کہ سارے آم کچے ہی گرا دیئے۔ آندھی نے کتنے ہی آم گرائے ہوتے لیکن قصبہ پر ایک دوسری آندھی چھا جاتی۔ ہر طرف باغوں سے آندھی سے گری کچی آمیوں کے ٹوکرے پے ٹوکرے چلے آتے۔ پلّے دار بوریوں میں اور گدھے والے گدھوں پر لادے محلے محلے پھیل جاتے اور اچار کے لیے گلی گلی آمیاں بکنے لگتیں۔ کبھی کبھی تو تابڑ توڑ دو دو تین تین آندھیاں ایسی یکے بعد دیگرے آتیں کہ آنے دھڑی تو کیا، نکے دھڑی آمیاں بک جاتیں۔

اس کے بعد اور سب کام بند ہوجاتے اور گھر گھر کھٹائی اور اچار کے لیے آم چھلنے لگتے۔ دکانوں پر محلوں میں اور گھر گھر مرد عورت، بوڑھے بچے آم چھیلنے پر لگ جاتے۔ گھر گھر چاقوؤں کی مانگ اتنی بڑھ جاتی کہ پڑوسی مسلمانوں کے گھر تک سے چاقو منگوا لیے جاتے اور اسے پیاز کی بو نہ آئے، اس کے لیے پانی ڈال کر پتھر پر گھس کر اپنے کام کے بنا لیے جاتے۔ امیر لوگ اپنی صندوقچیوں سے خوبصورت چمچماتی سیپیاں نکال لیتے جن کے چپندے کو گھس گھس کر اس میں پنی دھار والا ایسا بڑا چھید بنا لیا جاتا تھا کہ جب سیسی کو آم پر پھیرا جاتا تو صفائی اور سرعت سے آم کا پورا چھلکا اترتا چلا آتا تھا۔

جب آمیوں کا گودا اتارنے کی باری آتی تو کنواری لڑکیاں اپنے آم کے ٹوکرے لے کر الگ بیٹھ جاتیں کیونکہ ان کے چھوٹے بھائی ایسی شرارتیں کرتے کہ ان کے لیے بیٹھے رہنا مشکل ہوجاتا۔ بڑے آموں کا گودا چھیلنے پر تو ان میں سے سخت گٹھلی نکلتی۔ لیکن جو ذرا کچے ہوتے ان میں گٹھلی کے بجائے سفید، نرم اور چکنی بجلی نکلتی۔ بچے اسے شوق سے اٹھا کر اپنے انگوٹھے اور انگلی کے بیچ میں تھام کر اپنی بہنوں کو چڑانے کے لیے کہتے۔ ''بجلی ری بجلی، جیجی کا بیاہ کنگے (کدھر)؟ اور پھر انگوٹھے اور انگلی سے بجلی (کچھ گٹھلی) پر اتنا دباؤ ڈالتے کہ گرفت سے پھسل کر وہ کسی بھی طرف کو اڑ جاتی اور بچے اس طرف کو اشارہ کر کے شور

مچاتے — جیجی کا بیاہ انگنے (ادھر) جیجی کا بیاہ انگنے۔'' بس پھر سہیلیوں کو مذاق کا موقع مل جاتا۔ کنو لے تیرا بیاہ تو دکھن میں ہوگا۔ تو تو بلن شہر (بلند شہر) یا متھرا میں بیاہی جائے گی۔ مگر جو بات مذاق میں شروع ہوتی وہ کسی کسی کے لیے بے حد سنجیدہ روپ اختیار کر لیتیں۔'' لے بھیا تیرا بیاہ تو بلن شہر یا متھرا میں ہو جائے گا۔ تو تو شہر میں چلی جائے گی۔ پر میرے نام پر تو جنم جلی بجلی پورب کو اڑ گئی۔ اُدھر تو دور دور تک شہر نہ ہے۔ میں تو گاؤں میں گھٹ گھٹ کر مروں گی۔ آم چھیلتے ہاتھ رک جاتے اور ننھے ننھے مستقبل کے اندیشوں سے سہم کر چہروں کو فق کر دیتے۔ آمیاں چھلنے اور گودا اترنے کے بعد اچار پڑتا۔ نمکین اور میٹھا۔ چھلا اور بے چھلا۔ تیل کا اور نمک اور ہینگ کا۔ غرضیکہ ہر کوئی للو پنساری کی دکان پر ہلدی، کالی زیری، سونف میتھی اور نمک لینے کے لیے کھڑا ہوتا۔ پہلے آم کی پھانکوں اور گودے میں نمک چڑھایا جاتا۔ دھوپ میں رکھ کر اس کا پانی الگ کیا جاتا۔ پھر اس میں کالی زیری، سونف میتھی اور الگ الگ ذائقے کے لیے الگ الگ مصالحے ملائے جاتے اور اس کے بعد آم کی پھانکوں اور گودے کو اچار کی پرانی ہانڈیوں اور مرتبانوں میں جما کر اوپر سے گنگا جل اور تیل ڈالا جاتا۔ لیکن کچھ عورتوں کو جانے سیتا کا شراپ تھا کہ ان کے ہاتھ کا ڈالا اچار نہ نکلتا۔ پھپھوندی لگنے سے خراب ہو جاتا۔ ایسے گھروں میں امرتی تائی اور جگنا تاؤ کی بڑی پوچھ ہوتی کیونکہ ان کے ہاتھ میں جانے کیا تاثیر تھی کہ ان کے ہاتھ کا ڈالا اچار برسوں نہ بگڑتا۔ جس کا اچار کسی بھی وجہ سے گل جاتا، اگلے برس وہ بھی امرتی تائی اور جگنا تاؤ کی قطار میں لگ جاتا۔ دان پن پر جینے والی امرتی تائی کے ان دنوں نخرے دیکھنے کے ہوتے تھے۔ اچار ڈالنے تو چلی آتی پر اچار ڈال کر اور ہنڈیاں کا منہ بند کر کے گھر کی ادھیڑ اور جوان عورتوں سے داد اور تحسین حاصل کر کے جاتے ہوئے کہتی۔ ''بھگوان نے تمہیں بھلے ہی بڑا بنایا پر جو پرتاپ اس بامنی کے ہاتھ کو دیا وہ اس قصبہ میں کسی اور کو نہ دیا ہے۔'' اور جگن تاؤ — جب انہیں اچار دبوانے کے لیے بلاوا دینے کو لڑکے بھیجے جاتے وہ کہتے ''ابا نے اچار ڈالنے کو بلایا ہے تو انہیں موٹی سے گالی دے کر کہتے ''ماں کے خصموں، اس تاؤ کو تمہاری مائیں اچار دبوانے کو بلاتی ہیں، کچھ اور دبوانے کو نہ بلاتیں۔''

گھر گھر میں اچار پڑتا اور جن مردوں کے قصبے کے مسلمانوں سے خاص مراسم تھے یا جن عورتوں کی مسلم بھتیلیاں تھیں، ان کے گھر میں ایک ہنڈیا اچار، فاضل ڈلتا۔ ''دیکھو اس ہنڈیا کو کوئی ہاتھ نہ لگائے، یہ ملا جی، شیخ جی اور میری اونچی حویلی والی بجنیلی (سہیلی) کے لیے ڈالی ہے۔ روزے شروع ہوں گے تو کھلے گی اس میں سے کوئی نہیں لے گا۔ اس میں سے اچار روزے کے دنوں میں ان کے لیے بھیجا جائے گا۔'' اور اس اچار کی پھروتی عید کے دن ہوگی، سوکھی سیویوں، چھوارے اور سوکھی خوبانیوں کے ساتھ اور کہا جاتا — ''پنڈت جی آپ کے گھر سے کیا اچار ڈالتی ہیں۔ ان کے اچار کی پیلی پیلی کراری اور جاندار پھانکوں کا جواب نہیں۔ ہاتھ میں ان کے سچ مچ کمال ہے۔''

اچار دب جاتے۔ آندھیاں ختم ہو جاتیں۔ آموں میں رس پڑنے لگتا اور طوطوں کے غول کے غول نہ جانے کہاں سے آ کر پیڑوں پر اُترنے لگتے۔ ان سے فصل بچانے کے لیے مالی اور کنجڑے جنہوں نے بہاریں خریدی تھیں، باغوں میں جھونپڑے ڈال لیتے اور دن رات ہڑ ابول کر اور پیڑوں سے بندھے ٹین کے کنستر پیٹ کر طوطے اڑانے میں لگ جاتے۔ بے تابی سے انہیں پھر ان کے مینہ اور بارش کی ان جھڑیوں

کا انتظار رہتا جو آموں کا رنگ نکھار دیں، ان میں رس ڈال دیں اور باغ کے ڈولوں پر لگے شیشم کے پیڑن کو تازہ تازہ کومل کونپلوں سے بھر دیں۔ شیشم کے پیڑوں کی ان تازہ کونپلوں کا آم کی بہار کی نمائش سے گہرا تعلق تھا۔ باغ کے بہترین آم اور آمیوں کو کنجڑے ان کھلے ہوئے ٹوکروں میں بھاتے تھے۔ جن میں شیشم کے پیڑوں کی ہری کنچ کونپلیں توڑ کر بچھا دی جاتی تھیں۔ ان کے اوپر آموں کو ان کے رنگ، سائز اور شکل کے حساب سے ایسے سجایا جاتا کہ سپیا، سیندوریا اور اندھیریا آم آمیاں الگ سے سجے نظر آتے اور پھر چنبیلی اور موتیا کے ادھ کھلے غنچے ان پر بکھیر دیئے جاتے۔

اس اہتمام کے بعد طرح دار کنجڑے، ململ کے سفید کڑھائی دار کرتے اور رنگین ریشمی تہمد باندھ کر، ٹوکرے اپنے لونڈوں کے سر پر رکھوا کر بازار سے سریلی آوازیں لگاتے گذرتے۔ ''میاں شرفو کے باغ کی گلاب جامنیں آ گئیں۔ لے لو، مصری کے کوزے، بھانا مل کسیرے کے باغ کے، کویل کی پدی ہوئی سیندوریا آ گئیں ایک آنے سیر۔ اور آواز لگاتے ہوئے یہ کنجڑے جب سبزی بازار میں جا کر اپنے چھابڑے لگاتے تو پھر رنگ بازار میں بھی بہار آ جاتی۔ میرٹھ دروازے کے ڈاک خانے تک سبزی بازار میں آموں کی بھرمار سے اور سبزی پر نگاہ نہ جاتی۔ بازار میں جو جاتا دیکھتا، تھیلے میں آمیاں لیے اور لبھا دیں ملی آمی چوستا ہوا نظر آتا۔ قصبہ میں جن کے باغ تھے، ان کے گھروں میں فصل کے آخر تک آم آمیوں کے ٹوکرے جنس کے طور پر آتے رہتے۔ آم کی بہار بیچنے سے پہلے ہی گھروں میں طے ہو جاتا— ''دیکھو جی تم کتنے کی بہار بیچو، پر میں کہے دیتی ہوں کہ جنس میں دس من آم دیں گے۔ مجھے رشتہ داری اور بھین بھنیلے (بہنوں اور سہیلیوں) میں بانٹنے ہیں۔ انہیں کیا پتہ لگے گا کہ ہم باغ بغیچے والے ہیں، اگر ان کے جنس نہ پہنچی اور یہ عورتوں تک ہی محدود نہ تھا۔ شرفو میاں کے باغ کا بیر آم مشہور تھا۔ ایک ایک ٹپکا ڈیڑھ ڈیڑھ اور دو دو پاؤ کا، رنگ سنہری اور گودا ایسا کرارا کہ قلمی آم کی طرح سالم قاش اُتر آتی۔ باغ میں بیر آم کے چار، پیڑ تھے، شرفو میاں پہلے سے طے کر دیتے کہ دو پیڑوں کے آم انہیں جنس میں ملیں گے جو ان کے دوستوں کے یہاں سوغات میں جائیں گے۔ بس دو پیڑوں کے آم بہار خریدنے والے کے ہوں گے۔

غرضیکہ پورا قصبہ آم آمیوں کے رنگ میں رنگ جاتا۔ کوئی گھر ایسا نہ ہوتا جس میں بالٹیوں کے اندر پانی میں آم نہ پڑے ہوتے۔ کوئی بچہ ایسا نہ ہوتا جس کی قمیض پر آم کے نشان نہ ہوتے اور زیادہ آم کھانے کی وجہ سے ٹانگوں میں پھنسیاں نہ نکلتیں۔ بازاروں میں چوسے ہوئے آم کے چھلکے اور گٹھلیوں کی وہ بہتات ہوتی کہ سامان ڈھونے والے گدھوں تک کی شامت آ جاتی۔ چلتے چلتے چھلکے گٹھلیاں کھانے کے لیے وہ رکے بغیر نہ رہتے اور انہیں ہانکنے کے لیے ان کے مالک ان پر ڈنڈے اور سٹیاں برسائے بغیر انہیں بازار سے نکال نہ پاتے اور آم کے پیڑ جب آموں سے خالی ہو جاتے تو وہ گھروں میں اگنے لگتے۔ گھر والے آم کھانے کے بعد ان کی گٹھلیاں گھر کے کسی کچے کونے میں یا مٹی کے کسی کھلے برتن میں ڈال دیتے جس میں مٹی بھری ہوتی۔ پھر چوکا چولھے لیپنے پوتنے کے بعد بچا ہوا، مٹی اور گوبر کا پانی ان میں ڈال دیا جاتا اور ایک دن اچانک گٹھلیوں میں سے کلے پھوٹنے لگتے۔ کچھ دن بعد یہ کلے، سرخ رنگ کے چھلوں میں بدل جاتے اور ایک دن چھلا کھل کر ایک نازک سے تنے کی صورت میں کھڑا ہونے لگتا۔ اس پر چوہیوں کے نازک

کانوں کی طرح اودی اودی پتیاں نظر آنے لگتیں جو تنے کے بڑھنے کے بعد بڑی ہوکر بکری کے کانوں کی طرح، لٹکنے لگتیں۔ گٹھلیوں کا ڈھیر، پپیوں کا جنگل سا بن کر گھر گھر کھڑا ہوجاتا اور بچے اپنی ماؤں اور بڑی بہنوں کی دھوتیاں پکڑے پھرتے۔ ''اماں۔ جیجی ایک پپیا توڑ کر گھس دو۔ ہم پپیا بجائیں گے اور وہ ایک پپیا اکھاڑ کر اس کی گٹھلی چھیلتی۔ اندر سے نرم چکنی بڑی سی بجلی نکل آنے پر اُسے ایک طرف سے دیوار پر گھستیں چونکہ بجلی میں دو پھانکیں سی ہوتی تھیں اس لیے بچی پھانک گھسنے سے اس میں ایک زبان سی بن جاتی جب وہ اسے منہ میں لیے ہوئے پھونکتیں۔ ''پیں—'' پپیا بج اٹھتا۔ بچے اُچھل پڑتے۔ پھر کیا تھا سارے محلوں میں پیں پیں کا شور مچ جاتا۔ بچے گلی گلی ہرے اور اودے پتوں والے پپیے منہ میں دبائے ایک دوسرے کے کان کے پاس بجاتے پھرتے۔

یہ تھا وہ سب کچھ جو باہر والوں کے لیے اس قصبہ میں نہ تھا۔ لیکن قصبہ والوں کے لیے تھا اور ان کی یادوں اور ان کے سنسکاروں کا حصہ بن گیا تھا۔ یہ باغ اس قصبہ کی روح تھے جو پشت در پشت چلے آرہے تھے جو یا تو ورثے میں ملے تھے یا نئی نسل کو ورثہ میں دیئے گئے تھے۔ لیکن وقت جو ورثہ میں دیتا ہے، ایسے مٹا بھی دیتا ہے کہ اس کا نشان نہیں رہتا۔ باغوں کے سلسلہ میں بھی ایسا ہی ہوا، جنہوں نے باغ لگائے وہ مرگئے۔ جنہیں ورثہ میں ملے، وہ قصبہ سے باہر چلے گئے۔ نام لیوا تھے پر پانی دیوا، نہ رہے۔ باغ سوکھ گئے۔ پیڑ پرانے پڑ کر اس لیے پھل کے بجائے گٹھل پھل دینے لگے۔ قلمی آموں اور ڈبہ بند اچار مربوں کا زمانہ آگیا۔ اس لیے پہلے باغ نظرانداز ہوئے پھر ان کی قیمت ان کے پیڑوں کی لکڑی اور زمین کے ٹکڑے کی قیمت سے آنکی جانے لگی۔ نئی بستی بننے لگی تو اینٹوں کی ضرورت ہوئی اور اینٹوں کی ضرورت ہوئی تو بھٹے والوں نے سمجھایا۔ ٹھیک ہے بزرگوں کے لگائے پیڑ ہیں۔ لیکن پرانے پیڑ کی لکڑیوں کی قیمت سال کی لکڑی کے سامنے کچھ نہیں رہی۔ اب تو جلانے کے کام آسکتی ہیں۔ اس لیے باغ بیچ دیجئے آپ کو اچھے پیسے مل جائیں گے اور ہمیں اینٹوں کے بھٹے لگانے کے لیے زمین اور لکڑی ایک جگہ مل جائے گی۔ آپ یہاں رہتے، ان کی نگرانی رہتی تو اور بات تھی۔ ان کی جگہ قلمی آموں اور دوسرے پھلوں کے باغ لگا لیتے۔ لیکن آپ باہر رہیں گے، آپ کے بچے بھی باہر رہیں گے تو لوگ پیڑ کاٹ کر بھی لے جائیں گے اور زمین پر قبضہ کرلیں گے یا مٹی کھود کر اپنے کچے گھر بنالیں گے۔ باقی جیسا آپ سمجھیں۔

بات معقول تھی کسی نے اب مانی، کسی نے تب مانی۔ کوری بات ہوتی تو اور بات تھی۔ لیکن یہ تو وقت کا تقاضہ تھا۔ وقت وقت جب عزیز کی لاش کو جلوا اور دفنوا دیتا ہے تو باغ کہاں ٹکتے۔ کٹ گئے، بک گئے اور جہاں وہ کبھی جٹا دھاری سادھوؤں اور پیر فقیروں کی طرح ایک ٹانگ پر کھڑے ریاضت کرتے تھے۔ وہاں اب اینٹ کے بھٹوں کی چمنیاں ہیں۔ ہوا جب تیز چلتی ہے تو انھیں سے نکلتا دھواں پھیل کر سارے قصبہ پر چھا جاتا ہے اور جب ہوا بند ہوجاتی ہے تو چمنیوں کے گرد جمع ہوکر جھٹیں کھاتا رہتا ہے۔ باقی رہے نام— وقت کا۔

بلراج کومل

کنواں

جب میونسپل کارپوریشن کی طرف سے شہر کے بیشتر حصوں میں پانی کے نل مہیا کر دیے گئے تو شہر کے اکثر کنوئیں بے مصرف ہو گئے اور کافی عرصہ تک بے مصرف رہے۔ آخر ایک ذہین شہری نے ان کا ایک انوکھا مصرف ڈھونڈ نکالا۔ اس نے ایک جست میں کنواں پھلانگنے کا ایک انوکھا تجربہ کیا۔ یہ تجربہ کام یاب رہا۔ اس کے بعد اس ذہین شہری نے کنواں پھلانگنے کا شغل باقاعدہ اختیار کر لیا۔ جب وہ ایک کنواں پھلانگ چکتا تو اس کی خواہش ہوتی کہ وہ اور کنواں پھلانگے۔ ہر بار وہ پہلے سے زیادہ مشکل صورت حال کا انتخاب کرتا اور تماشائیوں کی تالیوں اور واہ واہ کے درمیان کنواں پھلانگنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس کی مقامی شہرت رفتہ رفتہ قومی شہرت کا درجہ اختیار کر گئی اور اب اس کا نام بیرونی ممالک کے اخبارات میں بھی کہیں کہیں نظر آنے لگا۔ کسی بھی فرد کا کوئی دعویٰ ایسا نہیں ہے جس کو چیلنج کرنے کے لیے کوئی دوسرا فرد موجود نہ ہو۔ چناں چہ گولنکر کے سلسلہ میں بھی یہی ہوا۔ ایک روز اسے ڈاک سے ایک خط ملا۔ یہ خط ایک اجنبی کی طرف سے تھا جس نے گولنکر کو کنواں پھلانگنے کے مقابلہ کے لیے چیلنج بھیجا تھا۔ گولنکر نے خط پڑھا اور خط پڑھتے ہی اس کے مردانہ وقار نے تقاضا کیا کہ وہ چیلنج منظور کرے۔ چناں چہ گولنکر نے فوراً چیلنج کرنے والے کو تحریری اطلاع دی کہ وہ کسی وقت بھی باہمی خط و کتابت کے ذریعہ طے شدہ شرائط کے مطابق مقابلہ کے لیے تیار ہے۔ اگلے چند ہفتوں کے اندر شرائط طے ہو گئیں اور مقابلے کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ مقامی اور قومی اخبارات میں مقابلہ کی تفصیلات کا اعلان کر دیا گیا۔

اگرچہ گولنکر کہنہ مشق کھلاڑی تھا اور بہت سے کنوئیں پھلانگ چکا تھا۔ جوں جوں مقابلہ کی تاریخ قریب آتی گئی۔ اس کے دل میں خدشات پیدا ہونے لگے۔ ان خدشات پر قابو پانے کے لیے گولنکر نے فیصلہ کیا کہ چوں کہ سوال اپنی شہرت اور وقار کو برقرار رکھنے کا ہے اس لیے مقابلہ سے قبل کنواں پھلانگنے کی کچھ مشق ضروری ہوگی جو مقابلے کا فیصلہ نتیجہ کن انداز سے اس کے حق میں کرنے میں مفید ثابت ہوگی۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد گولنکر نے شہر کے تمام کنوؤں کا (جس میں سے اکثر کو وہ پھلانگ چکا تھا) بغور جائزہ لیا۔ ہر ایک کنوئیں کا قطر ناپا۔ پھلانگنے کے زاویوں کا مطالعہ کیا۔ ظاہر ہے کہ گولنکر جیسی شہرت کے مالک کے لیے شہر کے کنوؤں پر مشق کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے اس نے اس کام کے لیے شہر سے باہر ایک ویران کنوئیں کا انتخاب کیا۔ یہ کنواں چاروں طرف سے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ باہر سے گزرنے والا آدمی اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ درختوں کے جھنڈ کے اندر کنواں ہے۔ اس کنوئیں کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس کی منڈیر، اس کا قطر اور اس کے چاروں طرف کی خالی زمین کا حدود اربعہ اس کنوئیں کے مماثل تھے جو آخری مقابلہ کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ کنوئیں کا انتخاب کرنے کے بعد مناسب تیاری کی

ضرورت تھی۔ گولنکر نے تمام تیاری دو چار روز میں مکمل کر لی اور ایک صبح کو کنوئیں کی طرف روانہ ہو گیا۔

مارچ کی یہ صبح بڑی خوب صورت تھی۔ ہوا میں موسم بہار کا اثر تھا۔ لوگوں کے چہرے پر مسرت تھی۔ بچے آنگنوں میں کھیل رہے تھے۔ زندگی کا کاروبار معمول سے زیادہ حسن اور خوش اسلوبی سے چلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ گولنکر رنگ و بو کی اس محفل سے لطف اندوز ہوتا ہوا شہر کے دھیرے دھیرے تیز ہوتے ہوئے باو ہو میں سے گذر کر درختوں کے اس جھنڈ کی طرف جا رہا تھا جہاں اسے کنواں پھلانگنے کی مشق کرنی تھی۔ اس کا دل، اس کا دماغ، اس کا پورا وجود زندگی کے نشے سے سرشار تھا۔ اس کے قدم اعتماد سے اٹھ رہے تھے اور اس کے چہرے پہ کامرانی کا وہ نور تھا جیسے وہ مقابلہ میں شامل ہونے سے پہلے ہی مقابلہ جیت چکا ہو۔

شہر کی ایک نواحی بستی میں وہ ایک پارک کے قریب سے گذرا۔ سبزے پر کچھ لڑکے کھیل رہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت کھیلنے والے لڑکے نے ایک شاندار چھکا لگایا۔ گولنکر کا دل مسرت سے چھلک اٹھا۔ نواحی بستی سے نکل کر وہ اس سڑک پر آ گیا۔ جہاں خوب صورت بنگلوں کی ایک لمبی قطار دور تک چلی گئی۔ ایک مکان کے باہر ایک گول مٹول سرخ و سپید بچہ ٹافی کھا رہا تھا۔ گولنکر نے اس کے ملائم، صحت مند گالوں کو تھپ تھپایا اور آگے بڑھ گیا۔ اب وہ درختوں کے جھنڈ کے بالکل قریب تھا۔ وہ رک گیا اور اس نے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ فطرت کا سارا حسن کھیتوں کی ہریالی اور سونے میں سمٹ آیا تھا۔ گولنکر کچھ دیر اس حسن سے سرشار ہوتا رہا۔ پھر جھنڈ کے اندر داخل ہو لیا۔ کنوئیں کے قریب پہنچ کر اس نے جو منظر دیکھا اسے دیکھنے کا امکان اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کنوئیں کی منڈیر پر سوکھا مارا چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا اور بڑے انہماک سے کنوئیں کے اندر جھانک رہا تھا۔ اجنبی گولنکر کی آمد سے بالکل بے خبر تھا۔ اس لیے جب گولنکر اس کے قریب پہنچا تو وہ چونک پڑا۔ گولنکر نے اپنے ردعمل کا اظہار ایک سوال کی صورت میں کیا۔

''تم کون ہو؟''

اجنبی اب بھی کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا اور گولنکر پر ایک تحقیر آمیز نظر ڈال کر کنوئیں کے اندر جھانکنے کے عمل میں دوبارہ مصروف ہو گیا تھا۔

گولنکر کے سوال کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

گولنکر نے اپنا سوال دہرایا۔

''میں پوچھتا ہوں، تم کون ہو؟''

اجنبی دوسری بار بھی خاموشی سے گولنکر کا سوال ہضم کر گیا۔ گولنکر نے تیسری بار کوشش کی اس بار اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''میں پوچھتا ہوں۔ تم کون ہو؟''

اجنبی دوسری بار بھی خاموشی سے گولنکر کا سوال ہضم کر گیا۔ گولنکر نے تیسری بار کوشش کی اس بار اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

''میں پوچھتا ہوں۔'' تم کون ہو؟'' کیا کرتے ہو اور یہاں کس لیے آئے ہو؟''

اجنبی نے اپنی آنکھیں کنوئیں کے چندے سے ہٹائیں اور گولنکر کے چہرے پر گاڑ دیں۔ گولنکر کو

یکا یک محسوس ہوا کہ اجنبی اس کی روح کے اندر جھانک رہا ہے اور اس کے ہر راز سے واقف ہوتا جارہا ہے۔ گولنکر کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے لیکن اس سے پیش تر کہ گولنکر اپنے غصہ کا اظہار کر پاتا، اجنبی کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے۔

''دو انسانوں کے درمیان ہم دردی اس وقت پیدا ہوسکتی ہے جب ان کے مفاد ایک جیسے ہوں۔''

''تو تم ہمدردی کی تلاش میں ہو۔''

''شاید میں نے غلط لفظ استعمال کیا۔ مجھے رشتہ یا تعلق یا اسی قسم کا کوئی عام لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا۔ بہر حال میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا ہوں۔''

گولنکر چکر میں آگیا۔ عجیب آدمی سے واسطہ پڑا تھا۔ وہ اجنبی کو کچھ دیر بے بسی کے عالم میں دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

''دیکھو میں یہاں ایک خاص مقصد سے آیا ہوں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

''میں واپس جانے کے لیے تیار نہیں آیا ہوں۔ تم چاہو تو یہاں سے جاسکتے ہو۔''

''آخر تم کیا چاہتے ہو؟'' گولنکر نے پوچھا۔

''میں چاہنے یا نہ چاہنے کے عمل سے بہت دور نکل چکا ہوں۔''

گولنکر کے ذہن میں ایک اور سوال کوندے کی طرح لپکا۔

''کیا تم خودکشی کرنا چاہتے ہو؟''

''مجھے زندگی اور موت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔'' اجنبی نے جواب دیا۔

گولنکر کے چہرے پر مسرت اور اعتماد کی روشنی نمودار ہوئی۔ وہ اجنبی کی پراسرار شخصیت کے ایک گوشے کو بے نقاب کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ میں کس مقصد سے یہاں آیا ہوں۔''

''مجھے اب دوسروں کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے کسی مسئلے سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔''

گولنکر کی حیرت میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

''یقیناً تمہارا گھر ہوگا، تمہاری بیوی ہوگی، بچے ہوں گے۔

''تھے! اب نہیں ہیں۔'' اجنبی نے ایک بار پھر کنوئیں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''کہاں گئے؟''

''مر گئے۔''

''کس طرح مر گئے؟''

''جس طرح انسان مرتے ہیں۔ بھوک سے، بیماری سے، قتل سے۔''

''یہ تو عام بات ہوئی، خاص طور پر، تمہاری بیوی اور تمہارے بچے کیسے مرے؟''

اجنبی شاید گولنکر کے ضرورت سے زیادہ سوالوں کا جواب دے چکا تھا۔ اس لیے برہم ہوکر بولا۔

''میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا۔ تم مجھے مجبور کیوں کر رہے ہو؟''

''کچھ سوالوں کا جواب تم نے اپنی خوشی سے دیا ہے۔ ویسے بھی مجھے تمہارے ساتھ دل چسپی ہوگئی ہے۔ میں تمہارے ساتھ دوستی کرنا چاہتا ہوں۔''

دوستی کے نام پر اجنبی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور پورے زور سے چیخا۔

''چلے جاؤ یہاں سے۔ تم کون ہوتے ہو میرے ساتھ دوستی کرنے والے۔ گولنکر مسکرایا۔

''میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔''

''تو پھر تم کون ہو؟'' اجنبی سوال پوچھ کر اپنے سوال پر خود حیران ہوگیا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے ٹھیک یہی سوال میں نے تم سے پوچھا تھا جس کا جواب دینے سے تم نے انکار کر دیا تھا۔ لیکن میں انکار نہیں کروں گا میرا نام گولنکر ہے، میرے نام سے اس شہر کے تمام لوگ واقف ہیں۔ میں مشہور کنواں پھلانگنے والا ہوں۔''

''مجھے تمہارے ساتھ کوئی دل چسپی نہیں ہے۔''

''تمہیں میرے ساتھ دل چسپی ہے۔ اسی لیے تم نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں کون ہوں؟'' اجنبی کی آنکھوں میں غصے کی بجلی ایک پل میں لہرائی۔ اس کے بعد اس نے آہستہ آہستہ کہا۔

''مجھے کنواں پھلانگنے والوں سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔''

''نہ سہی۔ لیکن میں کنواں پھلانگنے کے علاوہ بھی بہت کچھ کرتا ہوں۔''

''میں جانتا ہوں تم جو کچھ کرتے ہو۔ جھوٹ، چوری، ڈاکہ زنی، قتل، زنا بالجبر...''

اجنبی کے یہ الفاظ سن کر گولنکر سناٹے میں آگیا۔

''شاید تم اپنے کارناموں کی تفصیل پیش کر رہے ہو۔''

'جی ہاں۔ اپنے، تمہارے، تمام انسانوں کے۔''

''لیکن تمہارے بیوی بچے کیا ہوئے؟''

اجنبی کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ وہ اس سوال کے جواب سے بھی گزر جانا چاہتا ہے۔

''جھوٹ، چوری، ڈاکہ زنی، قتل...''

''لیکن انسان کی زندگی صرف اس کی ذات تک محدود نہیں ہے۔'' گولنکر نے اسے درمیان میں ٹوک دیا۔

''میں تمام فلسفوں سے بخوبی واقف ہوں۔ یہ مت سمجھو کہ تم کنوئیں پھلانگتے پھلانگتے زندگی کے رازداں بن گئے ہو۔''

''خودکشی سے صرف تمہارا مسئلہ حل ہوتا ہے۔''

''ہر انسان اپنا ہی مسئلہ تو حل کرتا ہے۔''

گولنکر کو اجنبی کی باتوں سے جو دل چسپی پیدا ہوگئی تھی۔ مزید گہری ہوگئی۔

''لیکن اس زندگی کے دوسرے اہم مسائل بھی تو ہیں جو میری اور تمہاری ذات کے مسائل سے زیادہ

اہم ہیں۔"

"جی ہاں! میں ان سے بھی واقف ہوں۔ ان پر بھی جھوٹ، چوری، ڈاکہ زنی، قتل، زنا بالجبر حاوی ہیں، فرد سے اجتماع تک پہنچتے پہنچتے تفصیلات میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

"فرض کرو تم خودکشی کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہو جس کا امکان بہت کم ہے۔ کیونکہ میں تمہیں ہرگز ایسا کرنے نہیں دوں گا تو کیا تمہارے ذاتی مسائل اور دنیا کے مسائل حل ہو جائیں گے۔"

مجھے اس سوال کے ساتھ کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ مسائل حل ہوں یا نہ ہوں میں اپنا آخری فیصلہ کر چکا ہوں اور پھر میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا کا کوئی اجتماعی مسئلہ فیصلہ کن طریقے سے ہمیشہ کے لیے بھی حل نہیں ہوتا۔ صرف عارضی طور پر حل ہوتا ہے۔ میں صرف اپنا مسئلہ حل کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم نادان ہو۔"

"کون جانتا ہے کون نادان ہے۔"

دونوں آدمی اپنے اپنے سوالات اور جوابات میں الجھ گئے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے دونوں خاموش ہو گئے۔ گفتگو کا دوبارہ آغاز اجنبی نے کیا۔

"تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میں اپنے آخری فیصلے پر عمل کرنا چاہتا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم اس سے پہلے اپنے کسی فیصلے پر عمل نہیں کر سکے۔ اجنبی کے چہرے پر جھلاہٹ پیدا ہوئی۔

"میں اپنے ہر فیصلے پر عمل کرتا رہا ہوں۔"

"تو پھر اس فیصلے پر عمل کرنے کے لیے ہچکچاہٹ کیوں۔ تم اپنا مسئلہ ملتوی کیوں کرنا چاہتے ہو۔"

اجنبی کے چہرے پر مزید غصے کے آثار پیدا ہوئے۔

"میں نے کہا نا کہ میں اپنے آخری فیصلے پر فوراً عمل کرنا چاہتا ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

"اگر یہ فیصلہ تمہارا آخری فیصلہ ہے اور تم اس پر عمل بھی فوراً کرنا چاہتے ہو تو میری موجودگی سے تمہیں کیا زحمت ہے؟"

"میں اپنی موت کے عمل میں تنہا شامل ہونا چاہتا ہوں۔ تم میری موت کے گواہ نہیں بن سکتے۔ میں یہ حق تمہیں کبھی نہیں دے سکتا۔"

"میں تمہیں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ زندگی خوب صورت ہے۔ زندہ رہنے کی کوشش کرو۔"

"مجھے تمہارے امید افزا الفاظ بے معنی نظر آتے ہیں۔ بفرض محال اگر زندگی خوب صورت بھی ہے تو تمہیں اس سے لطف اندوز ہونے کی پوری آزادی ہے۔ تم میرے معاملے میں ٹانگ کیوں اڑا رہے ہو؟"

"اس کا مطلب ہے تم اپنے آخری فیصلہ پر عمل کرنے پر بہ ضد ہو۔ تم بہ خوشی خودکشی کرو میں یہاں سے چلتا ہوں۔"

یہ کہہ کر گولنکر وہاں سے چل پڑا۔ اجنبی کنوئیں کی منڈیر پر چڑھ گیا اور کنوئیں کے اندر کودنے کے

لیے تیار ہوگیا۔

گولنکر دو چار قدم چلنے کے بعد رک گیا اور واپس اسی جگہ آ گیا جہاں وہ چند لمحے پہلے کھڑا تھا۔

''میرا ایک آخری سوال باقی ہے۔''

''پوچھو۔'' اجنبی نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

''تم نے خودکشی کے لیے یہ کنواں کیوں منتخب کیا؟''

''تم نے پھلانگنے کے لیے یہ کنواں کیوں منتخب کیا؟''

''میرے لیے یہ کنواں مناسب تھا۔''

''ٹھیک یہی بات میں کہتا ہوں یہ کنواں میرے لیے مناسب تھا۔''

اس جواب سے گولنکر کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ لمحہ بھر سوچنے کے بعد اس نے اجنبی سے پوچھا۔

''کیا تم اپنی خودکشی چند منٹوں کے لیے ملتوی کر سکتے ہو؟''

''آخر تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں یہاں کنواں پھلانگنے کی مشق کے لیے آیا تھا کیوں کہ مجھے دو روز بعد کنواں پھلانگنے کے لیے ایک مقابلہ میں حصہ لینا ہے۔''

''تو میں کیا کروں۔ تم سمجھتے ہو، اس مسخرے پن سے تم مجھے متاثر کرلو گے۔''

''تمہیں کچھ نہیں کرنا ہے۔ میں چاہتا ہوں میں جس کام کے لیے یہاں آیا ہوں اسے پورا کر کے جاؤں۔ جہاں تک تمہیں متاثر کرنے کا تعلق ہے تم جہنم میں جاؤ، میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں۔''

''شوق سے پورا کرو لیکن جلدی، کیوں کہ میں اپنا فیصلہ زیادہ دیر کے لیے ملتوی نہیں کر سکتا۔ میں اپنے صبر کی انتہا تک پہنچ چکا ہوں۔''

یہ کہہ کر اجنبی کنوئیں کی منڈیر سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ گولنکر نے کوئیں کی منڈیر سے مخصوص فاصلہ ناپ کر زمین پر کچھ نشان لگائے۔ ایک نشان پر کھڑے ہو کر اس نے اپنی قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کیا، اپنے جسم کو تولا اور اس کے بعد دوڑتا ہوا کنوئیں کی جانب بڑھا۔ راستے میں ایک دوسرے نشان سے اس نے بھرپور جست لگائی۔ اجنبی کے دل کی دھڑکن اس دوران میں تیز ہوگئی۔ جست لگاتے ہی گولنکر کا جسم ہوا میں ایک قوس سی بناتا ہوا کنوئیں کے اوپر سے گزرنے لگا اور عین اس لمحہ اجنبی کو توقع تھی کہ گولنکر کنوئیں کے دوسری طرف ہوگا۔ ایک پرزور دھماکہ ہوا۔ گولنکر کا جسم کنوئیں کی منڈیر کی اندرونی سطح کے ساتھ زور سے ٹکرایا اور پھر کنوئیں کی پوری گہرائی کا فاصلہ طے کرتا ہوا دھم سے پانی میں جا گرا۔

اجنبی کی آنکھیں پھیل کر روزن بن گئیں۔ اس کا پورا وجود فوری فطری ردعمل کی زد میں آ گیا اور وہ ڈوبنے والے کی تقدیر سے غافل، اپنے ارادوں اور فیصلوں سے غافل درختوں کے جھنڈ کو چیرتا۔ سرسبز و شاداب کھیتوں کو اپنے پاؤں تلے روندتا شہر کی جانب بھاگ نکلا۔

مائیکل اینجلو

فلورینس سے آئے اینجلو کو پھر پانچ سال ہو چلے تھے۔ وہ اوبنے لگا تھا روم سے!

''روم میں چہرے نہیں ملتے۔ چہروں پہ کردار نہیں ملتے۔ سب ایک ہی سے لگتے ہیں۔'' اس نے پوپ جولیئس سے کہا تھا۔

''میرے چہرے پہ تمہیں کیا نظر آتا ہے؟'' جولیئس نے پوچھا تھا۔

''ایک جلتی ہوئی موم بتی!''

جولیئس ایک وقفے کے بعد مسکرا دیا۔ اینجلو کی کڑوی باتوں کا وہ عادی تھا۔ ''ہاں میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ ان ہزاروں بے صورت موم بتیوں میں جلتی ہوئی ایک موم بتی، جنہیں لوگ عبادت کے وقت گرجے کے آلٹر پر جلا جاتے ہیں۔''

اینجلو چپ رہا...

''حیرت ہے خدا کی اتنی بڑی دنیا میں ایک چہرہ دوسرے سے نہیں ملتا اور تمہیں اپنی تصویروں کے لیے شکلیں نہیں ملتیں، ماڈل نہیں ملتے اور چار مہینے سے تم یہودہ کے لیے...''

اس کی بات ادھوری رہ گئی اور اینجلو سینٹ پیٹرز سے باہر چلا گیا۔

پوپ جولیئس اینجلو کے مزاج سے واقف تھا۔ یہ پانچواں سال تھا۔ پانچ سال سے اینجلو سینٹ پیٹرز کے سسٹین چیپل کے گنبد اور دیواروں پر پرانے اور نئے عہدنامے کے اہم واقعات منقش کر رہا تھا اور اب آخر میں جولیس، اینجلو کے ساتھ کوئی بدمزگی نہیں پیدا کرنا چاہتا تھا۔ جولیئس ثانی کو یاد تھا کہ اینجلو نے چرچ آف ہولی سپرٹ کے لیے لکڑی پر یسوع کا ''کروسیفکس'' تراشا تھا۔ تو اس کا ماڈل وہ نوجوان تھا جس کا ہولی سپرٹ مونسٹری میں اچانک انتقال ہو گیا تھا۔

وہ برمانتے Bramante نہیں تھا جو تخیل سے کردار پیدا کرتا تھا۔ اسی لیے برمانتے کے کرداروں کے خط و خال ہمیشہ ایک ہی طرز کے لگتے تھے۔ بقول میدیسی وہ ایک ہی خاندان کے لگتے تھے۔ برمانتے کو ہٹا کر اسے پھر اینجلو سے سمجھوتا کرنا پڑا تھا۔

پانچ سال پہلے جب مائیکل اینجلو روم واپس لوٹا تھا تو گھٹنوں سینٹ پیٹرز کے گنبد کے نیچے لیٹ کر آپ ہی آپ کچھ بڑبڑایا کرتا تھا۔ کچھ بولتا رہتا تھا۔ جولیئس کو اس کی ذہنی حالت پر شک ہوا تھا۔ ایک بار اس نے بہت پاس جا کر سنا تو وہ بائبل کے کچھ وعظ دوہرا رہا تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو اینجلو؟''

''اوں؟'' اس نے چونک کر دیکھا تھا پوپ کی طرف۔ ''آیتوں کی پٹیاں کھول رہا ہوں۔''

جولیئس ثانی جانتا تھا وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ان اینٹ گارے کی، چونے سے بنی ہوئی دیواروں میں وہ چہرے ڈھونڈ رہا تھا۔ یسوع کا چہرہ، مریم کا چہرہ، پطرس، یوحنا اور یہودہ کا چہرہ۔ وہ یوجن کے ہاڈماس کے پاؤں تو نظر آتے تھے، لیکن چہرے بائبل کی آیتوں میں لپٹے ہوئے تھے۔

جبرئیل کی صورت کے کئی خاکے اس نے کاغذوں پر بنائے تھے۔ جولیئس نے پوچھا تھا— ''جبرئیل کا خاکہ کیسے بنایا تم نے؟ وہ تو اس خاکی دنیا سے نہیں ہے۔''

''اس کی آواز سنی تھی۔ پرانے عہد نامے میں!''

''تو پھر خدا کی آواز بھی سنی ہوگی تم نے!'' جولیئس نے مذاق کیا تھا۔

''اس کی خاموشی سنی تھی!''

جولیئس کو یقین ہو گیا تھا، اس نے صحیح مصور کا انتخاب کیا ہے۔ ''سنکی ہے!'' اس نے ''ویٹی کن'' کمیٹی سے کہا تھا۔ ''لیکن سٹین چیپل کی شناخت صرف وہی کر سکتا ہے۔''

مریم کا ماڈل اینجلو نے اپنی ماں سے چنا تھا اور اس روز چنا تھا جس دن اس نے اپنی ماں کو ایک بانس پر پانی کے دو ڈول لٹکا کر کندھوں پر اٹھاتے دیکھا تھا۔ ایسی ہی کوئی توانا عورت ہوگی جس نے نبی کا بوجھ اپنی کوکھ میں سنبھالا ہوگا۔ آگ جلا کر جب اس کی ماں اس کے باپ کے نہانے کے لیے پانی گرم کر رہی تھی تو اس نے بہت غور سے اپنی ماں کا تمتماتا ہوا چہرہ دیکھا تھا۔ آگ کی لپٹوں کے پیچھے دہکتا ہوا، سرخ، گرم کندن کی طرح تپا ہوا چہرہ... کاغذ پر اس نے بہت سے اسکیچ بنائے تھے اس چہرے کے۔

اس رات اس نے چولہے کے پاس بیٹھی ماں سے کہا بھی تھا۔ ''تو نے یسوع کو جنم کیوں نہیں دیا؟''

''اس لیے کہ تیرا باپ مل گیا تھا۔ وہ دیکھ شراب پی کے دھت پڑا ہے۔ جا سنبھال اسے!''

اپنے باپ کو دکھانے کے لیے اس نے اسی وقت ایک گتے پر بڑا سا اسکیچ بنا کر اس کے پلنگ پر لٹکا دیا تاکہ وہ دیکھ لے کہ پینے کے بعد وہ کیا لگتا ہے۔ نیچے لکھا تھا:

''باپ اگر تو یہ نا ہوتا تو ماں مریم ہوتی!''

لیکن اس کی ماں کو وہ اسکیچ بہت پسند آیا۔ ہمیشہ اپنے پاس رکھا۔ آخر تک اس سے کہتی رہی:

''ایسا ہی ایک بت بنا دے نا باپ کا۔ بہت معصوم لگتا ہے!''

اور وہ ہمیشہ یہی کہہ کے ٹالتا رہا...

''کوئی سنگ مرمر ہی نہیں ملتا جس کا کردار میرے باپ سے میل کھاتا ہو۔''

وہ بہت سال پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں وہ بولوگنا میں رہتے تھے۔ گلی کے نکڑ کا پب اس کا مخصوص اڈہ تھا اور وہی اڈہ اس کے باپ کا تھا۔ باپ میخانے کے اندر بیٹھ کر پیتا تھا اور اینجلو بوتل لے کر پب کے

باہر آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ سامنے بیٹھے خوانچے والے سے بار بار گرم مونگ پھلیاں خرید کے کھاتا رہتا۔ خوانچے والا جتنی بار مونگ پھلی تولتا تھا کچھ دانے خوانچے سے زمین پر گر جاتے تھے اور سامنے کھڑا ایک ننگا بچہ ہر بار اٹھا کر انہیں خوانچے میں واپس رکھتا اور ایک دانہ منہ میں ڈال لیتا تھا اور پھر اگلے گاہک کا انتظار کرتا تھا۔ اسی تماشے کے لیے وہ بار بار مونگ پھلی خریدتا تھا۔ اس بچے کے بہت سے خاکے بنائے تھے اس نے اور کئی سال بعد جب ''میڈونا آف برجیس'' کا بت بنایا تو ننھے یسوع کے لیے اس بچے کا ماڈل استعمال کیا تھا۔ چھوٹا سا ننگا یسوع!

وہی دن تھے جب پہلی بار مائیکل اینجلو کو پوپ نے سینٹ پیٹرز کے سٹین چیپل میں پرانے اور نئے عہد نامے کی تمثیلیں منقش کرنے کے لیے کہا تھا۔ اینجلو صرف اس لیے ملاقات کو روم پہنچ گیا تھا کہ اٹلی کا ہر مصور اور سنگ تراش اس کام کے لیے اپنی جان دھڑکی بازی لگانے کو تیار تھا۔ تواریخ میں لافانی ہو جانے کے لیے یہ ایک کام ہی کافی تھا۔ لیکن مائیکل اینجلو کو لافانی ہو جانا کافی نہیں تھا۔ اس فانی زندگی کے لیے بھی اس کی کچھ شرائط تھیں اسے سنگ مرمر کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ پوپ جولیئس ثانی نے وعدہ تو کیا۔ لیکن رقم نہیں دی۔

''تمہیں پتھر سے کیوں اتنا لگاؤ ہے؟ رنگوں سے کیوں نہیں؟''

''رنگ دوسروں سے مل کے اپنا رنگ چھوڑ دیتے ہیں۔ بدل جاتے ہیں۔ سنگ مرمر ایسا نہیں کرتا۔''

اور اب وہ رنگوں سے بھی اتنا ہی اوب گیا تھا جتنا روم سے!

چار مہینے گزر چکے تھے۔ چیپل کی نقاشی اب آخری حصے تک آ گئی تھی۔ وہ عیسیٰ کا ''لاسٹ سپر'' منقش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ہر بار اس کا تخیل ایک ہی چہرے پر آ کر خالی ہو جاتا تھا۔ یہودہ! عیسیٰ کا تیرہواں شاگرد جس نے سونے کے تیس ٹکڑوں کے لیے اپنے پیر و مرشد کو رومیوں کے حوالے کر دیا۔ صلیب پر چڑھوا دیا۔

چولیئس ثانی کی بے تابی بھی بڑھنے لگی تھی۔

اینجلو بھی سارا سارا دن کاغذ کالے کرتا رہتا۔ پرانے اسکیچ نکال کر انہیں پھر ولتا، ان پر کام کرتا، لیکن کسی چہرے سے تسلی نہ ہوتی۔

اور ایک دن اچانک روم کے ایک چھوٹے سے گندے پب میں اسے یہودہ مل گیا۔ ضرورت سے زیادہ چمکدار آنکھیں، عجلتی، پھرتیلا، بار بار ادھر ادھر تھوکتا تھا۔ عمر سے پہلے ہی پیشانی چوڑی ہو گئی تھی۔ بولتا تھا تو الفاظ اتنی تیزی سے نکلتے تھے جیسے جیب پھٹنے پر سارے سکے ایک ساتھ گر پڑیں۔ ایک دینار کی ریزگاری لینے آیا تھا اینجلو کے پاس اور اس کی بوتل کا حصے دار بن بیٹھا۔ اینجلو جب باہر نکل رہا تھا تو وہ کسی اور سے دینار کی ریزگاری مانگ رہا تھا۔

اینجلو اسے اپنے ساتھ چیپل میں لے آیا سودا طے کرنے اور اسے بتایا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اسے یہودہ کی شکل میں نقش کرنا چاہتا ہے۔ وہ لافانی ہو جائے گا۔ اسے چادریں اٹھا اٹھا کر ساری دیواریں اور

چھت دکھائی۔ وہ حیرت زدہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر اپنی اس خدمت کے لیے ایک اچھی خاصی رقم کا مطالبہ کیا جو اینجلو دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ پھر اس نے کچھ رقم پیشگی چاہی۔ اینجلو نے وہ بھی دے دی۔ وہ کچھ روز باقاعدگی سے آتا رہا چیپل میں۔ اینجلو اسے بیٹھک کے لیے بلاتا تھا۔ ایک روز اینجلو کے پرانے اسکیچ پھرولتے ہوئے اس نے 'بولوگنا' کے بچے کے بارے میں پوچھا...

''یہ بچہ کون ہے؟''

''بولوگنا میں رہتا تھا۔ بہت سال پہلے کی بات ہے۔ اسے ننھے یسوع کی صورت دی تھی میں نے۔''

''اس کا نام یاد ہے تمہیں؟''

''ہاں۔ مارسولینی۔''

وہ آدمی مسکرایا۔ اس نے اپنی قمیض کی آستین اٹھائی۔ بانہہ پر کھدا ہوا نام دکھایا:

مارسولینی

''میں وہی یسوع ہوں جسے تم یہودہ نقش کر رہے ہو!''

گریہ

اندھیرے میں کوئی چپکے چپکے رو رہا تھا۔ رونے کی آواز سے میری نیند ٹوٹ جاتی تھی اور اکثر یوں بھی ہوا کہ وہ سوتی رہتیں اور میں نیم خواب کی کیفیت میں دیکھتا کہ ان کے آنسوؤں سے ایک سرخ دریا بن گیا ہے جس کی خوفناک موجیں چیختی چنگھاڑتی میری طرف دوڑتی چلی آ رہی ہیں اور پھر یاقوت رنگ پانی سر سے اونچا ہو جاتا۔ میری سانسیں گھٹنے لگتیں اور عنکبوتی اندھیرے میں میرے دیدے پھیل جاتے۔ وہ مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتیں اور گجر بجنے تک قل پڑھ کر مجھ پر دم کرتی رہتیں۔ میرے دوبارہ سونے تک ان کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا— سویرا ہوتے ہوتے میں رات کا خواب بھول جاتا— مگر اس دن ایسا نہیں ہوا تھا۔ پیلی آندھی کے غبار میں سب کچھ کھو گیا تھا۔ انہوں نے ڈیوٹ پر رکھا چراغ جلا کر اس کی لو بڑھا دی تھی۔ رات کا خواب مجھے رہ رہ کر خوفزدہ کر رہا تھا اور میں شاخ سے ٹوٹے ہوئے تنہا پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ انہوں نے میری حالت غیر ہوتے دیکھ کر سنتری کو جلدی سے حافظ جی کے پاس روانہ کیا۔ جو عامل بھی تھے اور زائچہ کھینچ قسمت کا حال بتاتے تھے۔ ویسے وہ شغل کے طور پر اپنے حجرے میں بیٹھ کر بچوں کو قرآن شریف حفظ کراتے تھے۔ وہ گنڈے تعویذ کے علاوہ جراحی کے کام میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے اور جب کسی کا ناسور لاعلاج ہو جاتا تو وہ چنکی بجا کر اپنی آنکھوں کے پانی سے اعجاز مسیحائی کا کرشمہ دکھاتے۔

حافظ جی ہرکارے کیساتھ جلد آ گئے۔ انہوں نے چینی کی شفاف رکابی پر زعفران کے پانی سے زائچہ کھینچا۔ عربی میں "**ھوالشافی اللہ کافی**" رقم کیا اور زعفران کا پانی گھول کر میرے منہ میں انڈیل دیا اور اضطراب کی حالت میں اللہ خیر اللہ خیر کا ورد کرتے گردن جھکائے واپس چلے گئے۔ اُس دن انہوں نے کسی بھی طرح کی ضیافت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حد یہ ہے کہ دودھ اور الائچی کا شربت بھی نہیں پیا تھا۔

مجھے خیال پڑتا ہے ہمارے گھر کے دروازے پر ٹاٹ کا مضبوط پردہ پڑا رہتا تھا۔ گھر کا آنگن کچا ہوتے ہوئے بھی بہت بڑا تھا۔ بارش کے دنوں میں ہمارا آنگن پانی سے بھر جاتا۔ اماں بار بار مجھے آنگن میں جانے سے روکتیں۔ مگر مجھے بارش میں بھیگنا اور کاغذ کی کشتیاں بنا کر پانی میں چھوڑنا اچھا لگتا تھا۔ بارش سے پہلے اکثر ہمارے گھر کی کعبۂ رخ فصیل پر ایک سبز پرندہ آ کر بیٹھ جاتا اور میری ماں اور وہ خاموش نگاہوں کے ساتھ ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے۔ اماں کو پرندوں، پیڑ، پودوں اور پھولوں سے بڑی رغبت تھی۔ شاید اس کے گھر کے آنگن میں جامن، انار، شہتوت اور امرود کے درخت ایستادہ تھے۔ چنبیلی کا اکلوتا پیڑ بھی تھا جس پر رات بھر شبنم برستی رہتی اور صبح ہونے تک سفید پھولوں سے سارا آنگن پٹ جاتا۔ اکثر سفید

پھولوں کے آویزے میری ماں کے کانوں میں جھولتے رہتے۔ آنگن کی دیوار کے سہارے ایک چھوٹا سا سائبان تھا۔ جہاں سرخ اینٹوں کی گھڑونچی بنی ہوئی تھی۔ جس پر کوری مٹی کے گھڑے رکھنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ گرمیوں میں گھڑوں کو سرخ رنگ کے کپڑے سے باندھ دیا جاتا اور اُن کی پیندیوں کے نیچے خس کی بھیگی شاخیں بچھا دی جاتیں، ٹھنڈا اور خوشبودار پانی پی کر آب زم زم کی یاد تازہ ہو جاتی— چنبیلی کے منڈوے تلے میں رات کے اُترنے کا انتظار کرتا۔ جہاں مونجھ کی چارپائی پر میں تاروں بھرا آسمان دیکھتے دیکھتے ماں کی نرم آغوش میں سما جاتا اور نیند کے رتھ پر بیٹھ کر سبز پری کی تلاش میں کھو جاتا۔

پولس کوتوالی سے ملحق ہمارے گھر کے بالکل سامنے کے رُخ شاہجہانی مسجد کے بلند و بانگ نقرئی مینار جلوہ افروز رہتے، جن کے خوشنما کنگوروں میں سید کبوتر سایہ فگن رہتے اور اذان ہوتے ہی وسیع و عریض حوض پر نمازیوں کے ساتھ وضو کرتے ہوئے دیکھے جاتے۔ جہاں ابن بطوطہ نے صدیوں پہلے آنکھوں آنکھوں میں رات بسر کی تھی۔

مسجد کے عقب میں ایک قدیمی مدرسہ قائم تھا۔ جہاں صبح سویرے ملتانی مٹی سے پتی ہوئی تختی اور سفید اور کالی روشنائی کا لور کا لیکر میں بے دلی سے چٹائی پر جا کر بیٹھ جاتا۔ بوڑھے قد کے جھلا سے شاستری جی ہاتھ میں تجی لیے ہوئے گول پتھر کے چبوترے پر بیٹھے حقہ گڑگڑاتے رہتے۔ جب ذرا مزے میں آتے تو چبوترہ چھوڑ کر چاک ہاتھ میں پکڑتے اور کالے تختے پر لکھ دیتے ''رہے نام اللہ کا'' جسے ہم حروف کی آڑی ترچھی لکیریں بنا کر سرکنڈے کے قلم سے اپنی تختیوں پر لکھنے کی مشق کرتے رہتے۔ بعد میں اڈھے، ڈیوڑھے اور ڈھائی کے پہاڑے یاد کراتے اور خود گھنٹی بجا کر چھٹی کا اعلان کر دیتے۔ سبھی گھروں سے ان کا کھانا بندھا ہوا تھا۔ چھٹی ہوتے ہی وہ دسترخوان بچھاتے اور کان میں جنیئو اڑستے ہوئے بسم اللہ کہہ کر ماحضر تناول فرماتے۔ مٹی کے کوزے میں صراحی کا ٹھنڈا پانی انڈیلتے، گلاتر کرتے اور وہیں چٹائی پر قیلولہ کے لیے دراز ہو جاتے۔ عصر کی اذان پر اُن کے کان لگے رہتے کہ یہ وقت اُن کے اشنان کا ہوتا تھا۔ شام کو وہ مسجد کی سیڑھیوں پر دیکھے جاتے۔ راتوں کو وہ اکثر عشائیہ کے بعد حافظ جی کے ٹھئے پر گنجفہ کھیلتے ہوئے نظر آتے جہاں لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی اور پیچوان کا خمیرہ مہکتا رہتا۔

دادا، اپنے وقتوں کے پرانے سپاہی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ نجیب آباد کے قلعہ سے ڈاکو کو گرفتار کرانے میں انہوں نے انگریز افسر نیگ صاحب کی مدد کی تھی اور وکٹوریا کراس سے سرفراز ہوئے تھے— ابھی ریخیں بھی نہیں پھوٹی تھیں کہ دادا نے ابا کو پولیس میں بھرتی کرا دیا۔ اس وقت سولہ برس کے تھے اور انہوں نے مڈل پاس کیا تھا۔ ابا جب پولیس میں بھرتی ہوئے تو بہت روتے تھے۔ اُنہیں اپنا گاؤں بکھریا اور بوا بہت یاد آتی تھیں۔ وہاں کے باغ بغیچے کھیت کھلیان ندی نالے نہریں اور تالاب اُنہیں بلاتے تھے۔ بھیڑ بکریاں، گائیں بھینسیں، بیلوں کی جوڑیاں، رتھ اور بیلی سبھی کچھ وہ گاؤں میں چھوڑ آئے تھے اور بڑکا وہ بوڑھا درخت بھی جس کی چھاؤں میں انہوں نے اپنا بچپن اور لڑکپن گزارا تھا اور اکھاڑے کی بھربھری مٹی جہاں

بچپن ماموں کے ساتھ انہوں نے ڈنڈ بیٹھک لگانا سیکھے تھے اور وہ میلوں ٹھیلوں کے دنگل بھی جہاں انہوں نے لنگر گھما کر کشتیاں جیتی تھیں اور نام کمایا تھا۔

اُن کی شہرت صندل کی خوشبو کی طرح جب چہار دانگ پھیلی تو ان کی کشتی دانی سے خوش ہوکر ہمارے نانا نے انہیں اپنی فرزندی میں لینا قبول کرلیا تھا جن کے بارے میں مشہور تھا کہ اپنی جوانی کے زمانے میں انہوں نے گڑ سے بھری ہوئی گاڑی کو اپنی پشت پر اٹھالیا تھا۔

ابا تفتیشوں میں اور اماں نمازوں میں کھوئی رہتیں۔ ابا کوتوالی سے کب گھر آتے اور کب جاتے، یہ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ تیج تیوہار کے موقعوں پر میرے ابا مجھے پولیس کی گاڑی میں گھمانے لے جاتے تو سڑک پر چلتی بھیڑ رک جاتی۔ دوکاندار کھڑے ہوکر بندگی اور آداب بجالاتے، نامی بدمعاش اور چھٹے ہوئے غنڈے کنی کترا کر گلیوں، کھدروں میں چھپتے پھرتے۔ گھر میں مٹھائیوں اور پھلوں کے ٹوکروں کا ڈھیر لگ جاتا۔ اماں ان سوغاتوں پر نظر ڈالتی اور ہرکارے کے ہاتھوں محلے میں تقسیم کرادیتی۔

کبھی ابا موج میں آجاتے تو ناڈیا، جان کاؤس کی بولتی فلم دیکھنے کے لیے سپاہی ساتھ کردیتے جو ہمیں یکے میں بٹھا کر سنیما لے جاتا۔ فلم میں ناچ گانا اور لڑائی دیکھ کر میں حیران رہ جاتا۔ کبھی بجلی فیل ہوجاتی تو اگلی صفوں کے تماش بین تھیٹر کے مالک منگل سین کا نام لے کر زور زور سے گالیاں بکتے اور بجلی آتے ہی منہ سے سیٹیاں بجا کر تانبے کے سکے پھینک کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے۔

اماں کو بس محفل سماع سے دلچسپی تھی۔ سنا ہے کہ ریلوے لائن کے متوازی بابا برچھی بہادر کے سالانہ عرس میں اماں شریک ہوتیں جہاں بیٹھ کر وہ قوالیاں سنتیں۔ پردے کا معقول انتظام رہتا۔ حبیب قوال سے سلطان جی کے چہیتے خسرو کا قول ترانہ سن کر محفل وجد میں آجاتی۔ اماں پھولوں کی چادر چڑھاتیں، نذر نیاز گزارتیں اور میری انگلی تھام کر گھر آجاتیں۔ قوالی کی اس محفل میں میں نے شاستری جی، حافظ سمیع الدین اور مکھن والے صوفی جی کو دیکھا تھا۔ اکثر شاستری جی کو حال آجاتا اور رقص بسمل شروع کردیتے۔ انہیں سنبھالنے والوں میں حافظ جی اور مکھن والے صوفی جی پیش پیش رہتے۔

شام کو میں اکثر دروازے پر کھڑے ہوکر چلتی ہوئی سڑک کا منظر آنکھوں میں اُتارتا رہتا۔ سڑک پر ڈھکیلیں اور ڈولیاں چلتی تھیں جن میں پردے دار بیبیاں بیٹھتی تھیں۔ ایک آدھ یکا تانگہ بھی ناہموار سڑک پر کھڑکھڑاتا ہوا گزر جاتا۔ ہمارے گھر کے نکڑ میں سامنے والی اٹاری میں پرکاش رہتا تھا۔ جس کے ساتھ خالی وقت میں کنچوں سے کھیلنا میرا شغل تھا۔ وہ اتنا کم بولتا تھا کہ مدرسے کے سبھی لڑکے اُسے گونگا کہہ کر چڑاتے تھے۔ مگر اس کی کم گوئی کی عادت مجھے بہت بھاتی تھی— اٹاری کے جنگلوں کے پیچھے سیاہ لباس میں ایک عورت نظر آتی تھی۔ جو کبھی ہنستی تھی اور کبھی روتی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اکثر اشاروں سے بلاتی۔ جہاں تک میرا قیاس جاتا ہے وہ ہو نہ ہو، پرکاش کی ماں تھی۔

کوتوالی کے باہر پیٹھ کا بازار لگتا تھا۔ جہاں سبزیاں ترکاریاں کوڑیوں کے مول بکتی تھیں۔ حلیم اور

بریانی کی دیگیں اہتمام سے سجائی جاتیں۔ یہیں بھگوان داس کے دہی بڑے بھی ملتے تھے۔ سلام سوڈے والے کی دوکان تھی جہاں میمن سودے کی بوتل دو پیسے میں آتی تھی۔ بوتل کے اندر شیشے کی گولی ہوتی تھی جسے انگوٹھے سے دبا کر کھولا جاتا تھا۔ عبدالرحمٰن جلیبی والے کی دوکان سے ایک پیسے میں دونہ بھر جلیبی آتی تھی۔ بازار کی سیر کو میں جب بھی جاتا، پرکاش میرے ساتھ ہولیتا۔ اپنی طرح میں نے اسے بھی چٹورا بنا دیا تھا۔ کھانے پینے کی سبھی چیزیں مفت ملتی تھیں۔ پیسے دو تب بھی کوئی نہیں لیتا تھا۔ ابا کی سارے علاقہ میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی—

مجھ پر عجیب اضطراب کا عالم تھا۔ کئی دنوں سے پرکاش دکھائی نہیں پڑا تھا۔ وہ مدرسے سے بھی غیر حاضر تھا۔ شام کے جھٹپٹے کی ایک خاص ساعت میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا میں اوپر چڑھ گیا۔ اس کے نرخرے سے آتی ہوئی آوازوں پر مجھے گمان ہوا جیسے اسے کوئی ذبح کر رہا ہے۔ جنگلے والی عورت اس کے سر پر ٹھنڈی پٹیاں بدل رہی تھی۔ اندر کے کمرے میں کوئی تلاوت کر رہا تھا۔ جب میں واپس جانے کے لیے اٹھنے لگا تو میں نے ایک ادھیڑ عمر شخص کو باہر آتے دیکھا جس کے جھاڑ جھنکاڑ سر پر پھندنے والی ترکی ٹوپی ٹکی ہوئی تھی۔ انگے پیجامے اور چاک گریباں ڈوری کے کرتے میں اس کی ہیئت کذائی دیکھتے بنتی تھی۔ منہ سے پان کی پیک بہتی ہوئی پیلے ملگجی کرتے پر شفق رنگ لالی پھیلا رہی تھی۔ اگر یہ مکھن والے صوفی جی تھے تو ان کے ماتھے پر چندن کا ٹیکا کیوں لگا ہوا تھا۔ کیا انہوں نے شاستری جی سے اپنی جون بدل لی تھی؟ عجب ماجرائی کیفیت تھی کہ خواب اور حقیقت میں امتیاز کرنا دشوار ہو رہا تھا۔

اکثر وہ مجھے اپنے بڑے سے گھر میں لے جاتی جس کی اوپری منزل میں گول کمروں کی بھول بھلیاں تھی۔ وہ کسی ایک کمرے میں چھپ جاتی اور جب میں اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک جاتا تو وہ دھیمی آواز ہنستے ہوئے کہتی۔ فیاض ہم یہاں ہیں اور جب کسی طرح میں آواز کا تعاقب کرتا ہوا عود و عنبر میں بسے کمرے تک پہنچتا تو وہ ''ہا'' کی آواز کر کے مجھ سے لپٹ جاتی۔ میں خود کو چھڑانے کی جس قدر کوشش کرتا وہ اسی قدر زور سے مجھے بھینچتی کہ میری پسلیاں چیخ جاتیں— جب ہم دونوں بھول بھلیاں سے باہر آتے تو اس کا چہرہ گلنار ہو جاتا اور وہ نظریں جھکا لیتی— میں تقریباً کھسیانہ ہو کر کہتا۔ میں تمہارے ساتھ نہیں کھیلوں گا۔ اب مجھے جانے دو۔ ورنہ بابو جی کو تمہاری شیطانی بتا دوں گا۔

''ہاں جاؤ بتا دو، مگر یاد رکھنا، میں بھی تمہیں مکھن کی ٹکیا نہیں دوں گی۔''

ایسے ہی تکرار کے ایک دن میں نے بابو جی کو دیکھا تھا۔ جو صوفی جی کے نام سے جانے جاتے تھے اور جن کا گائے چھاپ مکھن ہمارے شہر میں مشہور تھا۔

کوتوالی کی بڑی میز پر کرسی ڈالے اٹھی ہوئی مونچھوں والے کوتوال شہر بیٹھتے تھے۔ ان کا چہرہ بیر بہوٹی کی طرح سرخ تھا۔ وہ ہونٹوں میں چرٹ دبائے انجن کی طرح دھواں نکالتے رہتے اور ان کے گھوڑے کا سائیس ان کی ٹانگیں دباتا رہتا۔ میں نے انہیں بہت کم بولتے دیکھا تھا— پولیس کے اہلکار روزنامچہ لیے

مودّب کھڑے رہتے اور آنے جانے والے ملزموں کا احوال ان کے گوش گزار کرتے رہتے۔ وہ پورے صوبے کے اکیلے ناخواندہ انسپکٹر تھے۔ کبھی کوئی انگریز افسر معائنہ کے لیے آتا تو خوشدلی کے ساتھ ان سے ہاتھ ملاتا۔ انہوں نے آمنے سامنے کی لڑائی میں ایک آدم خور شیر کو مار گرایا تھا۔

ایک دن میں سو کر اٹھا تو میں نے دیکھا لمبی کرسی پر ان کی جگہ کوئی اور بیٹھا ہوا تھا۔ میں جلیبی کی ہٹک میں عبدالرحمٰن جلیبی والے کی دوکان پر جا رہا تھا۔ ابھی میں کوتوالی کے پھاٹک تک ہی پہنچا تھا کہ پہرے دار اور سپاہی نے مجھے ڈپٹ کر آنے جانے سے روک دیا۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔ میں نے بس زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ وہ مجھے سمجھا بجھا کر گھر چھوڑ گیا۔ اماں مصلّی پر بیٹھی ہوئی فی امان اللہ کا کا ورد کر رہی تھیں۔

اُس دن میں بہت رویا اور روتے روتے کب سو گیا مجھے یاد نہیں۔ شام کو اندھیرا ہوا تو میری آنکھ کھل گئی۔ اماں نے لالٹین جلا دی تھی جس کی چمنی کا بڑا حصہ دھوئیں سے کالا پڑ چکا تھا— کوتوالی والے گھر کی ایک کھڑکی سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ میں نے کھڑکی کے جنگلے سے سر لگا کر دیکھا۔ ہو حق سناٹا تھا۔ سڑک ویران پڑی تھی۔ مسجد کی سیڑھیاں سونی نظر آ رہی تھیں۔ دور دور تک نمازی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ حالانکہ اذان کی آواز میرے کانوں میں گونجی تھی۔

ابا جب بہت دیر تک کوتوالی سے نہیں لوٹے تو میں اماں سے اجازت لیے بغیر نکل کھڑا ہوا کہ ابا کو دیکھ آؤں آخر وہ کس حال میں ہیں۔ میں بلی کی طرح آہستہ آہستہ پنجوں کے بل گھر سے باہر نکلا۔ ہنڈے کی ملگجی روشنی ہانپ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی کالی بارش میں بدل چکی تھی۔ ہنڈے کی دم توڑتی ہوئی روشنی میں دکھائی پڑا کہ کوتوالی کے صحن میں کچھ لوگ پانی میں پڑے بھیگ رہے تھے۔ حوالات میں لوگوں کا اژدحام تھا۔ اندر سے عجب سی پراسرار آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے انہوں نے عفریت دیکھ لیا تھا اور اسے دیکھکر ڈر گئے تھے۔

نزدیک جا کر میں نے دیکھا۔ اوندھے منہ پڑے لوگوں کے چہرے دکھائی نہیں پڑ رہے تھے۔ مجھے دھیان پڑتا ہے کچھ لوگوں کے چہرے تھے ہی نہیں۔ دھڑ سے ان کے سر غائب تھے۔

میں تیزی سے دوڑتا ہوا کوتوالی سے باہر نکل گیا۔ کسی انجانے خوف سے میرا دل کبوتر کی طرح لرز رہا تھا۔ گہرا سناٹا میرے قدموں کی آواز سے شکست ہو رہا تھا۔ سامنے نظر آنے والی اناری سونی پڑی تھی۔ مجھے لگاوٹ سے اشارے کرنے والی عورت غائب تھی۔ تو پھر پرکاش کا کیا ہوا؟ ہر سوال تشنہ کامی کی حدوں کو چھوتا ہوا میرا منہ چڑا رہا تھا۔ مکھن والی بلڈنگ ہیبت ناک سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا بھول بھلیاں تک جا پہنچا۔ اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے میں نے آواز لگائی۔ تم کہاں ہو تم کہاں ہو۔

''ڈھونڈ سکو تو ڈھونڈ لو۔ ہم یہاں ہیں۔ ہم یہاں ہیں۔'' تلاش میں ناکام ہو کر بیحد سراسیمگی کے عالم میں میرے قدم خود بخود مدرسے کی طرف اٹھتے گئے۔ اور پھر وہ خونچکاں منظر دیکھ کر میرا دل دہل گیا۔ شاستری جی کا سر، خوان پوش میں سجا رکھا تھا اور حافظ جی اور مکھن والے صوفی جی گریہ میں مصروف تھے۔

سامنے سیاہ تختے پر تحریر تھا۔ رہے نام اللہ کا۔

ناصرہ شرما

کنیز بچہ

انار کے پیڑ کے اوپر دھوپ اتر آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا بڑی بیگم کے ناشتے کا وقت ہوگیا تھا۔ بوا نے دلیا سینی میں رکھی اور تیزی سے باورچی خانے سے نکلی۔ بڑی بیگم کے تیوری پر بل پڑ گئے، جب انہوں نے ابلی دلیا میں دودھ پڑا دیکھا۔

''اے بی بی، یہ بھی کوئی ناشتہ ہوا۔ مجھے تو ڈاکٹر کو دکھا کر اچھا خاصا مریض بنا دیا۔ یہ چار دن خوشی سے جیتی اس کو بھی احمد میاں نے چولھے میں جھونک دیا... لے جاؤ، مجھے ناشتہ نہیں کرنا ہے۔''

''یوں خفا نہیں ہوتے، بڑی بیگم۔ آخر احمد میاں کو آپ کی جان پیاری ہے، تبھی تو تلی چیزوں کی مناہی ہے۔ ورنہ ان کو آپ سے کیا دشمنی ہوگی۔'' بوا نے ان کا دفاع کیا۔ مگر بڑی بیگم نے تو جیسے چمچ اٹھا کر منہ میں دلیا ڈالنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ بوا تھک ہار کر دلیا اٹھا کر کمرے سے نکل آئیں۔

بات کہاں چھپنی تھی، فوراً جنگل کی آگ کی طرح گول کمرے تک پھیل گئی، جہاں احمد میاں بیٹھے وکیل کے ساتھ حساب کتاب، زمین جائیداد کا مسئلہ طے کر رہے تھے۔ اس خبر سے ایک دم سے جھلا گئے۔ مگر خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔

کام نپٹتے ہی بس سیدھے امی بیگم کے کمرے میں پہنچے اور پلنگ کے پاس رکھی کرسی پر جا بیٹھے۔ پہلے ماں کے چہرے کو غور سے دیکھتے رہے، پھر یکا یک طیش میں آکر بولے ''امی بیگم، آخر آپ کیا چاہتی ہیں میری موت یا... کیوں نہیں ناشتہ کیا آپ نے؟ رات غصہ تھیں تو کھانا نہیں کھایا اور اب فاقہ کر کے آپ کیا ثابت کرنا چاہتی ہیں؟ کھانا نہیں کھائیں گی تو دوا کیسے کھائیں گی؟''

''تم تو ہر دم غصے میں رہتے ہو۔ کبھی ماں کی پریشانی سمجھو، نہیں اترتی حلق سے یہ سانی۔ میں کوئی شبن جلاہے کی گائے نہیں ہوں، بڑی بیگم ہوں جس کے آگے خاصے لگتے تھے۔ کئی طرح کے حلوے، روغنی نکیا، سبزی، آنولے کا مربہ، دودھ مکھن اور جانے کیا کیا الم غلم۔ اب تو مجھے یاد بھی نہیں مگر تمہارے راج میں مجھے یہ دن دیکھنے پڑ رہے ہیں۔''

''اُف! امی بیگم، بس میرے صبر کو مت آزمایئے۔ کہیں آپ کے بلڈ پریشر کو کم کرنے کی کوشش میں میرا بریں ہیمریج نہ ہو جائے۔ یا خدا اب مجھے بخش دے''

ماں بیٹے کی یہ نوک جھونک روز اسی طرح صبح، شام، دوپہر کسی وقت بھی شروع ہو جاتی تھی۔ ان کے بیچ میں کافی دنوں تک احمد کی بیوی زلیخا پستی رہی۔ مگر کوئی حل نہیں ڈھونڈھ پائی تو تنگ آکر ایسے موقعوں پر

کانوں میں روئی ٹھونس لیتی تھی۔ تینوں بچے بھی اس جھنجھٹ میں نہیں پڑتے تھے اور الگ تھلگ اس کی طرفداری کرتے تھے جس کے سامنے پڑتے تھے۔ باپ کے سامنے دادی بیگم میں برائی اور دادی بیگم کے سامنے ابو جانی میں۔ اسی لیے سبھی بچوں کو دلار کرتے اور ان کی منہ مانگی فرمائشیں پوری کرتے تھے۔

''للہ! آپ ذرا دھیمے بولیں۔ دوسرے کمرے میں ذکن میاں کی صاحب زادی بیٹھی تھیں۔ آپ کو تو ذرا بھی خیال نہیں۔ مجھ پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔'' گھبرائی سی زلیخا کمرے میں داخل ہوئی۔

''یہ لو ان کی باتیں سنو۔ مولوی صاحب بن کر آموختہ پڑھانے آئی ہیں۔ یہ کرو وہ نہ کرو۔ جانتی ہو تمہارے میاں کو میں نے ہی پال کر بڑا کیا ہے۔''

''امی بیگم! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔'' روہانسی سی زلیخا الٹے پاؤں لوٹ گئی۔

تھوڑی دیر بعد بوا دلیا پھر لے کر آئیں۔ بڑی بیگم نے آنکھیں مینچیں۔ مگر احمد نے بڑھ کر پیالہ اٹھایا۔ بوا نے تولیہ پھیلائی اور بیٹے نے چمچ پر دلیا ماں کی منہ میں ڈالی۔ بڑی بیگم مسکرائیں پھر پیالہ ہاتھ میں لیکر خود ہی کھانے لگیں۔ اس بیچ کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ دلیا کھا کر سینے پر پڑی تولیہ سے منہ پونچھا پھر بولیں۔

''اللہ بخشے تمہارے ابا بنا انار کے شربت کے بستر نہیں چھوڑتے تھے۔'' کیا کیا زمانے ان آنکھوں نے نہیں دیکھے۔ پھر سونے کے ورق میں لپٹا آنولہ کھاتے تھے۔ چلغوزے کے بغیر چائے پینا انہیں کہاں بھاتا تھا۔''

''امی بیگم، خدا کے واسطے آپ رویئے گا نہیں۔ مرحوم ابا جانی کو یاد کر کے میں بہت پریشان ہوں۔ اس طرح کی جذباتی باتوں سے آپ مجھے اور پریشان نہ کریں۔ اب اجازت دیں میں چلتا ہوں۔ پھر حاضر ہوں گا۔'' اتنا کہہ کر احمد اٹھے اور کمرے سے نکل گئے۔

دوپہر کی دھوپ پورے آنگن میں پھیل گئی تھی۔ تینوں بچے اسکول سے جلد لوٹ آئے تھے۔ دھوپ میں بچھے تخت پر بیٹھے۔ گرم گرم تہڑی کھا رہے تھے۔ ہری دھنیا کی چٹنی کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ بڑی بیگم کو تہڑی بہت پسند تھی۔ اس وجہ سے اکثر دوپہر میں بوا، انہیں خوش کرنے کے لیے تہڑی پکاتی تھیں۔ کھلے چاؤں کے بیچ آلو اور ہری مٹر کا جلوہ تھا۔ بڑی بیگم بچوں کے بیچ میں بیٹھیں بہت خوش دلی سے کھانا کھا رہی تھیں۔ زلیخا دوسری طرف پلنگ پر بیٹھی پان کی گلوریاں بنا رہی تھیں۔ احمد کے پاس تحصیل دار آئے ہوئے تھے۔ چائے پانی چل چکا تھا۔ اب ہری جھنڈی دکھا کر انہیں وداع کرنا تھا۔

احمد جب گھر میں گھسے تو ان کے چہرے پر عجیب تمتماہٹ تھی۔ میاں کا چہرہ دیکھتے ہی زلیخا تاڑ گئی کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ بات کریدتی نہیں ہے۔ خاموش رہ کر ان کی منشا لیتی۔ اس وقت سمجھ گئی کہ وہ کوئی بات اکیلے میں کہنا چاہتے ہیں۔ سو پلنگ سے اُتر کر وہ سیدھے کمرے کی طرف بڑھی۔ احمد بھی سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ کمرے میں پہنچ کر انہوں نے نک ٹائی ڈھیلی کی اور بستر پر ادھ لیٹے سے پسر گئے۔

''بڑا برا ہوا۔ شبیر یہاں کلکٹر بن کر آ گیا ہے۔''

''اچھا''

''جائیداد میں برابر کا دعویٰ تو اس نے پہلے کیا ہی تھا اب تو سینے پر چڑھ کر اپنا حق حاصل کرلے گا۔''

''ٹھیک ہے''

''اماں کو پتہ چلا تو قیامت آجائے گی۔ میں تو آدھا حصہ دینے کو تیار ہوں۔ مگر اماں بھی یہ سن کر مجھے کچا چبا جائیں گی اور یہ گھر سر پر اٹھالیں گی۔ باہر شبیر ایسی کی تیسی کر ڈالے گا۔''

''وہ تو ہے''

''پتہ نہیں ابا جانی کو یہ دوسری شادی کی کیا سوجھی تھی۔''

''مرے ہوئے انسان کے بارے میں کچھ کہنا مناسب نہیں ہے۔''

''کیا کروں، کیا نہ کروں۔ تم کچھ رائے دو۔''

''میں تو آپ کی ہم خیال ہوں۔ آدھی جائیداد اس کو دے دیں اور امی بیگم سے اس کا ذکر نہ کریں۔''

''رائے تو مناسب ہے اور اسی میں ہماری خیر ہے۔''

''اٹھئے، کھانا کھالیجئے۔''

''ہاں کھا کر تھوڑی دیر آرام کروں گا۔ سر میں بہت درد ہے۔''

□

شام کا جھٹپٹا تھا۔ تبھی تو رکشے دروازے پر آکر رُکے۔ ان میں سے دو عورتیں اور چار بچے اُترے۔ یہ بڑی بیگم کے میکے کے طرف کے لوگ تھے۔ دور کے رشتے میں چچا کی لڑکیاں تھی۔ ان کو بھی شبیر کے بارے میں پتہ چل گیا تھا۔ انہوں نے ایسے نازک موقعے پر پہنچنا ضروری سمجھا اور جاتے ہی بڑی بیگم سے لپٹ کر رونے لگیں۔ بڑی بیگم کے اوسان خطا کہ کوئی مرتو نہیں گیا جو دونوں آتے ہی لپٹ کر رونے لگیں؟

''ارے کچھ بولو بیبیو! آخر ہوا کیا ہے؟ ضرورت پڑنے پر دو بوند تو میں گرا ہی سکتی ہوں۔''

''ارے باجی کیا کہیں آپ سے۔ جب سے سنا ہے دل کو کسی طرح قرار نہیں۔ تب سے شمو، سے کہہ رہی تھی کہ چلو باجی سے ملکر آتے ہیں۔ کچھ کرنہیں سکتے ہیں تو کیا باجی کو دو بول کہہ کے دلاسہ نہیں دے سکتے ہیں۔''

''ارے منہ سے بولو بھی تو کچھ۔''

''باجی یہ ٹھیک نہیں کررہے ہیں احمد میاں! جو دلہا بھائی کی جائیداد بانٹ کر آدھا حصہ اس کنیز بچے کے سپرد کررہے تھے۔'' شمو نے آخر منہ کھول ہی دیا۔

''میرا کلیجہ یہ سوچ سوچ کر منہ کو آتا ہے کہ آپ نے دولہا بھائی سے کیسی کیسی لڑائیاں اس سلسلے میں کیں، مگر اس منحوس مردار کو گھر کی ڈیوڑھی لانگھنے نہیں دی مگر یہ پڑھی لکھی سرپھری اولادیں جو نہ کرادیں تھوڑا ہے۔'' صفو نے ململ کے کرتے سے آنکھ ناک کا پانی پونچھا اور شال برابر کرنے لگیں۔

''کنیز بچے کی یہ مجال۔ اس موئے کا منہ جھلس کر رکھ دوں گی۔''

''ہم کو یاد ہے، باجی وہ دن جب تل کے لڈوؤں کا ڈبہ لے کر شبیر ایک بار آیا تھا کہ اماں نے بھجوایا ہے تو آپ نے اسی کے سامنے پورے کیلو بھر کا رتھ کا ڈبہ نابدان میں الٹوایا تھا۔ اس لونڈے کو بوا کی چارپائی پر پائینتی کی طرف بیٹھنے کو کہا تھا۔'' (صفو نے کامدار بٹوا کھول کر لونگ الائچی نکالی۔)

''مجھے اچھی طرح یاد ہے آپا کہ اس دن گھر میں ''نمونہ'' بنا تھا اور گاجر کا حلوہ۔ بوا نے سب کو بھر بھر پلیٹ دیا تھا۔ مگر اس چھوکرے کو جھوٹوں منہ نہیں پوچھا تھا۔ وہ بھی غضب کا بے حیا تھا۔ بڑے پیر کا روزہ رکھے چپ چاپ سر جھکائے تب تک بیٹھا رہا جب تک دولہا بھائی کچہری سے آ نہیں گئے۔'' شمو نے بات بڑھائی۔

''ان عورتوں کو مردوں کو ٹہلانا خوب آتا ہے۔ مگر ان کی اولادیں بھی ماشاء اللہ سونے پر سہاگہ ہوتی ہیں۔ اچھی طرح یاد ہے باجی مجھے، جیسے کل کی بات ہے جب دولہا بھائی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر پیار کیا۔'' صفو نے لمبی سانس کھینچی۔

''بچپن سے ماں کی طرح مکار تھا۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ جس کو دیکھ کر دولہا بھائی نے۔ اللہ بخشے۔ جنت میں انہیں جگہ دے۔ کیسی خونخوار نظروں سے بجو کو گھور رہا تھا۔'' شمو نے سر پر دوپٹہ پھر رکھ لیا۔

''چھوڑو بھی، مجھے وہ کیا خونخوار نظروں سے گھورتے۔ اس کنیز سے نکاح کر کے ان کے دیدوں کا پانی مر گیا تھا۔ بھلا وہ کیسے مجھ سے آنکھ ملاتے۔'' بڑی ادا سے بڑی بیگم نے کہا اور ایک خاص ادا نے صد ناز سے بہنوں کو دیکھا۔ زلیخا سر پر آنچل سنبھالتی ہوئی آئی اور دونوں کو جھک کر آداب کیا۔ اور چوکی کے کنارے بیٹھ گئی۔ بوا کچھ دیر بعد بڑی سی سینی میں ناشتہ چائے لے کر پہنچ گئی۔ زلیخا نے اٹھ کر سینی میز پر رکھی اور دونوں چچیا ساسوں کو صوفوں کی طرف آنے کے لیے کہہ کر دسترخوان لگانے لگیں۔ دونوں بہنوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور مسہری سے اٹھ کر کمرے کے کونے کی طرف بڑھیں جہاں لال مخمل کا بوسیدہ صوفہ رکھا ہوا تھا۔

''خالہ جان! امی بیگم کو بلڈ پریشر ان دنوں کچھ زیادہ ہے۔ آپ سے التجا ہے کہ ان سے کوئی ایسی بات نہ کریں جن سے انہیں طیش آ جائے۔'' آواز دبا کر ناشتہ پلیٹ میں نکالنے کے بہانے زلیخا نے جھکے جھکے صفو کے کان میں کہا۔

''کیا کھسر پھسر میرے خلاف ہو رہی ہے۔ ذرا میں بھی تو سنوں۔'' کہتی ہوئی بڑی بیگم مسہری سے اتر کر باتھ روم کی طرف بڑھیں۔

''یہ کیسی بیماری ہے جو آدمی دل کی بات نہ کرے۔ ہم نے تو سنا ہے بڑی بوڑھیوں سے کہ کہہ سن کر آدمی کو اپنا دل ضرور ہلکا کر لینا چاہیے ورنہ دل پر بوجھ رہنے سے ہارٹ فیل ہو جانے کا ڈر رہتا ہے۔'' صفو نے کاجو منہ میں ڈالا۔

''اللہ توبہ! ایسی باتیں نہ منہ سے نکالیں۔'' زلیخا گھبرا کر بولی۔

''بچے کس کس کلاس میں پہنچے؟'' شمو نے موضوع بدلا۔

''آپ کی دعا سے انور آٹھویں میں، صبیحہ اور نصرت ساتویں اور چھٹے میں پہنچی ہیں۔'' زلیخا نے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ان کو بلاؤ بھائی۔ اپنوں سے ملیں جلیں۔ اپنے خاندان والوں کو پہچانیں۔ ورنہ اس موئے انگریزی کی گٹ پٹ نے تو بزرگوں سے بچوں کا ناطہ ہی توڑ کر رکھ دیا ہے۔'' صفو نے گاجر کا حلوہ نکالتے ہوئے کہا۔

''جی ابھی بلاتی ہوں۔ شام کو جوالہ پرشاد جی آجاتے ہیں، انہیں کے پاس بیٹھے پڑھ رہے ہیں۔ جب تک آپ کا ناشتہ ختم ہوگا، وہ تینوں ٹیوشن سے فارغ ہوکر سلام کرنے حاضر ہوں گے۔'' زلیخا نے بڑے ادب سے کہا اور باتھ روم کی طرف بڑھیں۔

''امی بیگم آپ ٹھیک تو ہیں؟'' باتھ روم کے دروازے پر کھڑی زلیخا نے پوچھا۔ جواب نہ آنے پر اس نے ہلکی سی تھاپ دی اور پھر بے چین ہوکر دروازے کو ذرا سا کھول کر پکارا۔ ''امی!'' پھر کسی خطرے سے گھبرا کر دروازہ کھول کر جو اندر جھانکا تو منہ سے نکلا۔ ہائے غضب۔ پھر بھاگ کر دالان سے پکارا۔ بوا جلدی آؤ امی بیگم باتھ روم میں بیہوش پڑی ہیں۔''

بوا کے ساتھ مل کر تینوں عورتوں نے بڑی بیگم کو اٹھایا اور پلنگ پر لاکر لٹا دیا۔ زلیخا نے ڈاکٹر کو فون کیا پھر رام سیوک جی کا نمبر ملانے لگیں۔ جہاں احمد چائے پارٹی میں گئے ہوئے تھے۔ زلیخا کا برا حال تھا۔ بار بار پریشانی سے دالان میں نکل کر گیٹ کی طرف دیکھتی تھی، ڈاکٹر پہنچے کہ نہیں۔ بوا زمین پر پالتی مارے بیٹھے دھیرے دھیرے بڑی بیگم کا پاؤں دبانے لگیں۔ دونوں بہنیں البتہ کچھ پریشان سی، بھری پلیٹوں کے سامنے چپ چاپ صوفے پر بیٹھی تھیں۔

''ڈاکٹر ابھی تک نہیں پہنچا۔'' احمد ہڑبڑاتے ہوئے کمرے میں گھسے۔

''پھر سے فون کرتی ہوں۔'' زلیخا نے میاں کو دیکھ کر راحت کی سانس لی اور فون کرنے ڈائننگ روم کی طرف بڑھی۔

''امی، امی جان! آنکھیں کھولئے اپنے احمد کو دیکھئے۔'' احمد کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ وہ کسی بچے کی طرح پریشانی سے بڑی بیگم کا بازو ہلا رہے تھے۔

''اپنے کو سنبھالو احمد میاں!'' صفو نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''تسلیم'' جھک کر احمد میاں نے اسی گھبراہٹ اور پریشانی میں دونوں خالاؤں کو آداب کیا۔

''کب سے سوچ رہے تھے آنے کو۔'' شمو نے کہا۔

''بہت اچھا کیا۔ آپ آگئیں بیٹھئے نا۔ ناشتہ لیا آپ لوگوں نے؟'' بوا، مسالے دار چائے پلائی صفو خالہ کو'' احمد میاں نے ایسے موقعے پر بھی خاندانی وضع داری نبھائی۔

''سب کھا پی چکے ہیں بس اب تم منحوس شبیر کا پتہ جڑ سے کاٹ کر اس کے منہ میں کالک پوت دے۔

کنیز کی اولاد، کھرے پٹھانوں سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہتا ہے۔ جائیداد میں حصے داری چاہیے۔ لعنت ہو اس کتے کی اولاد پر۔'' صفو نے طیش میں کہا۔

احمد نے چونک کر ان کے منہ کی طرف دیکھا۔

''اپیا زبان سنبھالیے۔ شمو نے صفو کو کہنی ماری۔''

صفو نہ سمجھانے کے کارن چونک کر بہن کو دیکھنے لگیں۔ پھر اشارے سے پوچھا کیا ہے؟

شمو نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ پھر گردن ہلا کر کلمے والی انگلی ہونٹوں پر رکھ کر انہیں چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ بات سمجھی یا نہیں مگر صاف لگ رہا تھا کہ وہ اپنی محبت کا اظہار زہر اگل کر احمد کے سامنے کرنے کے لیے بیتاب ہے۔ مگر برا ہو اس کم بخت ڈاکٹر کا۔ جو بیگ اٹھائے زلیخا کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔

''کیا ہو گیا یکا یک۔ پرسوں تک تو بی پی نارمل چل رہا تھا'' ڈاکٹر نے یہ کہتے ہوئے بڑی بیگم کا چہرہ دیکھا اور گمبھیر ہو کر بیگ کھولا۔ اس کے چہرے کے بھاؤ کو دیکھ کر احمد اور زلیخا کو لگا کہ امی جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

''ڈاکٹر صاحب سب ٹھیک ہے نا۔'' احمد نے رندھے گلے سے پوچھا۔

''دیکھتا ہوں۔'' کہہ کر ڈاکٹر نے بیگ کھولا اور بلڈ پریشر کا آلہ نکالا اور بڑی بیگم کے بازو پر کسنی شروع کر دی۔ تینوں بچے گھبرائے سے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے۔ پورا ماحول جیسے ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے بلڈ پریشر چیک کرنے کے بعد کچھ لکھا۔ پھر احمد کی طرف مڑ کر دیکھا اور گلا کھنکھار کر بولے۔

''خطرے کے پاس تک بڑی بیگم پہنچ گئی تھیں۔ بس ایک دو ڈگری اور بڑھتا تو... سمجھو برین ہیمریج ہو سکتا تھا۔ شکر کیجئے کہ یہ بال بال بچ گئی ہیں۔ ورنہ ان کو پورا آرام چاہیے۔ کسی طرح کا تناؤ خطرناک ہے۔ یہ ٹسٹ ہے۔ کرالیں۔ دوا فوراً شروع ہونی ہے۔ ابھی کچھ دیر بعد یہ ہوش میں آجائیں گی۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے اب۔ اب میں چلتا ہوں۔''

''ٹھہریے ڈاکٹر صاحب، کچھ دیر ٹھہریے۔ جب تک ان کو ہوش نہیں آجاتا ہے تب تک ٹھہریے۔'' بہت دکھی لہجے میں احمد بولے۔

''ٹھیک ہے میاں اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے۔ ٹھہر جاتا ہوں'' کہہ کر ڈاکٹر پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔

''بوا، ڈاکٹر صاحب کے لیے چائے لائیں۔'' احمد بولے

''میں سب کے لیے بنواتی ہوں'' کہہ کر زلیخا چلنے کو ہوئیں۔

تبھی بڑی بیگم نے آنکھیں کھولیں اور چاروں طرف دیکھا۔ ڈاکٹر پر نظر پڑتے ہی غرا پڑیں۔ ''ہائے توبہ میری! یہ موا ڈاکٹر پھر میری جان کو آن بیٹھا۔ اتنا کہہ کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ چہرے سے

کمزوری ٹپک رہی تھی۔

''میں باہر بیٹھتا ہوں۔'' ڈاکٹر مسکرا کر اٹھے۔

''میں بھی چلتا ہوں'' کہتے ہوئے احمد اٹھ کھڑے ہوئے۔

''تم بیٹھو اور ہاں، یہ دوائیں فوراً منگوا لو۔ پرہیز بہت ضروری ہے۔'' کہتے ہوئے انہوں نے بیگ اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

احمد، ماں کے سرہانے بیٹھ کر ان کا سر سہلانے لگے۔ ان کے چہرے سے یقینی کے ساتھ یسیری بھی ٹپکنے لگی تھی۔ باپ کو کھوئے یہی دس ماہ ہوئے ہوں گے۔ اب ماں کو وہ کھونا نہیں چاہتے ہیں۔ ماں کی باتوں نے کبھی یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ ابا جان نہیں ہیں۔ رات دن انہیں کا ذکر چلتا رہا ہے۔ اب یہ سناٹا انہیں سہن نہیں ہو پائے گا۔ وہ ماں کو بچانے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اپنی عمر کے باقی سال بھی آدھا آدھا بانٹنے کو تیار ہیں۔ مگر انہیں کھونا قیامت سے کم، انہیں نہیں لگتا ہے۔ ان کی اس حالت سے زلیخا ٹوٹ کر بکھرنے لگتی ہیں۔ اس کا اعتماد بھی میاں کے یقین ٹوٹنے سے کمزور پڑنے لگتا ہے۔

❑

ہفتے بھر بعد بڑی بیگم اپنے پرانے حال پر لوٹیں تو سیدھے احمد کی شامت آگئی۔ صفو کی باتیں ان کے کان میں پڑی تھیں۔ دواؤں کے زور پر نیند نے کچھ دنوں کے لیے اس سوال کو دھندلا ضرور کر دیا تھا مگر پوری طرح آزاد نہیں کیا تھا۔ احمد اس سوال سے ہمیشہ سے کتراتے رہے ہیں۔ پہلے امی اور ابا کے بیچ پسنا نہیں چاہتے تھے۔ پھر شبیر اور امی کے بیچ اٹھے فساد سے اوبنے لگے تھے۔ اس سے ماں کے سامنے ہوئی پیشی سے وہ سمجھ گئے کہ ضرور کچھ نہ کچھ آفت ٹوٹنے والی ہے۔ امی بیگم ساری بربادی کے باوجود یہ سمجھ نہیں پاتی ہیں کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ وہ چھوٹے لوگ دراصل ہندوستان پر حکومت کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان سے ٹکرانے کا مطلب ہے اپنے کو لہولہان کرنا۔

''جی امی بیگم! آپ نے مجھے یاد کیا''

''یہ بتاؤ تم مجھ سے صاف صاف کہ مو اشبیر کی ہمت کیسے پڑی کہ ہمارے سامنے سر اٹھا سکے۔''

''کیونکہ وہ آپ کا سوتیلا بیٹا اس ضلع کا کلکٹر ہے۔'' احمد نے ہرشد کو چباتے ہوئے کہا۔

''پھٹکار! وہ میرا سوتیلا لڑکا کیوں ہوا سانپ کا سنپولا؟ ہندوستانی حکومت کا سر پھر گیا ہے جو ایسے ایرے غیرے نتھو خیرے کو سرکاری محکموں میں شامل کر رہے ہیں۔'' بڑی بیگم نے چمک کر کہا

''یہ بتایئے امی ہر آدمی ابا جانی کو بیہودہ انداز سے کیوں مخاطب کرتا ہے۔ آپ کا غصہ شبیر پر ہے۔ گالی ابا جانی پر پڑ رہی ہے۔ اس دن صفو خالہ بھی... لاحول...'' احمد نے تنک لہجے میں کہا

''انہیں کا سب کیا دھرا ہے۔ نہ اس کنیز کو رتبہ دیتے اور نہ اپنا حشر خراب کرتے...''

''تو پھر آپ مجھے اور اپنے کو بھی ... خیر جانے دیجئے۔ اب آپ یہ بتایئے کہ جب ابا جانی نے شبیر کو

اپنی اولاد بتا کر وصیت میں اسے حصہ دیا ہے تو پھر ہم کیسے اس سے مکر سکتے ہیں؟"

"وکیلوں اور ججوں کی مٹھی گرم کر کے"

"یہ کام تو شبیر مجھ سے زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتا ہے"

"نگوڑی! نواب محمود آباد کے گھر توشہ خانہ دیکھتی تھی۔ جانے کیوں وہ وہاں سے چھوڑ کر ہمارے شہر آن بسی اور مقدمے کے بہانے اس کم بخت نے اپنی لڑکی ایڈوکیٹ نور احمد خاں کے پلے باندھ دی اور اب زور یہ کہ سرکار نے اس کنیز بچے کو کلکٹری تھما دی کہ کروراج اور شرفاء کی برابری میں کھڑے ہو..."

"امی ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ہم گھر کی بات کو باہر نہ لائیں اور جائیداد آدھی آدھی کر لیں۔ ابا جانی کی روح کو ثواب ملے گا اور ہم کو بھی راحت ملے گی کہ ہم نے کسی کا حق نہیں مارا۔"

"زندگی بھر جس نے مجھے تڑپایا، برادری میں میرا سر جھکایا، اگر اس کی روح مرنے کے بعد بھٹکتی ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"آپ اتنی سخت دل کیوں ہو جاتی ہیں کچھ مسئلوں پر؟"

"ایک مسئلہ اور سن لو کان کھول کر۔ اگر تم نے چوری چوری اپنے باپ دادا کی جائیداد آدھی بٹوائی تو یاد رکھنا، میں تمہیں دودھ نہیں بخشوں گی۔" بڑی بیگم نے منہ پھیر کر کہا

"یا خدا!! امی آپ پچھلے جنم میں شہر کوتوال تھیں کیا، جو ہر دم کوئی نہ کوئی سزا سناتی رہتی ہیں۔" روہانسی آواز میں احمد نے کہا اور ماں کے پاس سے اٹھ گئے۔

دالان میں کھڑی زلیخا ماں بیٹے کی بات سن رہی تھی۔ اس کا کبھی کبھی دل چاہتا کہ یہ ساری جائیداد شہر کے فقیروں میں بانٹ کر میاں کی پروفیسری کی کمائی پر جئے۔ کم سے کم اپنی مرضی سے جینے کا مزہ تو اٹھا سکتی ہے۔ یہاں تو ادھار کی زندگی جیتے جیتے تھک چکی ہے۔ جہاں نہ روشنی ہے نہ تازہ ہوا۔ بس خاندان کا اژدہا اور وراثت کی سرنگ پر بیٹھا ہے یہ۔ دہشت انہیں جینے نہیں دے رہی ہے۔

احمد نے زلیخا کو دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں ملیں۔ ایک سرد آہ دونوں کے سینے سے نکلی اور دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔

شبیر کی ماں خالص پٹھان خاندان سے تھی۔ کسی مصیبت کے وقت انہیں نواب محمود آباد کے یہاں نوکری کرنی پڑی تھی۔ جب ان کے میکے کی جائیداد کا بٹوارہ ہوا اور بلند شہر میں ان کو اپنا حصہ ملا تو وہ لوٹ آئیں۔ بیگم صاحبہ نے کہا کہ مت جاؤ تمہارے شوہر مرحوم نے تمہاری خدمت بڑی ایمانداری سے کی ہے۔ مگر ناگاہ موت انہیں ہم سے چھین لے گئی، تو بھی ہمارا حق تم پر بنتا ہے۔ مگر شبیر کی نانی نے اپنے کنبے میں لوٹنا ہی مناسب سمجھا۔ مائیکے سے ملی جائیداد کافی تھی۔ کچھ بیچ کر انہوں نے پیسہ ایک فیکٹری میں لگایا تھا۔ عورت سمجھ کر مالک نے ان کی حصے داری ختم کرنی چاہی۔ اسی کے سلسلے میں ایڈوکیٹ نور محمد خان سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت زینب انیس سال کی تھی۔ مقدمے بازی تین چار سال چلی اور جیت شبیر کی نانی کی

ہوئی۔ وہ ہیرا پرکھ چکی تھیں۔ جب نور محمد خان نے اپنی خواہش ان کے سامنے رکھی تو انہوں نے اس بات کی بھی پرواہ نہ کی کہ وہ شادی شدہ ہیں اور ایک بیٹے کے باپ بھی ہیں۔ زینب کو البتہ انہوں نے سیکھ دی تھی کہ بڑی بیگم بڑی بہن کی طرح ہیں۔ ان سے کبھی مقابلے پر کھڑی مت ہونا۔ کبھی ظلم بھی کریں تو سر جھکا کر سہہ لینا۔ آخر میں تو اس عورت پر ظلم کرنے جا رہی ہوں۔ خدا مجھے معاف کرے۔

□

ایڈوکیٹ نور محمد خان نے ساری زندگی اس بات کی کوشش کی کہ وہ بیگم کے دل میں زینب کے لیے ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا کر سکیں مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے اور دونوں بیویوں کو ساتھ رکھنے کا بس ارمان بن کر رہ گیا۔ ان کا جھکاؤ زینب کی طرف زیادہ تھا۔ مگر خدا کا خوف دل میں تھا۔ اس لیے انہوں نے کبھی بڑی بیگم کا دل نہیں دکھایا۔ انہیں سخت سست نہیں کہا۔ گھر چھوڑ کر وہ کبھی زینب کے ساتھ رہنے نہیں گئے۔ تو بھی بڑی بیگم کا دل نہیں پسیجا اور وہ ہمیشہ زینب کو کنیز کی اولاد سمجھتی رہیں اور شبیر کو کنیز بچہ کہہ کر ان کا دل دکھاتی رہیں۔ نفرت اور محبت کے بیچ پستے پستے نور محمد دل کے مریض بن گئے اور ساٹھ کے بھی پورے نہیں ہو پائے کہ موت انہیں نگل گئی۔

ایڈوکیٹ نور محمد اپنی جائیداد کا وارث بڑی بیگم کو بنا گئے تھے۔ ان کی ہدایت تھی جب تک بیگم زندہ ہیں وہ مالک ہیں۔ بعد میں میرے دونوں بیٹے اس جائیداد کے برابر کے حق دار ہیں۔ اس وصیت کا پتہ پوری طرح شبیر کو نہیں تھا۔ مگر یہ بات اس کے کانوں میں پڑی تھی کہ ابو جانی نے اس کا برابر کا حصہ جائیداد میں لگایا ہے۔ اس کا بچپن بھی ماں کے ساتھ ہوئی زیادتی کو دیکھتے ہوئے گزرا تھا۔ باپ نے ماں کو کتنا بھی چاہا ہو مگر وہ انہیں وہ عزت خاندان میں نہیں دلا پائے تھے جو بڑی بیگم کی تھی۔ ماں کو اکثر شبیر نے سسکتے دیکھا تھا۔ ان کی خاموشی ساری بات سمجھا دیتی تھی۔ تبھی اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ ضرورت کے لیے نہیں بلکہ اس عزت کے لیے جائیداد کا ملا برابر کا حصہ لے کر رہے گا جو اس کے والد نے اس کو دے رکھا ہے۔ سو اس نے کلکٹر بنتے ہی دعویٰ ٹھونک دیا۔ یہ دعویٰ زبانی تھا، عدالتی نہیں۔ اس کا مقام اور عہدہ ایسا تھا کہ اس کا دبدبہ ہی قانونی فیصلہ کرانے کی شکتی رکھتا تھا۔ اس اعتماد سے بھرا شبیر اپنی جگہ مطمئن تھا۔

بڑی بیگم نے احمد کے چہرے سے اس کے دل کا حال پڑھ لیا تھا۔ اس لیے وہ اپنی بہن صفو کے گھر پہنچی اور ان کے پڑوس میں رہنے والے شرافت علی وکیل کو بلا بھیجا۔ وہ نمبری چار سو بیس انسان تھا۔ بیگم کے جذبات کو ہوا دے کر اس نے ایک وصیت بیگم صاحبہ کی طرف سے لکھوانے کا مشورہ دیا کہ وہ یہ کہیں کہ میرے شوہر نے فلاں فلاں تاریخ میں لکھی وصیت میں مجھے اپنی جائیداد کا مالک بنایا ہے اور اس طرح سے میں اس جائیداد کی تنہا مالک اور قابض ہوں۔ کیونکہ میری اولادیں میرے کہے پر نہیں۔ سو میں انہیں بے دخل کر کے اپنی بہو جو نیک سیرت اور خدمت گزار ہے کو اپنی جائیداد کا مالک بناتی ہوں۔ میری بہو زلیخا خان اب اس جائیداد کی پوری مالک ہے۔

شرافت علی نے اس چکر میں پانچ ہزار روپے بڑی بیگم سے اینٹھ لیے اور نامعقول سی ایک وصیت لکھ کران کے حوالے کردی جس پر نہ کچہری کی مہر لگی نہ کسی گواہ کے دستخط ہوئے۔ قانون کو پوری طرح نہ سمجھ سکتے اور غلط خواہشوں کے چلتے بڑی بیگم نے ایک بار پھر چھوٹے پن کا اظہار کر کے اپنی ناک اونچی کرلی۔ بات یہیں ختم نہیں کی اور نائن کے منہ سے زینب کے پاس کہلایا کہ جس برابری کے لالچ میں وہ جائیداد کی حق دار بننا چاہ رہی ہے، اس کے منصوبے کبھی پورے نہیں ہوں گے اور شبیر کے احمد کے برابر کھڑے ہونے کا خواب خواب ہی رہ جائے گا۔

نائن بیچاری یہ سب کیا کہتی۔ وہ تو کلکٹر صاحب کے گھر گھستے ڈر رہی تھی۔ مگر پیٹ کی آگ کے چلتے، گئی اور ڈرتے ڈرتے اتنا کہہ پائی ''چھوٹی بیگم، بڑی بیگم کہلائن ہیں کہ جائیداد ما آدھا حصہ نہ ملیہے۔'' اتنا کہہ کر وہ بدحواس سرپٹ پر بھاگتی ہوئی بنگلے سے سیدھا کوٹھی کے دالان پر پہنچی اور پندرہ منٹ تک اپنے اکھڑی سانسوں کو درست کرنے کے بعد بڑی بیگم کو منہ دکھانے کے قابل ہوئی۔

''لے یہ تیرا انعام'' پانچ کا نوٹ اس کی طرف پھینکتے ہوئے بڑی بیگم نے بڑی ادا سے گردن اکڑائی اور توشک کے نیچے رکھی وصیت کی فائل کا کونہ اٹھا کر دیکھا اور ہلکے سے مسکرائی۔

ادھر زینب کو نائن کی بات میں کئی پرتیں نظر آئیں۔ کئی دنوں تک اس جملے میں الجھی رہیں۔ پھر بیٹے کے کہے جملے یاد آئے۔ شک گزرا کہ کہیں شبیر نے حق کا دعویٰ تو نہیں ٹھونک دیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی ماہی بے آب کی طرح تڑپ اٹھیں۔ شبیر دو دن کے لیے اناوہ دورے پر گیا تھا ورنہ کان مروڑ کر سارا سچ اگلوا لیتی۔ بے چینی میں کئی بار سوچا۔ اردلی سے کہہ کر نائن کو پکڑ بلوائیں۔ مگر دل کو یہ بات گوارا نہ ہوئی کہ وہ بیٹے سے پوچھے بنا اس عورت سے بات آگے بڑھائی جائے۔ شاید اس بیچاری کو کچھ پتہ بھی نہ ہو۔

اللہ اللہ کر کے دو دن گزرے اور شبیر دورے سے لوٹا۔ ماں کا تنا چہرہ دیکھ کر سمجھ گیا کہ کوئی مقدمہ ماں کے ذہن میں جاری ہے۔ اس کی پیشی ہونے والی ہے۔ آفس جانا تھا چلا گیا۔ مگر شام کی تیاری کرنی تھی کہ ماں کے شادی کے اصرار سے کیسے نمٹے۔ اس کو ایک لڑکی پسند تھی۔ مگر یقین نہیں تھا کہ لڑکی بھی اس کو پسند کرتی ہے یا نہیں۔ اس کے کہنے کے باوجود ماں کے سامنے زبان نہیں کھول پا رہا تھا۔ وہ لڑکی جب بھی ملتی شبیر کی زبان تالو سے چپک جاتی تھی۔ سارے دن اپنے سے لڑتا رہا کہ ماں سے پہلے بات کرے یا لڑکی سے۔ لڑکی نے انکار کردیا تو ماں کے سامنے بے عزتی ہونے سے بچ جائے گی اور جو ماں نے وہاں پیغام دیا اور انکار ہوا تو وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اس میں میری مرضی کہاں تھی؟ وہ تو ماں لڑکیاں ڈھونڈھ رہی تھیں۔ اس طرح سے لڑکی کے سامنے اس کا بھرم بنا رہے گا۔

شام تک شبیر کسی نتیجے پر نہیں پہنچا اور الجھا الجھا سا گھر پہنچا۔ ماں کافی بے چین نظر آئیں۔ چائے میز پر نوکر نے لگادی تھی۔ دونوں ماں بیٹے خاموشی سے چائے پینے لگے۔ زینب کہیں دور کچھ دیکھ رہی تھی۔ شبیر بار بار نظریں اٹھا کر ماں کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کرتا۔ پھر اپنی بے چین آنکھیں جھکا لیتا۔ کئی پل گہری خاموشی

میں گزر گئے۔ زینب نے خالی پیالی میز پر رکھی اور بیٹے کی طرف نظر گھمائی۔

''تم نے جائیداد میں اپنا حق مانگا ہے۔''

''ایسے کیوں پوچھ رہی ہیں۔''

''جتنا پوچھا ہے پہلے اس کا جواب دو۔ تم نے جائیداد میں اپنا حق مانگا ہے۔''

''جی ہاں!''

''آخر کیوں؟ کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟''

''میں نے کوئی غلط مانگ نہیں کی۔ بات ضرورت کی نہیں، اصول کی ہے۔''

''بات اگر وصول کی ہے تو میری ایک بات سنو تمہارے ابا کے دو بیٹے ہیں۔ جب تم ان کی جائیداد کے حق دار بنتے ہو تو مجھے بھی یہ احساس جاگتا ہے کہ میرا بھی کوئی فرض ہے۔ میرے ننھیال کی جائیداد ہے اس کو اب میں تمہارے اور تمہارے بڑے بھائی احمد کے نام کرنا چاہتی ہوں۔ زندگی کا کچھ ٹھیک نہیں۔ اس لیے کام جتنی جلد ہو سکے بہتر رہے گا۔'' اتنا کہہ کر زینب بیٹے کے پاس سے اٹھ گئی۔

شبیر نے ماں کو غور سے دیکھا۔ وہ پہلے کبھی اتنی روکھی نہیں لگی۔ لہجہ پیار سے خالی، بالکل سپاٹ تھا۔ امید کچھ اور کر رہا تھا اور نکلا کچھ اور۔ اوپر سے جس بات پر ڈر رہا تھا اس پر پھٹکار نہیں پڑی بلکہ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ جو کام ابا نے اپنی طرف سے انجام دیا وہی امی کرنا چاہ رہی ہیں۔ میری لڑائی کو ایک نیا معنی دے رہی ہیں۔ یا پھر میرے بڑھتے قدم پر روک لگا رہی ہیں۔ آخر یہ پرت دار باتیں کس طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ امی نے کہا ہے تو یہ کام انجام دینا ہوگا۔ شبیر چائے پی کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

زینب کا دل پریشان تھا۔ شوہر تھے نہیں جو باتیں کر کے دل ہلکا کر دیتے۔ ماں کا سایہ جب سے اٹھا ہے تب سے صلاح دینے والا کوئی بڑا نہیں بچا۔ ان کی سمجھ میں یہی راستہ آیا جس سے ان کے گھر کی بنی ہوئی شرافت کی ساکھ بنی رہے گی۔ ورنہ تو یہ جگہ تماشہ دیکھنے کے لیے کب سے پریشان ہے جب سے میرا نکاح ہوا تھا۔ وہ سخت دن جب میں نے صبر سے گزار دیے تو یہ بات بھی کڑوے گھونٹ کی طرح پی جاؤں گی۔ مجھے معلوم ہے میرے اس برتاؤ سے بڑی بیگم پر کوئی اثر نہیں پڑے گا تو بھی مجھے یہ انجام دینا ہے۔ کیونکہ یہی درست راہ ہے۔ جانماز بچھا کر انہوں نے نماز پڑھی پھر خدا کی بارگاہ میں التجا کی۔

''شبیر کو عقل اور سمجھ دے۔ بھائیوں کے دلوں میں محبت کا جذبہ عطا کر''

□

ایک مہینے کی لمبی خاموشی کے بعد کالے آسمان پر نیا چاند نکلا تھا۔ شبیر نے جب کاغذات ماں کے سامنے رکھے تو زینب کو کچھ ایسا ہی احساس ہوا۔ کلیجے میں ایسی ٹھنڈک محسوس ہوئی جیسے من بھر پتھر کا بوجھ کسی نے سینے سے ہٹا کر راحت کی سانس کھینچنے کی جگہ بنا دی ہو۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھے۔ پھر اس کو دھیان سے پڑھا اور بیٹے کے ماتھے کو چوما۔ آنکھوں میں بھر آئے پانی کو دوپٹے سے

پونچھا۔ پھر بڑے پیار سے گال تھپتھپا کر بولیں۔ ''وراثت صرف زمین جائیداد کا نام نہیں ہے۔ وراثت ماں باپ کے احساس، خیالات اور خاندان کی انسانی روایتوں کو سنبھالنا بھی ہے۔ آج تمہارے ابا کی روح کتنی خوش ہوگی، اس کا اندازہ مجھے ہے۔ یہ کاغذات سنبھال کر رکھو۔ اس کی ایک کاپی میں خود احمد کو دیتی مگر تم خود وقت لے کر اس کی یونیورسٹی جاؤ اور ادب سے اس کو دے کر آؤ۔ وہ تمہارا بڑا بھائی ہے۔''

''امی آپ...'' شبیر کا گلا بھر آیا۔

''تمہارے اندر کے کلکٹر کے اگر میں کان نہ کھینچتی تو کل یہ عادت تم کو بہت پریشان کرتی اور کام کاج میں یہ نظریہ بہتوں کو پریشان کرتا۔ خدا نے تم کو اس قابل بنایا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر اس کا غلط استعمال کرنا مناسب بات نہیں ہے۔ نہ گھر میں نا باہر۔ یہ میری نصیحت ہے اس کو کبھی بھولنا مت۔ تم پھولو پھلو، آباد رہو۔ یہی میری خواہش ہے۔ تمہارے ہاتھوں کسی کا نقصان نہ ہو، یہی میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے۔ بیٹے! ہم کو شرمندہ نہ کرنا۔''

''کیسی بات کرتی ہیں امی، خدا مجھے اس قابل بنائے کہ میں آپ کی ہر خواہش کا احترام کر سکوں۔'' شبیر نے اپنی نم آنکھوں کو ماں کے جوڑے ہوئے ہاتھوں پر رکھ کر انہیں چوما۔

زینب بیٹے کے جھکے سر پر اپنا دامن رکھکر رو پڑیں۔ یہ آنسو غم میں بہائے گئے آنسوؤں سے الگ تھے۔

❑

ہفتے بھر بعد شبیر نے احمد کو فون کیا۔ گھنٹی جب تک بجتی رہی، شبیر پورے یقین سے بھرا رہا۔ مگر جب ادھر سے احمد نے ہیلو کہا تو اس کے دل میں عجیب سی اتھل پتھل مچ گئی۔ اس پر قابو پا کر اس نے نرمی سے کہا ''احمد بھائی! آداب عرض ہے۔ میں شبیر بول رہا ہوں۔ آپ سے ملنا چاہ رہا ہوں۔ اگر آپ...''

''شبیر!'' ادھر سے سوال جیسی آواز ابھری اور کچھ پل خاموشی رہی۔ جیسے اس نام سے ادھر والوں کو گہرا دھکا پہنچا ہو۔ اس سے شبیر کو وشواس ملا اور اس نے اپنی بات پھر دہرائی۔

''بھائی صاحب! میں شبیر بول رہا ہوں کیا میں آپ سے ملنے لنچ ٹائم میں یونیورسٹی آسکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے آیئے۔ میرا کمرہ کامرس ڈپارٹمنٹ کے سامنے ہے۔ میں وہاں دو بجے تک پہنچوں گا۔ یہ حصہ میرے ڈپارٹمنٹ سے الگ ہٹ کر ہے۔''

''ٹھیک ہے تو میں حاضر ہوتا ہوں۔''

''بہت بہتر ہے۔ خدا حافظ۔''

زندگی میں پہلی بار دو بھائیوں نے فون پر بات کی تھی۔ دونوں کے اندر کئی طرح کے جذبات ہلوریں مار رہے تھے۔ ان کی سوچ کی باگ ڈور ضرور ان کی ماؤں کے ہاتھوں میں تھی۔ مگر اس کے باوجود ان کے احساس کا گھوڑا انہیں ان کے وجود کے اندر قلانچیں بھروا کر کسی نئی دشا کی طرف بڑھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ اس منزل کا انہیں پتہ نہیں تھا۔ راستے کا بھی اندازہ نہیں تھا۔ بس سفر پر چل پڑے تھے۔ شبیر کا نظریہ صاف

ہوگیا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے کو منظم کرلیا تھا۔ مگر احمد کا دل بانسوں اچھل رہا تھا۔ ضلع کلکٹر بھائی صاحب کہہ کر بات کررہا ہے۔ اوپر سے جائیداد کے بٹوارے کی زبانی دھمکی بھی دے رکھی ہے۔ یا اللہ آج جانے کیا ہونے والا ہے۔ اپنے کو مضبوط اور ثابت قدم بنانے کے لیے وہ بڑی بیگم کے کمرے کی طرف بڑھے، تاکہ ان کے خیالات ان کے برتاؤ کو نرم بنا کر کہیں شبیر سے یہ نہ کہہ بیٹھے کہ میں اور میری بیوی کی خواہش ہے کہ آپ آدھا نہیں پورا حصہ لیں۔

''امی بیگم، آداب!''

''جیتے رہو! یہ کیا، تمہاری آنکھوں کے نیچے کا حصہ پھولا کیوں ہے؟ ذرا ڈاکٹر کو دکھاؤ، ورنہ میرے مشورے پر عمل کرو۔ مگر تم کیوں سنو گے؟ آخر شوہر ہو۔ اپنی بیگم کے زور میں ہو۔ وہ جو سمجھائے گی وہی کرو گے کہ بادام گول مرچ مت کھانا۔ اخروٹ اور...''

''امی! آج ذرا میں پریشان ہوں۔ آپ مجھے دعا دیں، تاکہ میٹنگ میں جو مسئلہ سامنے آنے والا ہے اس کو میں حل کرسکوں۔''

''میں ابھی دعا کی کتاب لے کر بیٹھتی ہوں۔ ایسی اثر دار دعا پڑھتی ہوں کہ دشمن کا منہ سیاہ پڑ جائے گا۔ تمہاری فتح ہوگی۔'' اتنا کہہ کر بڑی بیگم نے پیار میں بھر کر بیٹے کا ماتھا چوما۔

احمد میاں جب ماں کے کمرے سے نکلے تو خیال آیا کہ زلیخا کو بھی بتاتا چلوں۔ شاید کوئی مناسب رائے دے۔ پھر خود سے کہنے لگے، وہ مجھ سے الگ تو سوچتی نہیں ہے اس مسئلے پر پھر اس کو کیوں پریشان کروں۔ ابھی تو مضمون بھی لفافے کا نہیں کھلا ہے کہ بحث کا مدعا کیا ہونے والا ہے؟ اپنی سوچ میں مگن وہ کار میں بیٹھے اور کوٹھی سے نکل گئے۔

زلیخا جب تک رومال لے کر کمرے سے نکلتی تب تک کار گیٹ سے باہر جا چکی تھی۔ اس نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ پھر استری کیے ہوئے رومال کی طرف دیکھا اور کمرے میں واپس لوٹ گئی۔ سامان سمیٹتے ہوئے بڑبڑائی۔ ''امی بیگم کے کمرے سے نکل کر یہ کبھی نارمل رہتے ہیں۔''

❑

گھڑی نے دو بجائے۔ احمد کی آنکھیں دیوار گھڑی پر ٹک گئیں۔ شبیر کسی بھی پل چق اٹھا کر کمرے میں داخل ہوسکتا ہے۔ وہ افسری کی شان دکھائے گا، اپنے ساتھ ہوئی زیادتیوں کو گنائے گا۔ امی بیگم پر چھینٹا کشی کرے گا۔ ان سب کے بیچ مجھے اسی طرح ٹھنڈا دماغ رکھنا ہے جیسا کہ نئے لڑکوں کے بیچ کی غیر ضروری شرارتوں کے وقت رہتا ہوں۔

''میں اندر آسکتا ہوں؟'' سوٹ ٹائی میں ایک چھ فٹ کا جوان مرد سامنے کھڑا تھا۔

''آیئے، آیئے۔'' احمد نے کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''میں شبیر!'' ہاتھ آگے بڑھا۔

''بیٹھیے!'' احمد نے کہا اور شبیر کو غور سے دیکھا۔ جوانی میں ابا جانی ایسے ہی لگتے تھے۔ اس کے دماغ میں اپنے بچپن والے باپ کا چہرہ ابھرا۔ وہ بھی سرمئی سوٹ پر نیلی ٹائی لگایا کرتے تھے۔

''یہ امی نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔''

''کیا ہے؟'' دل کو قابو میں کر کے احمد نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''خود ہی دیکھ لیں۔'' اتنا کہہ کر شبیر نے کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر اسکی نظر بھائی کے چہرے پر ٹک گئی۔

احمد کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا، دوسرا جارہا تھا۔ کاغذات دیکھ کر بھی ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ چہرے پر گہری سوچ کا الجھاؤ تھا۔

''مجھے اجازت دیں، بھائی صاحب۔ دورے پر نکلنا ہے۔''

''ہاں بیٹھو۔ چائے پی کر جانا۔'' احمد نے کہنے کو کہہ دیا، مگر انہیں اپنی آواز بڑی انجانی سی لگی۔

چائے آگئی۔ چائے پیتے ہوئے دونوں ایک دوسرے کو تاکتے، پھر نظریں ادھر اُدھر کر لیتے۔ دونوں کے ذہن میں ایک طوفان سا بپا تھا۔

چائے ختم کر کے جب شبیر نے اجازت مانگی تو احمد کرسی سے اٹھے اور کمرے سے باہر اس کو کار تک چھوڑنے آئے۔ جب کار میں شبیر بیٹھا تو احمد نے اردلی کی جگہ خود آگے بڑھ کر دروازہ بند کیا۔ اور بے حد پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ''امی کو میرا آداب کہنا۔ کسی دن میں ان کی بہو اور پوتے پوتیوں کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔''

اس چھوٹے سے جملے کو سن کر شبیر کا دل مچل اٹھا کہ دروازہ کھول کر بھائی کے سینے سے لپٹ جائے۔ مگر خود پر قابو پا کر آنکھوں میں چھلک آئے آنسوؤں کو پی گیا۔ احمد جاتی ہوئی کار کو تب تک دیکھتے رہے جب تک وہ نظر آتی رہی۔ پھر لمبی سانس کھینچ کر کمرے میں لوٹے۔ کرسی پر بیٹھ کر انہوں نے کاغذ کا ایک بار پھر معائنہ کیا اور آنکھیں بند کر کے سر پیچھے کو ڈال دیا۔ کئی سال تیزی سے گزر کر سامنے آگئے۔ بہت سے جالے صاف ہوئے، کچھ نئے سوال آن کھڑے ہوئے۔ جس میں سب سے بڑا سوال تھا کہ امی بیگم کو یہ کاغذ دکھائے جائیں یا نہیں۔

کمرے میں اٹھ کر ٹہلتے رہے۔ کبھی کبھی سگریٹ شوقیہ پیتے ہیں۔ مگر آج چپراسی سے پورا پیکٹ منگا کر پھونک ڈالا۔ آٹھ دس پیالی چائے کی پی ڈالی۔ ناشتے دان میں کھانا ویسے ہی پڑا رہا۔ ایک لقمہ بھی نگلنے کا من نہ کیا۔ اندر سوچ کے اس طوفان سے نکلنے کے لیے انہیں آج ہی کوئی راستہ ڈھونڈھنا ہے اور سیدھے امی بیگم سے بات کرنی ہوگی۔ ان کے بلڈ پریشر سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ موت اور زندگی خدا کے ہاتھ ہے۔ اسی پر مجھے بھروسہ کرنا ہے۔ ورنہ یہ رکا پانی دھیرے دھیرے کر کے اتنا بدبودار ہو جائے گا کہ آنے والی پیڑھی کا دم گھٹے گا۔ مجھے اس سے نکلنا ہوگا۔ ہر حالت میں نکلنا ہوگا...

□

شام کی چائے احمد میاں نے امی بیگم کے ساتھ پی۔ پرانی باتوں کو بڑے صبر کے ساتھ ماں کے منہ سے سنتے رہے۔ پھر دھیرے سے کاغذ نکال کر امی کے سامنے رکھا۔

''یہ کیا ہے؟''

''شبیر لے کر آیا تھا آج''

''نوٹس ہے؟'' بڑی بیگم کے چہرے سے خوشی غائب ہوگئی۔

''نہیں... شبیر کی امی نے اپنے میکے کی جائیداد میں آدھا حصہ میرے نام کیا ہے۔ اسی کے کاغذ ہیں۔''

''کیا؟''

''انہوں نے مجھے بڑا بڑ کا سمجھ کر جائیداد میں...''

''اس کی یہ مجال۔'' اس کی یہ مجال۔ بڑی بیگم کا طیش میں برا حال تھا۔ بیٹے کی طرف پلٹ کر لپکیں ''اور تم نے وہ کاغذ لے لیا۔ اس کنیز کے بچے سے۔''

''بس امی! آگے ایک لفظ نہیں۔'' احمد نے اٹھ کر ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

بڑی بیگم نے بڑی بے بسی سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ پھر اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''امی، اس کا چہرہ ابا جانی کی طرح ہے۔ وہ میرا بھائی ہے۔ اس کو معاف کردیں۔'' احمد نے روتے ہوئے، ماں کو لپٹائے لپٹائے کہا۔

بیگم کی ہچکیاں لگی تھیں۔ احمد تو دور، گھر کی بوڑھی بوا نے ان کو کبھی روتے نہیں دیکھا تھا۔ انکی آنکھوں میں پٹھانی خون ہی تیرتا سب کو نظر آتا تھا۔ اس لیے احمد کو لگا کہ یہ آنسو بہت قیمتی ہیں۔ وہ ماں کے دل پر لگے سارے زخموں کو دھو ڈالیں گے۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر ماں کا چہرہ پونچھا اور اپنے سے الگ کر کے ان کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا۔ جس میں سوال تھا، التجا تھی، آرزو تھی، معافی تھی، پیار تھا۔

''میں نے معاف کیا، میرے خدا نے معاف کیا۔'' اتنا کہہ کر بڑی بیگم نے توشک کے نیچے سے فائل نکالی اور اندر رکھے کاغذ نکال کر پل بھر انہیں دیکھتی رہی۔ پھر بے دردی سے پھاڑنے لگی۔ احمد کے چہرے پر سوال تھا۔ بڑی بیگم نے رندھے گلے سے پھر دہرایا۔ ''میں نے معاف کیا۔ میرے خدا نے بھی معاف کیا۔''

چھپر کھٹ پر بیٹھی ماں کے قدموں پر احمد میاں نے اپنا سر رکھ دیا۔ ماں کے قدموں میں جنت ہوتی ہے۔ مگر یہ وہ شکریہ کا انداز تھا جس نے آنے والی پیڑھی کو نفرت کے جذبات سے آج آزاد کیا تھا۔ انہوں نے بڑے ادب اور احترام سے ماں کے پاؤں کا بوسہ لیا۔

عبدل بسم اللہ

پیڑ

سانجھ کی بیلا اور پچھوا بیار۔ پیڑ تھوڑا ہلا اور پھر ہنس پڑا۔

''ہائے ری منو کی سنتان، آدم کی اولاد، تیری بیلا ہے اپرم پار، تو ہی جانے۔ یا جانے وہ جسے نہ جانے تو۔ جیسے میں پیڑ۔''

پیڑ کے پتوں سے پھوٹے تھے یہ شبد، نکلی یہ رہس مے آواز، مگر نہ دیکھی پنڈت جی نے پیڑ کی ہنسی اور نہ سنی کوئی آواز۔

گئے تھے وے پانی سے بھرا لوٹا لے کے مٹی، لوٹ آئے خالی لوٹا لیے اپنی بکھری میں اور بھیج دیا ہردوار کو بقریدی کسائی کے گھر۔

بقریدی آیا، دسوں نہہ جوڑے، دانت چیارے... 'پالاگی مہاراج'

'جیا'

پنڈت جی نے دیا اشیش، ایک دم سچے من سے اور کھلکھلا اٹھی پچھوا بیار، دپ دپ جل اٹھے تریوں کے دیئے آکاش میں۔ مگن ہو گئے گوشالے کے سارے بچھرو۔

'ارے بقریدی! ارے ہاں ہاں بھاگ مان ہو تم۔ گنگا قسم، واہ ہو رہی ہے تمہارے بھاگ سے۔ تمہیں تو باہمن ہونا چاہیے تھا بقریدی باہمن۔ جا کر دیکھو اپنے باغ میں، وہ جو خوب بڑا سا پیڑ ہے نا، پرکٹ ہو گئے ہیں ساکشات ہنومان جی اس برچھ میں۔ اپنے پورو جنم میں ضرور تم باہمن رہے ہو گے بقریدی، گنگا قسم! کسائی جو ہو گئے تو ضرور کوئی پاپ کیا ہو گا جگھنیہ۔ اب جاؤ بقریدی، کھڑے کھڑے دیکھ کیا رہے ہو۔ کچھ پوجا پاٹھ کراؤ، کتھا کیرتن۔

ہنومان جی آئے ہیں تمہارے برچھ میں، تو ضرور کوئی بات ہو گی..

اور بھرنے لگے بچھرو سب کلاچیں۔ گوشالے میں چنچ ہو گیا آکاش کی تریوں کا۔ مہہ مہہ مہکنے لگی پچھوا بازار۔ آگ آگے پنڈت جی نا رچ لیے اور پیچھے پیچھے بقریدی کسالی دسوں نہہ جوڑے چل پڑے باغ کی اور۔

'وہ، وہ دیکھو بقریدی' ہے نا ساکشات ہنومان جی۔

بقریدی نے دیکھا نارچ کا پیلا سا پرکاش اور اس کے گھیرے میں پیڑ کے تنے کا اٹھا ہوا ایک بھاگ کچھ کچھ بندر کی طرح منہ، ابھری ہوئی سی ناک، ایک اور پھیلی ہوئی سی مگر ذرا کانی آنکھ...

نہیں، پیڑ میں یہ تو نہیں تھا شاید پہلے جی۔

اور جھک گیا بقریدی کسالی کا ماتھا نایاس

'یا اللہ! یا اللہ!'

'بھگوان کو یاد کرو بقریدی'

بھگوان کو، ارے ادھر تو آؤ ننک یہ دیکھو تھیلی، گر ہن کرو بقریدی، گر ہن کرو، ہنومان کا پرشاد ہے یہ۔

بقریدی گر پڑا زمین پر — ڈنڈوت پرتاپ کتنے بڑے پرتاپی ہیں ہنومان جی، جنہیں بندر سمجھتا رہا تھا ابھی تک وہ۔

پیڑ کی جڑ میں تھا ایک کھوکھلا

اسی کھوکھل میں تھی وہ تھیلی

تھیلی بنی تھی لال ٹل کی

تھیلی میں رکھے تھے سکے

سکے ایک روپے کے

سنکھیا میں تھے تین

تینوں پر شکل بنی تھی پردھان کی

بقریدی گدگد ہو گیا

اور گدگد ہو گئی رات

گدگد ہو گئے آکاش کے سبھی نچھتر

پیڑ پھر ہنسا

اس کے پتوں سے پھر پھوٹی آواز

'ہائے ری منو کی سنتان، آدم کی اولاد، تیری لیلا ہے اپرمپار...

مگر نہ دیکھی بقریدی نے پیڑ کی ہنسی اور نہ سنی کوئی آواز

بقریدی لوٹ آیا اپنے گھر، بھگت میں بھر، جیب میں پرتاپی سکے رکھ کر

اور ہوئی صبح، پھوٹا پو، چہچہائے پنچھی، بہی پچھوا بیار، جنا پورب میں بی بی آسماں نے ایک لال لال پیارا سا ششو۔

بقریدی کی بگیا میں جٹنے لگی بھیڑ

گاؤں کے باہمن آئے، چھتری اور ویش آئے، کا-تھ اور کنبی چاروں برن اور چھاتیسوں جات کے لوگ۔ بھر گیا بگیا میں ایک میلا، استریاں، پُرش، بچے... لاؤڈ اسپیکر... سج گیا سندور اور لال پتا کا وَس سے ہنومان جی کا پیڑ۔

پیڑ کے نیچے چبوترا، چبوترے پر کلش اور ناریل، تنے پر ہنومان جی کا صاف چہرہ، چہرے پر لال لال ریکھائیں، سامنے جھانجھ منجیرا اور کرتال سنبھالے پنڈت جی کا ست سماج، گونجنے لگے کیرتن کے بول —

مہابیر بن بوُاُو ہنومانا — راما ہوراما۔

رام جاسو جس آپ بکھانا راما ہوراما۔ بقریدی کھڑا ہے ہاتھ جوڑے، نین موندے مورتی وت۔

کیرتن گونج رہا ہے پوری بگیا میں

شور بھر گیا ہے پوری بستی میں

نرناری، پشو پنچھی سبھی ڈوب گئے ہیں بھگتی کی اتھاہ سرتا میں

بقریدی تمہیں لعنت ہے۔ تم کلمہ گو ہونا؟ آنحضرت کی امت! یہ بندر بھالو کہاں سے آگئے تمہارے پیڑ میں؟

شام کو پہنچ گئے بستی کے مانند مسلمان بقریدی کے گھر اور سنانے لگے صلوات۔

کیوں جہنم کا راستہ بنا رہے ہو بقریدی، کیوں؟ گناہ، بہت بڑا گناہ۔ گناہ کبیرا۔

مگر کیا بولے بقریدی، کیا بتائے اپنے دل کا حال۔ آنکھ سے جو دیکھا ہے اسے کیسے جھٹلائے۔ بالکل بالکل ساکشات ہنومان۔ وہی چہرہ، وہی آنکھیں، وہی ناک، بالکل رام لیلا والے ہنومان کی طرح۔

'باز آؤ بقریدی، مت جھکو کافروں کے خدا کے آگے۔'

بقریدی کو سمجھایا بستی کے مسلمانوں نے۔

بقریدی کو ڈانٹا بستی کے مسلمانوں نے۔

دین ایمان کی دہائی دی۔

اللہ رسول کا بھے دکھایا اور چلے گئے مسجد کی اور۔

'اُجی سنو تو، آج جب میں جانوروں کو سانی دینے گئی تو پڑے ملے وہاں مجھے پچیس روپے اور ساتھ میں ایک پونجی بھی۔ بٹوا سے پڑھوایا تو جانتے ہیں کیا بولا۔ اس میں لکھا ہے اماں، مت کاٹو بے زبان جانوروں کو۔ دستخط پون سُت ہنومان۔

خبر سنائی یہ بھید بھری بقریدی بو نے اور تاکنے لگی ٹکر ٹکر اس کا منہ۔

'مہربانی! مہربانی ہے ہنومان جی آپ کی'

اپنے ہونٹوں سے بدبدایا بقریدی کسائی اور ہٹا دی سامنے سے کالیجی کی پلیٹ۔

'وہیں اب یہ سب نہیں۔ ہمارے پیڑ میں رہتے ہیں ہنومان جی، گوشت مچھلی، انڈا، کلیجی سب بند اب۔

جڑ گئے دونوں ہاتھ، بند ہو گئیں آنکھیں اور جھک گیا گھٹنوں پر سر بقریدی کا۔

اس طرح رات بیتی اور پھر آیا نیا دن۔

دن وہ جمعہ کا۔

نہانا دھونا، صاف کپڑے پہننا، ٹوپی لگانا اور جانا مسجد میں — بقریدی نے بچپن میں ہی سیکھ لی تھیں یہ عادتیں اور عادتیں تو چھوٹتی نہیں آسانی سے۔

بقریدی پہنچ گیا مسجد۔
مسجد میں چل رہی تھی وعظ... دھرم کی تقریر۔
تقریر میں تھا بقریدی کسائی کا ذکر۔
اس کے پیڑ کی کہانی۔
ارے اس بے شرم کو دیکھو، یہاں بھی آ گیا یہ، دین کا دشمن۔
لونڈوں نے جھڑکی دی بقریدی کو اور نکال باہر کیا مسجد سے۔
'کیا کرنے آیا ہے یہ یہاں؟ جا' وہیں جا اپنے کیرتن میں۔ اب نماز کیوں پڑھے گا، پڑھ جا کے ہرے راما ہرے کرشنا۔ غدار کہیں کا۔
اللہ ہوا کبر...
گونج اٹھا اللہ کا نام اللہ کے گھر میں اور لعنت بھیجنے لگیں تکنی کی گلیاں بقریدی پر۔
بقریدی بھاگ چلا بگیا کی اور۔ غصے اور کھینچ میں بھرا ہوا۔ ڈگ بھرتا تیز تیز۔
'پون سُت ہنومان کی جے!'
'کپی پتی ہنومان کی جے!'
بقریدی کھڑا ہو گیا ہاتھ جوڑ کر سامنے۔ بھد سے جھک گیا اس کا سر۔
پیڑ پھر ہنسا اور پچھوا بیار پھر بہی پوروت۔
پنڈت جی اٹھ آئے کیرتن سماج سے۔ کھڑے ہو گئے بقریدی کسائی کے پاس اور اس کے کندھے پر رکھ دیا اپنا ہاتھ پیار سے۔
بقریدی پگھل گیا جمے ہوئے گھی کی طرح۔
'دیکھو بقریدی، تم میرے اپنے ہو' تم اپنے ہو پون سُت ہنومان جی کے بھی۔ پر یہ سسُرے جو کتیے ہیں نا۔ پرم اگیانی ہیں۔ کہتے ہیں بقریدی ترک ہے۔ اس کا یہاں آنا ٹھیک نہیں۔ اب کیا کہیں مورکھوں کو سمجھانا بھی تو مورکھتا ہے۔ بقریدی تم چلے جاؤ گھر۔ وشرام کرو کیرتن آج سماپت ہے۔ کل سے یہاں شروع ہوگا مندر کا نرمان۔ اس کی دیوال پر تو نہیں مگر سورگ میں لکھا جائے گا تمہارا نام سوا نچھر وں میں۔ بھگوان کی درشٹی میں نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان۔ بھگت سبھی برابر ہیں۔ تم دھنیہ ہو بقریدی دھنیہ۔ جاؤ وشرام کرو۔
اور...
اور اس طرح بیتا وہ دن۔
آئی کالی کلوٹی چڑیل جیسی رات۔
دور کہیں بولا ایک گھگھو، اسکن اور...
اور کسائی نے کاٹ ڈالا اپنا پیڑ راتوں رات۔

سید محمد اشرف

قدیم معبدوں کا محافظ

پرانی عبادت گاہوں میں جانا، ان کے در و دیوار کو دیر تک دیکھتے رہنا اور ان کے اندرونی نیم تاریک نم حصوں میں پہنچ کر سونگھ سونگھ کر پرانے پن کو محسوس کرنا میرا بچپن کا مشغلہ ہے۔ ایسا میں جب کرتا ہوں جب غروب کا وقت ہوتا ہے اور اندھیرے کی پوشاک پہن کر درخت چپ چاپ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ وقت کی اس کیفیت میں ایک ایسی اداسی ہوتی ہے جسے کوشش کے باوجود لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کیفیت کی مماثلت ماضی کے کچھ واقعات میں تلاش کی جا سکتی ہے لیکن دقت یہ ہے کہ ماضی کے ان واقعات کو بھی صرف یاد کیا جا سکتا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میرا مسئلہ مختلف ہے بلکہ برعکس۔ میں ماضی کے واقعات یاد کرتا ہوں اور جب ان کو بعینہٖ بیان نہ کر پانے کی شدید الجھن میں گرفتار ہوتا ہوں تو ان واقعات کی مماثلت ڈھونڈنے پرانی عبادت گاہوں کے نیم تاریک اندرونی نم حصوں میں پہنچ جاتا ہوں۔

اس دن بھی سورج غروب ہونے ہی والا تھا اور درخت اندھیرے کی پوشاک پہن کر چپ چاپ گم سم کھڑے تھے۔ بستی سے آنے والی سڑک کے بائیں طرف آم کے پرانے باغوں کو عبور کر کے میں اس قدیم عمارت میں داخل ہوا جس کے صدر دروازے پر کسی مضبوط عمارتی لکڑی کے دروازے ابھی تک سلامت تھے۔ حالانکہ فرش اور چہار دیواری شکستہ ہونے کی وجہ سے صدر دروازہ کھولنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ یوں بھی صدر دروازے پر ایک سیاہ رنگ کا زنگ خوردہ قفل لٹکا رہتا تھا۔ قفل کے اصل رنگ میں زنگ کی زردی مائل سرخی نے مل کر ایک ایسے رنگ کی آمیزش کر دی تھی کہ قفل اپنی اصل عمر سے زیادہ قدیم محسوس ہوا تھا۔ شکستہ دیواروں کے آس پاس کانٹے دار جھاڑیوں کو پھلانگ کر جب میں اندر کے ٹوٹے پھوٹے فرش پر قدم جمائے کھڑا تھا تو عمارت کے دوہرے دالانوں میں سے کوئی پرندہ چیخیں مارتا نکلا تھا۔ مجھے تھوڑی دیر بعد علم ہو پایا کہ وہ کوئی پرندہ نہیں ایک چمگادڑ تھا۔ مجھے تاریکی، تنہائی اور مافوق الفطرت عناصر سے خوف نہیں محسوس ہوتا کیوں کہ میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کے زیادہ تر حصے ہمیشہ تاریک رہتے ہیں۔ اتنے تاریک کہ اگر کبھی کسی تقریب کے وقت وہاں لالٹین سے روشنی بھی کی جائے تو وہ جگہ اس مکان کا حصہ نہیں لگتی۔ میرے عزیز خصوصاً والدین بچپن سے ہی مجھ سے بیزار ہیں کیوں کہ ان کے خیال کے مطابق میں خراب صحبت میں وقت گزارتا ہوں۔ یوں اس مکان میں میرا جو بھی وقت گزرا ہے وہ تاریکی اور تنہائی میں ہی گزرا ہے۔ تاریکی اور تنہائی میرے لیے ایسے لازم و ملزوم ہیں جیسے کرتے کی ایک آستین میں ہاتھ ڈال کر دوسری آستین میں ہاتھ ڈالنا۔ میں جہاں بھی تاریکی دیکھتا ہوں مجھے تنہائی کا خیال آجاتا ہے اور جہاں بھی

تنہائی دیکھتا ہوں، تاریکی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ کبھی کبھی ان دونوں کیفیتوں کا احساس بیک وقت ہوتا ہے اور کبھی کبھی ان دونوں کیفیتوں کے احساس کے درمیان زمانی وقت کا ایک مختصر سا ٹکڑا حائل ہو جاتا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ اذیت اسی مختصر سے لمحے میں محسوس ہوتی ہے۔ اس وقت مجھے لگتا ہے کہ اگر تاریکی کے باوجود تنہائی نہیں ہے تو اس میں کوئی بڑا اسرار ہے اور اگر تنہائی کے باوجود تاریکی نہیں ہے تو اس کے پس پشت کسی آسیب کا ہاتھ ہے۔

اس شام چمگادڑ کی چیخ نے تاریکی یا تنہائی کے احساس کو کم نہیں بلکہ مزید واضح کیا۔ اور یوں وہ چیخ مجھے روشنی کی ایک لکیر کی طرح محسوس ہوئی جو تاریکی اور تنہائی کو روشن کرتی ہوئی آہستہ آہستہ معدوم ہو گئی۔

فرش پر گھٹنوں گھٹنوں گھاس اگی ہوئی تھی۔ زمین والے سے بچنے کے لیے میں فرش پر آنکھیں گڑا گڑا کر قدم رکھ رہا تھا اور اسی طرح احتیاط سے چلتے چلتے میں اگلے دالان میں آ گیا۔ اس دالان کا فرش بھٹے میں پکی ہوئی اینٹوں سے تعمیر کیا ہوا لگ رہا تھا۔ ان اینٹوں کی شکل عام اینٹوں سے مختلف مربعے کی صورت کی تھی۔ ان مربعوں پر مختلف شکلیں بنی ہوئی تھیں لیکن میں ان شکلوں میں کوئی مذہبی عنصر نہیں تلاش کر سکا۔ ہلکی روشنی میں صرف اتنا نظر آیا کہ وہ نقوش عورتوں سے متعلق ہیں اور زیادہ تر برہنہ عورتوں کے اعضاء ہیں جو بہت باریکی اور صفائی سے تراشے گئے ہیں۔ ان نقوش پر گہرے سبز رنگ کی کائی جمی ہوئی تھی اور اس طرح ہر عورت گہرے سبز رنگ کا لبادہ پہنے لگ رہی تھی۔

اندر کے دالان کا فرش کچا تھا اور وہاں بھی گھاس اگ آئی تھی۔ غروب شدہ سورج کی زرد روشنی میں وہ گھاس سیاہ رنگ کی محسوس ہو رہی تھی۔ ان دونوں دالانوں کے بعد وہ حصہ تھا جس کو تین دروازوں نے بند کر رکھا تھا۔ یہی اصل عبادت خانہ تھا۔

درمیانی دروازے کو ہلکے سے دھکا دیا تو وہ ایک کمزوری آواز کے ساتھ کھل گیا۔ اس حصے میں تاریکی برائے نام تھی۔ کیوں کہ سامنے کی دیوار پر روشن دان کھلے ہوئے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میں نے عمارت کی پشت پر ان روشن دانوں کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ روشن دانوں کے نچلے حصوں سے مٹی کے رنگ کی بہت سی دھاریاں دیوار پر سے ہوتی ہوئی فرش تک آ رہی تھیں۔ دیوار سے لگا ہوا ایک چھوٹا سا چبوترا تھا جس میں تین سیڑھیاں لگی ہوئی تھیں۔ حالانکہ چبوترے کی کل اونچائی اتنی نہیں تھی کہ چبوترے پر پہنچنے کے لیے ان سیڑھیوں پر چڑھنے کی ضرورت پیش آئے۔ اس چبوترے پر ایک بڑی سی مربع صورت اینٹ جمی ہوئی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا اس بڑی اینٹ پر کوئی نقش نہیں تھا صرف کائی کی دبیز تہہ تھی۔

کیوں کہ میں مافوق الفطرت عناصر سے نہیں ڈرتا۔ اس لیے میں نے اس چبوترے کے پاس بیٹھے زانو پہ سر رکھے بوڑھے سے دریافت کیا کہ وہ کون ہے۔

''میں ایک بے ذوق انسان ہوں'' اس نے نگاہیں اٹھائے بغیر مختصر سا جواب دیا۔ میں اس کے جواب میں چھپی گہرائی کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ باہر کے دالان کے فرش پر

کندہ حسین نقوش شاید اسی بوڑھے کے ہاتھوں کا کمال ہوں۔ میں صبر نہیں کر سکا۔

''کیا باہر دالان کے فرش کے نقوش آپ نے بنائے ہیں؟''

''نہیں۔''

''پھر؟''

''یہ سوال ضروری نہیں ہے۔''

''لیکن آپ اس کا جواب جانتے ہیں، بتایئے کس نے بنائے ہیں؟''

بوڑھے نے مجھے مسکرا کر غور سے دیکھا۔ یہ وہ لمحہ تھا جس میں مجھے خوف محسوس ہوا کیوں کہ یہ تنہائی تاریکی اور مافوق الفطرت عناصر — سب سے مختلف کیفیت کا حامل لمحہ تھا۔

چلتے چلتے میں نے اس سے پوچھا۔

''اس علاقے میں ایسے کئی معبد ہیں۔ کیا آپ نے کسی معبد کے نقش و نگار نہیں بنائے؟''

''نہیں۔''

''پھر آپ کا کام کیا ہے؟''

''حفاظت کرنا۔''

''کس چیز کی... کس سے؟''

''کسی بھی نقصان پہنچانے والے سے۔ تم بھی ان میں سے ایک ہو''

''میں؟'' اس کی سنجیدہ آنکھوں کو اندھیرے کے باوجود برداشت نہیں کر سکا۔ ہمت کر کے پوچھا۔

''میں بھلا کیوں کر نقصان پہنچا سکتا ہوں؟''

فراموش کر کے۔ ہر چیز فراموش کر کے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے جاتے جاتے اس سے پوچھا۔ ''میں نے کیا فراموش کیا؟'' جب میں شکستہ دیواروں کو پھلانگ کر واپس نکل رہا تھا تو اس نے بلند آواز میں مجھے مخاطب کر کے کہا۔

''تم نے یہ بڑی حقیقت فراموش کر دی ہے کہ ان پرانے معبدوں کے معمار تم ہی تو تھے۔''

اس رات جب میں بستی میں پہنچا تو اپنا تاریک اور تنہا مکان بہت دیر میں پہچان سکا۔

حسین الحق

خانم

حسن خاں بدلاؤ کی ڈھلان پر بہت تیزی سے آگے بڑھتا چلا جارہا تھا۔

رشید خاں صاحب کے یہاں شادی کے دو تین ماہ بعد ہی فرید کی ماں کو اس کے مخبروں نے خبر دے دی تھی کہ حسن خاں ان دنوں تیسرے رشتہ ازدواج کی فکر میں ہے۔ فرید کی ماں نے یہ خبر سنی تو مزید تشویش میں گرفتار ہوئی۔ دراصل تشویش اس بات کی نہیں تھی کہ حسن خاں اپنے حرم میں ایک اور عورت داخل کررہا ہے۔ اس پر وہ اپنی جان جلا کے کیا کرلیتی۔ جب چار شادیوں کی اجازت ہے تو وہ حسن خاں کو کیسے روک سکتی تھی؟ اسے قلعہ کے اندر کی فکر تھی۔ اسکی سوت اور سوت کے گھر والے اسکے معیار پر پورے نہیں اترے۔

حسن خاں کی اندرونِ حویلی کا وہ خاص ماحول جو نارخول سے سہسرام آنے کے ابتدائی دنوں تک قائم تھا۔ اس ماحول کا بچانا اب دشوار ہوگیا تھا۔ راجپوت دادا کی راجپوت پوتی افغانی روش پہ کیسے چلتی؟ اور اس پر طرہ یہ کہ یہ نئی آنے والی کسی گولر کے تنے سے نہیں نکلی تھی۔ اس کے سگے سمبندھی پورے سہسرام میں پھیلے ہوئے تھے۔ مسلمانوں میں بھی اور ہندوؤں میں بھی، اس لیے فرید کی ماں یہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ اب اگر کوئی الٹ پلٹ ہوجائے گی تو لینے کے دینے پڑجائیں گے اور اسی لیے اس دوسری عورت کی بہت سی الول جلول حرکتوں حرکتوں پہ وہ خموش رہ جاتی تھی۔

مگر اب یہ تیری مصیبت!

اس نے کئی بار ارادہ کیا کہ وہ حسن خاں کو روکے، تنہائی میں باتیں کرے، سمجھائے، مگر آج کل حسن خاں پنڈے پر ہاتھ کہاں دھرنے دیتا تھا۔ ہفتوں شکار میں۔ شکار سے لوٹتا تو جاگیر کے کاموں میں مشغول، دو دن گھر رہتا اور چار دن جاگیر کے معائنے پر ایک ماہ میں بس دو شب وہ گھر کے اندر سو پایا تھا، ایک شب راجپوت زادی کے پاس گیا اور ایک شب فرید کی ماں کے پاس۔ مگر فرید کی ماں کے کمرے میں وہ آیا بھی تو رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے۔ فرید کی ماں نے بات سے بات نکالنے کا ارادہ کیا تو وہ بڑے رسان سے بولا: ''بیگم! کیا آپ کو وقت کا اندازہ نہیں ہے؟ میں بہت تھک گیا ہوں۔''

اس کا لہجہ اتنا سپاٹ اور اجنبی تھا کہ اس کے بعد فرید کی ماں کچھ کہہ ہی نہیں پائی ایسی باتیں کرنے کے لیے عورت کو بیک وقت ماں بہن بیٹی دوست طوائف سب کچھ بننا پڑتا ہے مگر حسن خاں نے تو کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک ایسا ماحول کمرے کے سارے طول و عرض میں بکھیر دیا تھا کہ ان چاروں کو تو بیٹھنے کی کہیں جگہ ہی نہیں مل سکی۔ باقی بچ گئی بیوی تو بیوی کی اوقات ہی کیا؟

فرید کی ماں کو حسن خاں کی حکمتِ عملی سمجھ میں آگئی۔

حسن خاں شاید جانتا تھا کہ جب صرف بیوی بات کرتی ہے تو اس پر غالب آنا کوئی بہت مشکل امر نہیں ہوتا اور اگر یہ بیوی کے دائرے سے باہر نکل کر حریف یا مقابل ملے گی تو پھر یہ تو اور بھی سامنے کی بات ہے کہ مرد کے مقابلے پر عورت اکثر و بیشتر مغلوب ہو ہی جاتی ہے۔

اور اس طرح کچھ کرنے کا، اپنی حیثیت بچانے کا وہ ایک چھوٹا سا لمحہ بھی فرید کی ماں کے ہاتھوں سے پھسل کر وقت کے پرنالے میں بہہ گیا اور کچھ دنوں بعد اس کے مخبر نے خبر دی کہ حسن خاں نے ایک اور مقامی عورت سے شادی کر لی۔ اس تیسری عورت کو حسن خاں گھر نہیں لایا مگر اس تیسری عورت سے وابستہ ہو کر حسن خاں جیسے شیر ہو گیا۔

یہ صحیح ہے کہ گھر کے ماحول میں ابھی کوئی واضح بدلاؤ نہیں آیا تھا مگر فرید کی ماں یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ وقت، چیزیں اور لوگ اس کے ہاتھوں کی گرفت سے ریت بن بن کر پھسل رہے ہیں، اس نے محسوس کیا کہ وہ بوڑھی ہو رہی ہے۔ کئی بار اس نے حلبی آئینے میں اپنے سراپے کو گھور گھور کر دیکھا۔ ''کیا میرے پاس اب کچھ باقی نہیں بچا؟'' وہ اپنے اس سوال پر مخمصے میں گرفتار ہو جاتی۔ اس کی بلند روشن پیشانی، لمبے گھنے سیاہ بال، جادوئی پلکیں، کشمیری سیبوں جیسے رخسار، یاقوتی لب، ستواں ناک، صراحی دار گردن، تنا ہوا بھرا بھرا گداز سینہ، کیلے کے گابھے سے ملائم ہاتھ، مخروطی انگلیاں، کمر کا شہوت انگیز پھیلاؤ، رس ٹپکاتی مسحور کن آواز کی گونج، جس میں بے پناہ جنسی لپک اب بھی موجود... یہ سب حسن خاں پہ اب وار کیوں نہیں کر پاتے؟

آئینہ جواب میں خموش رہتا تو وہ پاگلوں کی طرح اپنا ستر کھول کر دیکھتی۔ ''کیا اس میں کوئی کمی آگئی ہے۔'' حالانکہ کمی نہیں تھی بس وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ ہوا کا کام ٹھہرنا نہیں ہے اور ہوا اپنی طبیعت سے مجبور ہے۔ زمین اپنی جگہ پہ ثابت و قائم رہتی ہے یہ تو پاگل ہوا ہے جو کبھی یہاں کبھی وہاں۔ زرخیز مٹی کو ترستی رہتی ہے مگر پہل تو بیج ہی کو کرنی ہے۔ زمین پہل نہیں کرتی۔

جہاں بیج بویا جا رہا تھا وہاں پودا اگ رہا تھا۔

حسن خاں جدھر جدھر پیش رفت کر رہا تھا اُدھر اُدھر نتیجہ برآمد ہو رہا تھا۔

فرید کی ماں نے کئی بار سوچا کہ اپنی سوت سے بات کرے، اس کا استعمال کرے۔ کوئی ایسی کمی جو اس کی شکست کا سبب بن رہی ہو شاید وہ حسن خاں کی دوسری بیوی میں نہ ہو۔

''مگر اس سے مجھے کیا ملے گا؟'' اس نے سوچا۔

''حسن خاں کی شکست۔'' اندر اندر جواب نے سر اٹھایا۔

مگر وہ فوراً ہی اس خیال کے بھیانک پن سے کانپ اٹھی۔ وہ جانتی تھی جب افغان شکست کھانے لگتا ہے تو کتنا خوفناک اور بھیانک ہو جاتا ہے۔ اس نے لرز کر اپنے اردگرد دیکھا: کہیں کسی نے اس کا خیال پڑھ تو نہیں لیا؟ پھر فوراً ہی اپنے خوف پر خود نہیں آگئی۔ ''خانم اگر تو ایسے کانپتی اور لرزتی رہے گی تو کبھی بھی حسن

خاں پر تو غالب نہ آسکے گی۔ یکا یک اس کے لہو میں انگارے دوڑنے لگے اور قلانچیں بھرنے لگے۔ ''نہیں مجھے حسن خاں پر غالب آنا ہے۔ میں وہ کروں گی جو حسن خاں نہیں کر سکا۔''

اچانک ہی فرید کا سراپا اس کے پورے وجود پر حاوی ہو گیا۔

''فرید اب پڑھ کر آ رہا ہوگا... مدرسہ میں چھٹی ہو گئی ہوگی۔'' اسے خیال آیا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ چاہتی تو خادمہ کو بلا سکتی تھی مگر آج اس سے بہت کچھ نیا سرزد ہو رہا تھا۔ وہ خود ہی باورچی خانے میں گئی۔ سارا کھانا تیار تھا مگر پھر بھی اس کا جی چاہا وہ فرید کے لیے کچھ بنائے۔ اس نے نعمت خانے سے برف میں رکھا۔ خصی کا گوشت نکالا اور گریل تلنے لگی۔ باورچن ہڑبڑا کر دوڑی تو اس نے روک دیا۔ ''رہنے دو، آج میں خود بناؤں گی۔'' گریل تل کر اس نے جائزہ لیا۔ ''ہاں خوبانیاں ٹھنڈی ہیں۔''

اسی بیچ خادمہ نے فرید کے آنے کی خبر دی۔

خانم باورچی خانے سے تیز تیز چلتی ہوئی کمرے میں آئی۔ فرید اپنی کتابیں ٹیبل پر رکھ کر بستر پر لیٹ گیا تھا۔ خانم نے جھک کر فرید کا ماتھا چھوا۔ ''شاہزادے کیا بات ہے؟''

''امی۔'' فرید نہیں دیا۔ ''اس باپ کے بیٹے کو شاہزادہ کہہ رہی ہیں جسے تیری شادی کرتے ہوئے اپنے بچوں کا خیال بھی نہیں آیا؟''

''شاہزادے۔ تم کہاں کہاں کی باتیں سنتے رہتے ہو؟'' خانم ہنستی ہوئی فرید کے پاس بیٹھ گئی۔ ''یہ سب تمہارے باپ کے دشمنوں کی اڑائی افواہ ہے۔''

''کیوں امی؟ کیوں مجھے جھوٹی تسلی دیتی ہیں؟'' فرید غصہ ہونے کے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میرے ساتھیوں کو معلوم ہے، سارے شہر میں خبر پھیل چکی ہے اور آپ اس کو جھوٹ کہہ رہی ہیں؟

''کیوں؟ کیا ثبوت ہے کہ یہ خبر جھوٹ ہے؟'' فرید افغانی ؟؟ کے حصار میں تھا۔

''شاہزادے۔'' خانم نے بیٹے کے دونوں کاندھوں پر ہاتھ کا دباؤ دیتے ہوئے کہا: خدا کو، فرشتوں کو، جنت و دوزخ کو اور اپنے باپ کو بلا ثبوت ماننا چاہیے۔ باقی ہر شے ثبوت کی محتاج ہے۔ تمہارا باپ تمہارا باپ ہے۔ دوسروں کے کہنے پر اسے خطاوار نہ سمجھو۔ سمجھے شاہزادے؟''

''چلئے مان لیا۔'' فرید نہیں دیا۔ ''مگر آپ یہ اچانک مجھے شاہزادہ کیوں بنا بیٹھیں؟''

خانم نے اطمینان کا سانس لیا، تیر صحیح نشانے پر بیٹھا تھا۔ وہ یہی چاہتی تھی کہ فرید شاہزادے کے تخاطب پہ چونکے۔ اس کے اندر کہیں مسرت کی ایک ہلکی سی لہر اٹھی۔ ''جب پہلا تیر بھی خطا نہیں ہوا تو پھر فتح میری ہے۔'' وہ اسے اچھا شگون سمجھ کر مسکرا اٹھی اور بہت سنبھل سنبھل اور ٹھہر ٹھہر کر بولی: ''شاہزادے تو آپ تھے۔ آپ ہیں۔ آپ رہیں گے۔''

''اچھا شاہزادے کی امی۔'' فرید کھلکھلا کر ہنس دیا۔ ''آپ ہی کی بات صحیح۔ مگر آپ کو معلوم ہے۔ شاہزادہ بھوکا ہے۔''

''کھانا تیار ہے شاہزادے صاحب۔'' خانم کورنش بجالانے کے انداز میں جھکی اور دونوں ماں بیٹے ہنستے ہوئے دسترخوان پر آگئے اسی وقت چھوٹا سا نظام بھی کھیلتا ہوا آگیا اور تینوں ماں بیٹے کھانے میں مصروف ہوگئے۔

بچے کھانے کے بعد سو چکے تھے۔ باہر گرم ہواؤں کے جھکڑ اور بگولے تیز آواز کے ساتھ پوری فضا میں چکراتے پھر رہے تھے۔ گرمی اپنے شباب پر تھی۔ بدن پر آب رواں اور ململ کے بھی گراں گزرنے کا موسم آچکا تھا۔ خانم نے محسوس کیا کہ کمرے کے اندر جو تھوڑی بہت قابل برداشت فضا ہے یہ تو خس کی ٹٹی اور کمرے کی چھت میں ٹنگے لمبے چوڑے کپڑے کے پنکھے کو لگاتار باہر بیٹھی خادمہ کے ذریعہ جھلائے جانے کے سبب ہے۔ اسے نارخول کی خوشگوار صبحیں اور شامیں یاد آگئیں، سہسرام تو مہینے کے لیے جہنم کی بھٹی بن جاتا ہے، اور سہسرام ہی کیا۔ لوگوں کا تو کہنا ہے کہ لکھنؤ سے بھاگلپور تک کم وبیش یکساں انداز کی گرمی پڑتی ہے۔ نو بجتے بجتے لوگ اپنے اپنے کمروں میں بند ہوجاتے ہیں اور شام میں بھی چھ بجے سے پہلے کمرے سے باہر نکلنے کی اگر ہمت کر بھی لی جائے تو خواہش تو بہرحال نہیں ہوتی۔ خدام عصر بعد سے تقریباً سات بجے تک لگاتار چھڑکاؤ کرتے ہیں تب جاکے زمین کچھ ٹھنڈی ہو پاتی ہے۔

''اور اس پر حسن خاں کی بے تعلقی!''

خانم کو محسوس ہوا جیسے کسی نے پکے ہوئے پھوڑے پر انگارہ رکھ دیا، وہ تڑپ اٹھی۔ ''میرا قصور کیا ہے؟ میں نے تو حسن خاں کی دوسری شادی پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ آخر اس شہر میں میرے اور حسن خاں کے رشتہ داروں میں گل بہار خاں اور رازی خاں بھی تو ہیں جنہوں نے دوسری شادی کی تو ان کے گھروں میں ایسی جوتم پیزار مچی کہ خدا کی پناہ۔ حسن خاں کیا اندھا ہوگیا ہے؟ وہ کیوں نہیں دیکھتا کہ اس کی ہم قبیلہ اصیل النسب بیاہتا بیوی اس کو کس قدر ڈھیل دے رہی ہے۔

''کیا مجھے اب سختی کا حربہ آزمانا چاہیے؟'' وہ کشمکش میں گرفتار ہوئی۔

''نہیں خانم۔ تمہارا تو کوئی اپنا بھائی بھی سہسرام میں نہیں ہے، باقی رہے تمہارے مائیکے کے دو چار رشتہ دار تو دوسرے کے خرخشے میں کون اپنا دماغ خراب کرتا ہے... اسے سوت کا ایک جملہ یاد آیا۔ ''پرائی پیڑ امیں کون جلتا ہے؟''

خانم جیسے تھونس کر بیٹھ گئی۔

خانم چت لیٹی ہوئی کمرے کی چھت دیکھ رہی تھی، ایک بے سحر راز حزن کمرے کی فضا میں چاروں طرف تیر رہا تھا۔

اور باہر سائے میں گرم ہواؤں کے جھکڑ اور بگولے تیز آواز کے ساتھ چکراتے پھر رہے تھے۔

ساجد رشید

راکھ

بیماری اور موت مل کر بھی شمع کے چہرے کی کشش کو ختم نہیں کر سکے۔ جمال نے فرش پر رکھی بیوی کی لاش کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ شمع کا مردہ جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ صرف چہرہ کھلا تھا۔

شمع کی گھنی سیاہ پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ ایک ٹک اس کے سرخ و سفید چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ شمع نے پیالی اٹھا کر کوفی کا ایک گھونٹ لیا لیکن اس کی پلکیں بدستور جھکی رہیں۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ میز پر تھوڑا جھک گیا۔ میں بہت سیریسلی کہہ رہا ہوں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

جمال نے شمع سے کل بھی یہی بات کہی تھی۔ لیکن شمع نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ صرف جھرجھری لے کر رہ گئی تھی۔ جمال کی خواہش کو سن کر وہ خوف زدہ ہوگئی تھی۔ شادی کے اس تصور ہی سے اُسے بخار سا ہو جاتا تھا۔ جسے ساری دنیا کی عورتیں تحفظ سمجھتی ہیں'' بابا اگر پتہ چل گیا کہ ایک مسلمان لڑکے سے وہ شادی کرنا چاہتی ہے تو... سوچ کر ہی وہ کانپ جاتی تھی۔ دو برس قبل جمال سے اس کی ملاقات ایک فوٹو گرافی ایکزی بیشن میں ہوئی تھی۔ جسے تین امیچر فوٹو گرافرز نے مل کر ترتیب دیا تھا۔ شمع کو ایک تصویر بے حد پسند آئی تھی۔ جس کا عنوان تھا۔ ''زندگی'' جس میں ایک سی گل کو سمندر کی بپھری موجوں سے کچھ اوپر پرواز کرتے دکھایا گیا تھا۔

شمع نے جب ایکزی بیشن کے ناظم سے اس فوٹو گرافر کے بارے میں پوچھا۔ تو اس نے چشمہ لگائے ایک سانولے سے نوجوان کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جس نے ایک ڈھیلی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ وہ ایک عورت سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ جمال کو ایک عمدہ تصویر پر مبارک باد دینے کا خیال ترک کر کے وہ جب گیلری کی سیڑھیاں اُترنے لگی تب اس نے سوچا کہ یہ فنکار کی ناقدری ہے۔ وہ لوٹ کر ایکزی بیشن ہال میں آگئی تھی اور اس عورت کے جانے کا انتظار کرنے لگی تھی جو اپنی سوتی ساڑی سلیولیس بلاؤز اور ہینڈلوم کے جھولے کی وجہ سے کوئی آرٹ کریٹک معلوم ہو رہی تھی۔ اس عورت کے چلے جانے کے بعد شمع نے جمال کے قریب جا کر اپنا تعارف کراتے ہوئے تصویر کی تعریف کی تھی۔ دوران گفتگو اس نے بتا دیا تھا کہ وہ جے جے اسکول آف آرٹس میں انسٹرکٹر ہے اور ملازمت کا یہ اس کا پہلا سال ہے۔ دوسرے روز جمال نے جے جے اسکول میں جا کر شمع کو وہی تصویر تحفے میں پیش کی تھی۔ دونوں کی رسمی ملاقاتیں دوستی اور دوستی جلد ہی

محبت میں بدل گئی تھی۔

''جمال اگربتیاں کہاں ہیں؟'' جمال نے گردن گھما کر دیکھا اس کا فوٹو گرافر دوست منوج تھا۔ جمال نے وال کیبٹ سے اگربتی کا پیکٹ نکال کر منوج کو دیا۔ منوج نے اگربتیاں شیشے کے ایک گلاس میں ڈال کر شمع کے سرہانے سلگا کر رکھ دیں۔ دھواں دھیرے دھیرے بل کھاتا ہوا فضا میں ایسے تحلیل ہونے لگا جیسے کمرے کے بوجھل ماحول سے وہ بھی افسردہ ہو۔ منوج نے جمال کے قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم نے اپنے ڈیڈی کو خبر کر دی ہے؟ جمال نے اثبات میں سر ہلایا اور شمع کے بابا کو؟ جمال نے سر جھکا دیا۔ شمع کے بابا کو اس نے دادر ہندو کالونی میں خود جا کر خبر دی تھی۔ انہوں نے شمع کی موت کی خبر ایک سنگین خاموشی کے ساتھ سنی تھی اور اس کے گھر سے باہر نکلتے ہی دروازہ بند کر لیا تھا۔

''شمع اور میں شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' جمال کے اس جملے پر شمع کے بابا نے اپنے جنیئوں میں انگوٹھا ڈال کر اسے دو بار اوپر نیچے کیا اور پھر موٹے چشمے کے پیچھے سے اُسے گھورتے ہوئے بولے تھے ''تم جانتے ہو ہم لوگ پونیری برہمن ہیں۔ میرے پتا جی پونے میں اس عمر میں بھی جنم لگن اور مرتیو کی رسمیں کرتے ہیں اور تم ایک مانسا ہاری مسلمان... جمال اس سوال کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا۔ اس نے فوراً کہا۔ میں دھرم بدل لوں گا۔ جمال کے اس جواب نے کچن میں ماں کے ساتھ چھپ کر دونوں کی باتیں سن رہی شمع کے دل کے بوجھ کو کم کر دیا۔

''کوئی بھی غیر ہندو ہندو نہیں بن سکتا۔''

''اور اگر میں آریہ سماجی طریقے سے ہندو بن جاؤں کیا تب بھی آپ مجھے سویکار نہیں کریں گے؟''

نہیں کبھی نہیں'' بابا نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ ''کون کس دھرم میں پیدا ہوگا یہ ایشور کی اچھا سے ہوتا ہے۔ انسان کی مرضی سے نہیں سمجھے۔''

دورانِ گفتگو شمع کی ماں نے جمال کے لیے اپنی چھوٹی بیٹی کے ہاتھ سے جب اسٹیل کے گلاس میں پانی بھجوایا تو بابا نے بڑی ملائمت سے لڑکی سے کہا۔ ''شیشے کے گلاس میں پانی لاؤ جمال پانی پیے بغیر ہی وہاں سے اٹھ کر چلا آیا تھا۔ دوسرے روز جمال کو شمع نے بتایا کہ اس کے چلے جانے کے بعد اسے پہلی بار پتہ چلا کہ بابا مسلمانوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''اگر کسی مہار کے ساتھ بھی بھاگ جائے تو مجھے اتنا دکھ نہیں ہوگا جتنا ایک ملیچھ کے ساتھ شادی کرنے سے ہوگا کہتے ہوئے شمع رو پڑی تھی۔'' میں تمہیں نہیں چاہتی جمی۔ ہچکیوں سے اس کے کندھے ہلنے لگے تھے۔

اسی روز جمال نے اپنی والدہ کو شمع کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک تو خاموشی سے اپنے جوان بیٹے کے اتنے بڑے ارادے پر غور کرتی رہیں۔ پھر کہا۔ ''اگر وہ مسلمان ہو جاتی ہے تو میرے خیال میں تمہارے ابو کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' جمال دس بارہ دنوں تک شمع سے روز ہی ملتا رہا لیکن مذہب تبدیل

کرنے کی تجویز اس کے سامنے رکھنے کی ہمت وہ اپنے میں مجتمع نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک روز سمادر ریسٹورنٹ میں جمال نے کھانے کے لیے شمع کو پوچھا تو اس نے یاد دلایا کہ آج اس کا منگل وار کا برت ہے۔ وہ صرف لیمو پانی لے گی۔ جمال نے کوفی ختم کر لی لیکن وہ اپنا منشا بیان نہ کر سکا۔ شمع نے لیمو پانی کے گلاس پر اُبھر آنے والے الخرات کی بوندوں کو انگلی سے پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''میرے بابا تمہارے ہندو ہو جانے کے بعد بھی تمہیں سویکار کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے۔ میں ہی مسلمان ہو جاتی ہوں۔''

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شمع اتنا بڑا فیصلہ اتنی جلدی کر لے گی۔ شمع نے ایک روز خاموشی سے بدن کے کپڑوں کے ساتھ گھر اور مذہب دونوں کو چھوڑ دیا۔ جامع مسجد میں کلمہ پڑھ کر وہ شمع کلکرنی سے شمع جمال ہو گئی۔ مسجد ہی میں جمال اور شمع کا نکاح ہوا تھا۔

جمال کی بڑی بہن نے کمرے میں شمع کے مردہ جسم کو دیکھتے ہی ایک دبی دبی چیخ ماری اور جمال سے لپٹ کر رونے لگیں۔ جمال کی آنکھیں خشک تھیں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سینے میں کوئی وزنی پتھر رکھا ہوا ہو۔

یہ کیسے ہو گیا جمال؟... وہ روتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔

''خدا کو یہی منظور تھا باجی، حوصلہ رکھئے۔''

بڑی بہن نے دوپٹے سے آنکھیں خشک کر کے اپنی والدہ کو رو والا کی بابت دریافت کیا کہ وہ اب تک کیوں نہیں پہنچے۔ پھر اس نے مراٹھی ترجمہ والے قرآن کو کپ بورڈ سے اُتارا اور شمع کے قریب بیٹھ کر وہ دھیمی آواز میں تلاوت کرنے لگی۔ شمع عربی تو نہیں پڑھ سکی تھی۔ البتہ کبھی کبھار قرآن کا مراٹھی ترجمہ ضرور پڑھ لیا کرتی تھی۔

جمال کو اس درمیان منفاس ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں سینئر فوٹو گرافر کا جاب مل گیا تھا۔ ایجنسی نے ہی اسے بور بولی میں سنگل روم کا ایک فلیٹ بھی الاٹ کر دیا تھا جو میاں بیوی کے لیے کافی تھا۔ وہ اس فلیٹ میں شمع کے ساتھ منتقل ہو گیا تھا لیکن ہفتے کے روز دونوں محمد علی روڈ جمال کے والد کے مکان پر ضرور جاتے تھے شمع نے ایک روز سوچا کہ اتنا عرصہ گذر چکا ہے۔ بابا نہ سہی آئی (ماں) نے تو اس کو معاف کر دیا ہوگا۔ وہ جمال کو بتائے بغیر کالج سے فارغ ہو کر دادر ہندو کالونی پہنچ گئی۔ وہ دروازے پر کھڑی بیل بجاتی رہ گئی۔ لیکن کسی نے دروازہ نہیں کھولا شاید آئی ہول سے اسے دیکھ لینے کے بعد ایسا کیا ہو۔ اس کے بعد اس نے پھر کبھی ماں کی دہلیز کا رخ نہیں کیا۔

شمع نے خود کو جمال کے گھر کی تہذیب کے مطابق ڈھالنے کی پوری کوشش کی تھی۔ رمضان کے روزے اس نے پہلی بار رکھے۔ لیکن منگل وار کے برت کا اس کا معمول برقرار رہا۔ جمال جب تک گھر نہیں آجاتا وہ کھانا نہیں کھاتی تھی۔ اس نے یہ عادت اپنی آئی سے پائی تھی۔ آئی کہا کرتی تھی۔ پتی پرمیشور ہوتا

ہے پتنی کو اس سے پہلے کھانا نہیں کھانا چاہیے۔ جمال نے اسے کئی بار سمجھایا کہ ان کے یہاں اس قسم کی کوئی تہذیب نہیں ہے۔ اسے وقت پر کھا لینا چاہیے۔ لیکن وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال جاتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ محبوبہ جب بیوی بنتی ہے تو اس میں پہلے جیسی کشش نہیں رہ جاتی۔ لیکن شادی کے بعد بھی دونوں کی محبت میں نہ صرف شدت آ گئی تھی بلکہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھورا محسوس کرتے تھے۔

کمرے میں شمع کے بے جان جسم کے قریب ہی باجی اور کچھ دوسری رشتے دار عورتیں اور بچیاں قرآن کی تلاوت کر رہی تھیں۔ ابو اور امی بھی پہنچ گئے۔ امی تو شاید راستے بھر روتی رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ انہوں نے آتے ہی جمال کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ جیسے اس کے سینے کا سارا درد اپنے کلیجے میں اُتار لینا چاہتی ہوں۔ تب بھی اس کی آنکھیں خشک ہی رہیں۔

''بیٹے غسالہ کو میں نے خبر کر دی ہے۔ وہ بس آتی ہی ہوگی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کہا۔ ابو دروازے کے قریب سوسائٹی کے دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑے ہوئے اپنی بہو کی ملنساری اور سگھڑپن کی تعریفیں کر رہے تھے۔ ''رمضان کے مہینے میں بہو نے سارے روزے رکھے اور پانچوں وقت نماز ادا کی، کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ غیر قوم سے آئی ہے۔ میت میں آنے والے بھی مرحومہ کی انہیں صفات پر تعریفی کلمات ادا کر رہے تھے۔

گذشتہ ایک مہینے سے شمع کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی ڈاکٹر نے یرقان تشخیص کیا تھا۔ بیماری کے سنگین نتائج بھی نکل سکتے ہیں یہ بھی متنبہ کر دی تھی۔ کیونکہ شمع امید سے تھی۔ جمال نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس کی یہ بیماری اتنی خطرناک ثابت ہوگی۔ ورنہ وہ دفتر سے چھٹی لے کر خود ہی اس کی نگہداشت کرتا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے بیماری کے دنوں میں بھی شمع کو منگل وار کا برت رکھنے سے نہیں روکا۔ دو تین روز قبل شمع کرون میں چار پانچ قے ہوئی تو وہ روانسی ہوگئی۔ اس نے جمال سے کہا'' دیوالی میں میں اپنے بابا اور آئی کا آشیرواد لینے نہیں گئی تھی۔ نا شاید اسی کا پاپ ہے۔'' جمال نے اس بات پر اسے محبت بھری ڈانٹ پلائی تھی کہ وہ پڑھی لکھی ہو کر اس طرح کے وہم رکھتی ہے۔ اس نے کہا تھا'' وہم ہے یا حقیقت میں نہیں جانتی لیکن پنر جنم میں میرا وشواس ضرور ہے میری اوپر والے سے یہی پرارتھنا ہے کہ دوسرے جنم میں بھی وہ مجھے تمہاری ہی پتنی بنائے۔'' اس جملے پر جمال نے بے اختیار بخار سے گرم اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

کل رات اچانک ہی شمع کی طبیعت بگڑ گئی۔ ڈاکٹر کو بلوایا گیا۔ ڈاکٹر نے انجکشن اور دوائیں دے کر اس خدشے کا اظہار ضرور کر دیا تھا کہ یہ یرقان اپنے آخری اسٹیج پر ہے اس لیے شمع کو کل سویرے ہی کسی اچھے اسپتال میں داخل کروانا بہت ضروری ہے۔ جمال نے آنکھوں میں ہی ساری رات کاٹ دی تھی۔ انجکشن کی وجہ سے شمع گہری نیند ضرور سوئی لیکن صبح جاگنے کے بعد اس کی حالت پھر بگڑ گئی۔ شمع کی ایسی حالت دیکھ کر جمال بری طرح نروس ہوگیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو فون کیا لیکن ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی شمع بجھ گئی تھی۔

''بیٹے تمام لوگ آ چکے ہیں۔ غسالہ نے میت کو غسل تک دے دیا ہے۔ ابو جمال کو قریب بلا کر بولے۔ دھن کے لیے کیا سوچا ہے مغرب بعد یا عشاء بعد؟

انہیں جواب دینے کے بجائے جمال شمع کی لاش کو دیکھنے لگا جسے غسل کے بعد کفن پہنا کر دیدار کے لیے رکھا گیا تھا۔ غسل کے بعد چہرہ اب اور نکھر آیا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ ابھی اٹھ کر کہے گی ''ارے مجھے جگایا کیوں نہیں؟'' اور اکثر چھٹی کے روز جمال پہلے اٹھ جاتا تو خود ہی چائے بنا کر پی لیتا۔ شمع کو گہری نیند سے جگانے میں اسے اس لیے تکلف ہوتی تھی کہ وہ ہفتے کے چھ روز بڑے سویرے اٹھ کر گھر کے کام کاج میں جٹ جاتی تھی۔ اسے دفتر بھیجنے اور کالج جانے کی تیاری میں اسے کافی وقت لگتا تھا۔ اس لیے عام دنوں میں صبح سویرے اٹھنا اس کی مجبوری تھی۔

مہرہ صاحب نے کہا ہے کہ ایجنسی کی طرف سے شمع کی ایک Obituary ٹائمز آف انڈیا۔ میں دی جائے۔

منوج نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

جمال نے کاغذ پر نظر ڈالی۔

شمع، جمال

تاریخ پیدائش: ۱۸/اپریل بروز بدھ ۱۹۶۸ء

تاریخ وفات: ۳/جون بروز منگل ۱۹۹۵ء

جمال کی نگاہ تاریخ وفات پر آ کر ٹھہر گئی۔ اوہ آج منگل وار ہے۔ شمع کے برت کا دن! شمع نے اُسے بتلایا تھا کہ ہر منگل وار کو گنیش جی کا برت میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے رکھ رہی ہوں۔ کبھی ناغہ نہیں کیا۔ اس نے بڑے فخر سے کہا تھا شمع کی آواز کی بازگشت دیر تک جمال کی سماعت میں جاری رہی۔

''جمال میاں تم نے بتایا نہیں تدفین کب ہوگی۔'' ابو جی نے دوبارہ اُسے یاد دلایا۔ جمال نے نم آنکھوں سے شمع کی لاش کی طرف دیکھا۔ سرہانے اگر بتیاں سلگ رہی تھیں۔ دھوئیں کی نیلی گاڑھی لکیریں فضا میں دھیرے دھیرے رینگ رہی تھیں۔ اماں اور باجی تلاوت کر رہی تھیں۔

''شمع کو قبرستان نہیں شمشان لے جانا ہے۔''

''ہیں! جمال کے اس جواب پر ابو کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ چند ثانیوں تک وہ بیٹے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ جو فرطِ جذبات سے لرز رہا تھا۔ پھر انہوں نے شمع کی لاش کو غور سے دیکھا اور غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ کیا یہ اس کی اپنی خواہش تھی؟''

نہیں۔ اس کے اور میرے درمیان اس موضوع پر کبھی بات نہیں ہوئی اور پھر اتنی جلدی یہ سب کچھ ہو جائے گا ہم نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔''

''دیکھو میاں وہ مسلمان ہوچکی تھی۔ اس نے کلمہ پڑھا تھا...'' ابو دانتوں کو بھینچ کر سخت لیکن دھیمی آواز میں بولے ''اس نے میرے مذہب سے متاثر ہوکر اپنا مذہب نہیں بدلا تھا۔ مجھے حاصل کرنے کے لیے اس نے مذہب تبدیل کرنے کی رسم ادا کی تھی۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' ابو کی آواز غصے سے بلند ہوگئی۔ کمرے اور راہداری میں موجود تمام لوگ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

میں کہہ چکا ہوں جو مجھے کہنا ہے۔ میں اس کی آتما کو سکون پہنچانا چاہتا ہوں۔''

کیا جلانے سے اس کی آتما کو سکون مل جائے گا۔'' ان کا لہجہ اتنا ہی تیز اور تلخ تھا امی اور باجی کلام مجید رحل پر بند کر کے باپ بیٹے کے قریب چلی آئیں۔

''ابو ذرا سوچیے شمع نے میرے لیے مذہب بدل دیا تو میں اس کی آتما کو سکون پہنچانے کے لیے اتنا بھی نہیں کرسکتا۔''

امی اور باجی نے اسے خدا کا واسطہ دے دے کر سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا۔ ''شمع کی آتما کو واہ سکار سے ہی سکون ملے گا۔''

ابو زیادہ دیر برداشت نہ کر سکے اور امی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے سیڑھیوں سے دھم دھم کرتے ہوئے اتر گئے۔ باجی کچھ لمحوں تک اس کا منہ تکتی رہیں۔ پھر شمع کے لیے جان چہرے پر ایک نظر ڈال۔ برقعہ پہنتے ہوئے وہ بھی چلی گئیں۔ ایک ایک کر کے سارے رشتے دار، اور شناسا اپنی چشمگین نگاہوں کی حدت کو کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ کمرے میں اب صرف اگربتیوں کا دھواں اذیت ناک خاموشی کے ساتھ لپٹ کر گریہ کر رہا تھا۔

منوج کی دستک پر دروازہ کھلا سامنے شمع کے بابا کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے آئی منہ میں پلو دیے ایسے کھڑی تھیں جیسے رو پڑیں گے۔ بجھے ہوئے چہرے اور دھندلی آنکھوں سے انہوں نے جمال کو شاکی نظروں سے دیکھا۔ جمال نے پیتل کی ایک چھوٹی سی کلسی جس کے منہ پر سرخ کپڑا بندھا تھا۔ بابا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں آپ کی بیٹی کو لونا نے آیا ہوں۔''

بابا نے کلسی کی طرف کانپتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ آئی دونوں ہاتھوں کو منہ پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں اور جمال کی آنکھوں میں ٹھہرا آنسوؤں کا سیلاب بھی بہہ نکلا۔

اعظم راہی

کبوتری

گھنٹی کی آواز پر ہاجرہ نے دروازہ کھول دیا۔

''آپ...''

عرفان نے اس کی بوکھلاہٹ میں چھپی بیزارگی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''میں خالہ جان سے ملنے آیا تھا...''

اور وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوگیا۔

''کیا بات ہے آج گھر میں خاموشی سی چھائی ہوئی ہے...؟''

''سب لوگ باہر گئے ہیں...''

عرفان نے محسوس کیا کہ ہاجرہ اس کی موجودگی سے اکتاہٹ سی محسوس کررہی ہے۔ اس نے فوراً لوٹ جانے کا فیصلہ کرلیا۔

''ٹھیک ہے میں پھر آجاؤں گا...''

اور وہ دروازہ کی طرف بڑھ گیا۔

''ٹھہریئے...''

نہ جانے ہاجرہ کی آواز میں کون سی طاقت تھی کہ عرفان کے قدم رک گئے۔

''چائے پیتے جایئے۔ میں ابھی لاتی ہوں...''

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھ گیا اور ہاجرہ چائے لانے کے لیے اندر چلی گئی۔

کل تک ان کی بے تکلفی اور پیار خموشی کے پردے میں مسکرا رہا تھا لیکن ان کے انکار کی جرأت نے عرفان کے خوابوں کو مسمار کردیا تھا اور وہ سمجھ ہی نہیں پایا کہ ہاجرہ کے انکار کی وجہ کیا تھی۔

''چائے لیجئے...''

عرفان خیالات کی دنیا سے باہر آگیا۔ اس نے ہاجرہ کے ہاتھ سے چائے لے لی اور پوچھا۔

''سب لوگ کہاں گئے ہیں...؟''

''بھائی جان کی شادی کی تاریخ پکی کرنے کے لیے...''

یہ کہتے ہوئے ہاجرہ نے عرفان کی طرف دیکھا اور اسے اپنی طرف دیکھتا پاکر اپنے آپ کو چرا گئی۔

چائے کی پیالی رکھتے ہوئے عرفان اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا میں چلتا ہوں۔کل کسی وقت آجاؤں گا...''

اس نے ہاجرہ کی بڑھتی ہوئی اجنبیت کو محسوس کرتے ہوئے وہاں سے چلنا ہی مناسب سمجھا۔

ہاجرہ ڈرائنگ روم کا دروازہ بند کر کے آنگن میں آگئی۔ عرفان کے آجانے کی وجہ سے اس کا موڈ خراب سا ہوگیا تھا وہ بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی نیم کی چھاؤں تلے رکھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ اپنے اندر پلنے والی اداسی سے وہ خود ہی پریشان سی تھی۔ اپنے آپ کو سنبھالنے اور بے نیاز بنانے کی کوششوں میں اسے کامیابی نہ مل سکی۔

دیوار کی منڈیر پر دھوپ تاپتے کبوتر ہاجرہ کو دیکھ کر نیچے اتر آئے اور ہاجرہ کے اطراف بیٹھنے لگے۔ وہ کچھ دیر کے لیے اپنی الجھنوں سے دور ہوگئی اور پاس ہی پڑے ہوئے ڈبے سے دانہ لیکر اسے فضا میں بکھیر دیا۔ تمام کبوتر دانے پر ٹوٹ پڑے اور ہاجرہ بڑے انہماک سے انہیں دیکھنے لگی۔ اچانک اسے کبوتری یاد آگئی۔ پچھلے دنوں جس کا نر کسی اور کبوتری کے ساتھ چلا گیا تھا۔ ہاجرہ نے دیوار کی منڈیر پر نظر دوڑائی۔ ایک کونے میں بیٹھی وہ اپنا منہ پروں میں چھپائے ہوئے تھی۔ ہاجرہ کو اس پر بڑا ترس آیا۔ اس کا دل کسی غیر شعوری غم سے آشنا ہوگیا۔ اس نے سوچا چاہے انسان ہو یا حیوان ''مرد'' ہر روپ میں ہرجائی ہوتا ہے اور پھر درد کی ایک بے پناہ لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ اس نے اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹیک دیا۔ زندگی کی کتاب کے کئی ورق ہوا کے ایک جھونکے سے پلٹ گئے۔ ماضی کسی کسی لمحے نے اس کے تصور میں ایک گھنٹی سی بجائی۔ کسی نے دروازہ کھولا اور اس نے اپنے کمرے سے جھانکا۔ ریاض ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہا تھا۔ ہاجرہ نے اپنے دل میں ایک ہلکی سی گدگداہٹ محسوس کی اور اس کا چہرہ گلابی ہوگیا۔ وہ کمرہ سے فوراً باہر نکل آئی اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔ پھر ریاض اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوگیا۔

''شاکرہ اور خالہ جان کدھر ہیں...؟''

اس نے بات کرنے کی راہ نکالی۔ باجی شاید نہا رہی ہیں اور امی باورچی خانہ میں ہیں۔ ہاجرہ دروازہ سے لگ کر ریاض سے باتیں کرنے لگی۔

''کل رات تم لوگ کہاں گئے تھے؟ میں کوئی گیارہ بجے ادھر سے گزرا تھا...''

''عابدہ باجی کے لڑکے کی بسم اللہ تھی نا! وہیں گئے تھے۔ امی جان تھیں کہ اٹھنے کا نام تک نہ لیتی تھیں۔ یہاں بے چاری شاکرہ اکیلی تھی اور انور بھائی بھی نہیں تھے۔ میں، گیارہ بجے ان کے آنے کے بعد گیا...''

''جہاں اتنی دیر ٹھہرے ایک آدھ گھنٹہ اور میرا انتظار کر سکتے تھے...؟''

''ہاجرہ کے لہجے میں شکایت تھی...''

''اسی بات کی معافی مانگنے کے لیے تو آیا ہوں...''

اور وہ کرسی سے اٹھ کر قریب آگیا۔

''ارے چھوڑیئے بھی۔ کوئی دیکھ لے گا۔ آپ بڑے وہ ہیں...!''

اس کے لہجے میں پیار جھلک رہا تھا۔

''میں تو وہ ہوں ہی۔ پر تم کیا ہو...؟''

''یہ۔'' ہاجرہ نے انگوٹھا بتاتے ہوئے کہا۔

ریاض دوبارہ اس کی طرف بڑھا لیکن ہاجرہ نے پرے ہٹ کر سرگوشی میں کہا۔ کوئی آرہا ہے۔ ریاض جہاں تھا وہیں رک گیا اور وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

''خیر پھر کبھی دیکھ لوں گا...''

آپ تو موقعہ محل کچھ دیکھتے ہی نہیں۔ بس...!''

''بس کیا...؟''

ریاض نے شرارت آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس رات... اگر کوئی دیکھ لیتا تو...!''

ہاجرہ کی آنکھوں میں ہلکا سا خوف جاگ اٹھا۔

''تو اس میں گھبرانے کی کیا بات تھی۔ اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تو سوائے اس کے کہ ہماری شادی ہو جاتی اور کیا ہوگا...؟ چھوڑو ان باتوں کو اور جلدی سے ایک کپ گرم گرم چائے پلاؤ...''

ہاجرہ چائے بنانے کے لیے باورچی خانے کی طرف چلی گئی اور ساتھ ہی ریاض بھی اس کے کمرہ سے باہر آگیا۔ سامنے سے شاکرہ نہا کر آرہی تھی۔ وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ہاجرہ چائے لیے جب شاکرہ کے کمرے کے سامنے سے گزرتی تو اندر ریاض کی آواز سن کر باہر ہی ٹھہر گئی۔

''کل اگر عین موقع پر انور بھائی آجاتے تو...؟''

''شاکرہ کا یہ جملہ سنکر ہاجرہ کے دل پر بجلی گر پڑی اور چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا اور اسکے ساتھ ہی تصور کے تانے بانے بھی ٹوٹ گئے۔ وہ پھر اپنی دنیا میں پلٹ آئی جو ویران اور اداس تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں اور سارے کبوتر دانہ چگ کر دیوار پر جا بیٹھے تھے۔ اس نے دیوار پر بیٹھی اُداس کبوتری کو دیکھا۔ وہ بدستور اپنے پروں میں منہ دبائے بیٹھی تھی۔ ہاجرہ کی آنکھوں سے آنسو اسکے رخسار پر ڈھلک آئے۔ شام ہو رہی تھی دھندلکے آنگن کے کونوں سے نکل کر پھیلنے لگے تھے۔ اس نے اپنے دوپٹے سے آنسو صاف کئے اور کمرہ میں آکر مسہری پر دراز ہوگئی۔ ماضی کے چھپے نشتروں نے پھر ایک بار دل کے زخم تازہ کر دیے۔ وہ دیر تک چھت کو تکتی رہی اور آخر اس کے اداس دل اور تھکے ہوئے ذہن کو غنودگی کا سہارا مل ہی گیا۔ کال بل کی مسلسل آواز پر ہاجرہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو شاکرہ اور امی سامنے کھڑی تھیں۔ اس نے شاکرہ کی گود سے منے کو لے لیا اور کمرہ میں آکر اسے مسہری پر لٹا دیا۔

''کب سے گھنٹی بجا رہی ہوں...''

''آنکھ لگ گئی تھی...''

''یہ سات بجے کا ہے کا سونا؟ کھانے کے لیے کچھ بنایا بھی یا یوں ہی پڑی سوتی رہیں...''

''کچھ نہیں بنا سکی...'' اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

''تمہاری آنکھیں سوجی ہوئی کیوں ہیں؟ کیا روئی ہو...؟''

شاکرہ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہ... نہیں تو...''

''ہاجرہ اچانک اس کے سوال پر بوکھلا گئی۔

''ہاجرہ! مجھ سے مت چھپاؤ۔ بتاؤ کیا بات ہے...؟''

''جی کچھ بھی تو نہیں...'' اور وہ کمرہ سے باہر جانے لگی۔

''میں نہیں مانتی...'' شاکرہ نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں باجی۔ کہا نا کہ سونے کی وجہ سے آنکھیں سوج گئی ہیں...'' ہاجرہ نے ٹالتے ہوئے کہا اور ہاتھ چھڑا کر کچن کی طرف چلی گئی۔

رات شاکرہ بچے کو سلا کر جب ہاجرہ کے پاس آئی تو وہ مسہری پر پڑی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی!

''ہاجرہ...'' وہ شاکرہ کی آواز سن کر چونک پڑی۔

''آپ...!''

''تم سوئی نہیں ابھی تک...؟''

''ابھی شام ہی کو سوئی تھی نا۔ شاید اسی لیے نیند نہیں آ رہی ہے۔ آپ نے بتایا نہیں کہ انور بھائی کی شادی کی تیاری کس طرح ہوگی...''

''انور بھائی، سلیم کو تار دینے گئے ہیں بس ان کے آتے ہی تیاریاں شروع ہو جائیں گی۔ ویسے امی جان نے بہت کچھ پہلے سے ہی کر رکھا ہے نا...''

''کیا منا سو گیا...؟''

''ہاں! آج اس نے بہت تنگ کیا ہے...''

''ہی بچے سے آپ تنگ آ گئیں؟ اسے یہاں چھوڑ جایئے...''

''کیوں...؟''

''اس سے دل بہل جائے گا میرا...''

''ہاجرہ... تم شادی کے لیے کیوں نہیں راضی ہوتیں...؟''

شاکرہ کے اس جملے پر کچھ دیر کے لیے کمرہ کی فضا بوجھل ہو گئی۔

''امی جان بھی تمہاری طرف سے بہت فکرمند ہیں۔ ان کی بیماری بھی تمہاری اسی ضد کی وجہ سے ہے...''

''باجی— آپ ان باتوں کو نہ چھیڑیں تو اچھا ہے...''

''باجرہ... زندگی دکھوں اور مسرتوں کا مجموعہ ہے جہاں ہمیں ان جانے میں دکھ مل جاتے ہیں وہیں ہم اپنی کوششوں سے خوشیاں بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ بھول جاؤ پچھلی باتوں کو... باجرہ...؟''

وہ اس کے قریب آ گئی۔

''میں تم سے سچ کہتی ہوں باجرہ۔ شادی سے پہلے میں تمہاری طرح ہی سوچا کرتی تھی کہ ایک لٹی ہوئی عورت کس طرح ایک دوسرے مرد کو خوشیاں دے سکتی ہے۔ اپنی ایک نئی دنیا بسا سکتی ہے۔ تمہاری طرح مجھے بھی یہ دنیا ویران اور زندگی ایک بوجھ محسوس ہوتی تھی۔ لیکن شادی کے بعد میری زندگی میں ایک نیا انقلاب آ گیا۔ میں نے سلیم سے وہ سب کچھ پایا جو کبھی ریاض سے حاصل کرنے کی آرزومند تھی۔ اب میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں۔ میں کبھی تمہاری طرح اپنی قسمت پر آنسو بہایا کرتی تھی لیکن اب مجھے وہ واقعہ یاد آتا بھی ہے تو حیدر اور ایاز کی طرح جن کے ساتھ ہم بچپن میں میاں بیوی کا کھیل کھیلا کرتے تھے۔ لیکن اب وہ سب کچھ ایک قصہ پارینہ بن چکا ہے...''

''لیکن باجی میں... میں آپ سے کچھ مختلف ہوں، میں اپنی بربادی کو کسی طرح بھی بھلا نہیں سکتی اور اب میرے دل میں زندگی سے نباہ کی چاہ ہے اور نہ میرے دل میں کسی کی آرزو ہے اور نہ اب مجھے کسی مرد پہ بھروسہ ہے...''

''لیکن۔'' باجی! ہر آدمی سلیم نہیں ہوتا!

''میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں باجرہ۔ ہر آدمی۔ ریاض نہیں ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ تم نے عرفان کو پہچانا ہی نہیں۔ اپنی آنکھیں کھولو۔ سچائی اور محبت کو پہچاننے کی کوشش کرو۔'' شاکرہ اس کے کمرہ سے چلی گئی۔

دوسرے دن صبح جب وہ غسل کر کے آنگن میں بچھی پیلی پیلی دھوپ میں اپنے بالوں کو تولیہ سے جھٹکنے لگی تو دیوار پر بیٹھے کبوتر آنگن میں اترا آئے۔ باجرہ بالوں کو کھلا ہی چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ نیم تلے رکھے ڈبے سے دانہ نکال کر اس نے فضا میں بکھیر دیا اور سارے کبوتر دانے پر ٹوٹ پڑے اور وہ بڑے ہی انہماک سے انہیں دیکھنے لگی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اسے یہ احساس ہوا کہ غم زدہ کبوتری اس بھیڑ میں نہیں ہے تو خود بخود اس کی نظریں دیوار کی طرف اٹھ گئیں لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

اس نے ادھر اُدھر دیکھا وہ کہیں بھی نظر نہ آئی۔ اچانک پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سن کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ ایک نئے کبوتر کے ساتھ آنگن میں اتر رہی تھی۔

باجرہ کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ چند لمحوں کے لیے وہ سوچ کی دنیا میں گم ہو گئی۔ ڈرائنگ روم میں کال بل بج رہی تھی۔ امی جان نے باورچی خانے سے آواز دی ''شاکرہ دیکھو تو کون آیا ہے...؟''

''عرفان آئے ہیں امی...!''

شاکرہ کی آواز سنائی دی اور باجرہ کے دل کی زمین پر تمنا کا کونپل پھوٹ پڑا۔

مظہر الزماں خاں

ایک شہر جو کبھی آباد تھا

مختلف ممالک کے سیاحوں کا قافلہ شیخ سعدی کا مرثیہ پڑھتا ہوا جب باب شہر میں داخل ہو رہا تھا، ایک سیاہ کتا شہر کے اندر سے دوڑتا ہوا آیا اور ہم سیاحوں کے پانو کے درمیان سے ہوتا ہوا شہر سے باہر نکل گیا تھا اور جب ہم شہر معدوم میں داخل ہوئے تو فصیلِ جسم سے پشت لگائے ایک ہزار ہا سالہ بوڑھا بیٹھا ہوا تھا، جس کے قریب ایک پھٹا ہوا جوتا پڑا ہوا تھا، جس میں ایک مرا ہوا سفید چوہا تھا اور فصیل کی دائیں جانب ایک جدید توپ رکھی ہوئی تھی، جس کا رُخ شہر کی طرف تھا اور توپ چی کے مقام پر ایک اُلو بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ہزار سالہ بوڑھے نے رقت انگیز آواز میں ہم سیاحوں سے کہا۔ رکو! اور شہرِ برباد میں داخل ہونے سے پہلے اس شہر کی مختصر کہانی سنتے جاؤ کہ یہ شہر آباد ہونے سے پہلے بھی، میں موجود تھا اور برباد ہونے کے بعد بھی میں موجود ہوں۔ کیونکہ آبادی اور بربادی کے درمیان بس ایک سانس لیتا ہوا لمحہ ہوتا ہے جو اپنے حصار سے نکل جاتا ہے تو شہر ویران ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس شہر کی آبادی کے پانو جب پہلی بار پیدا ہوئے تھے تو بہت مطمئن اور اعتدال پسند تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ان کا اطمینان اور اعتدال رخصت ہوتے گئے اور پھر ایک دن بے اعتدالی نے انہیں بالکل پاگل بنا دیا اور جب پانو پاگل ہو گئے تو تمام معمور و منور راستے ان کے نیچے سے نکل کر زندہ زمینوں کی طرف فرار ہو گئے اور پھر زمین باغی ہو گئی اور زمین کا باغی ہو جانا قوموں اور شہروں کی تاریخ کا زوال ہے۔ چنانچہ اس زوال نے مجھے بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ابھی تک میں اس کی لپیٹ میں ہوں، مگر دور بہت دور سے اب دھم دھام دھم کی نئی آوازیں مجھے سنائی دے رہی ہیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ فصیلِ جسم پر تازہ لہو کے چھینٹے پھیل جائیں، میں یہیں بیٹھا تمہاری واپسی کا انتظار کروں گا۔

بوڑھے نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ہماری طرف دیکھتے ہوئے حسرت سے کہا: اس شہر خانہ خراب میں داخل ہونے سے پہلے اپنے ساتھ یہ سکے لیتے جاؤ کہ ان دنوں اس شہرِ کرب میں انہیں سکّوں کا چلن ہے اور پھر ہم سبھوں نے دیکھا کہ سکّوں پر مختلف جانوروں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ چنانچہ ہم نے بوڑھے سے چند سکّے حاصل کیے اور شہرِ ملال میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ شہر بظاہر بھرا ہوا تھا لیکن اصل میں خالی خالی تھا۔ البتہ گھروں کی دیواروں، منڈیروں، چھتوں اور خزاں گزیدہ درختوں پر کوّے ہی کوّے بیٹھے پکار رہے تھے۔ ہم نے سُنا تھا کہ شہرِ افسوس میں ان دنوں کثرت سے کوّے پیدا ہو گئے ہیں۔ سو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ہر طرف کوّے ہی کوّے پکار رہے تھے اور چاروں طرف ایک عجیب سی بانجھ بانجھ سی بدکار اُداسی اس شہرِ منحوس پر پھیلی ہوئی تھی اور ہمیں یوں لگ رہا تھا کہ اُداسی کی سیاہ اور گہری چادر نے ہمیں بھی لپیٹ لیا ہے۔ چنانچہ ہمارے پانو بار بار ہمارے جسم سے اور اس زمین سے مایوس ہوتے چلے جا رہے تھے اور جب پانو مایوس ہو جاتے ہیں تو انہیں کوئی بھی زندہ زمین قبول نہیں کرتی کہ یہ اُن قوموں کی

تاریخ ہے جو تیز دھوپ سے گھبرا کر اپنے پانو، اپنے خوف زدہ جسموں میں چھپا لیتے تھے تو وہ باقی نہیں رہتے تھے، جیسا کہ یہ شہر باقی نہیں رہا۔ کیونکہ کسی بھی شہر کی زندگی کی، حیات کا بے خوف سفر اس کی صحت مند سانسوں کی گرم رفتاری سے ہی باقی رہتا ہے اور جب شہر کی سانسیں ٹوٹ جاتی ہیں تو وہ باقی نہیں رہتا کہ حیات کا تعلق صرف زندگی سے نہیں بلکہ زندگی کی حیات سے ہوتا ہے۔ بہرحال جب ہم اپنے مقام سے اس شہرِ گم کو دیکھنے نکلے تو تمام سفر ہم نے اُداسی یا کاہلی محسوس نہیں کی تھی کہ ہمارے سروں پر کسی قسم کا بوجھ نہیں تھا لیکن جوں ہی ہم نے شہرِ ملامت میں قدم رکھا، ہمیں یوں محسوس ہوا کہ ہمارے مکمل سروں پر اچانک اونگھ نے حملہ کر دیا ہے اور جب بھی اونگھ سروں پر حملہ کرتی ہے سر سو جاتے ہیں اور جب سر سو جاتے ہیں تو علم، عقل، تہذیب، اخلاق، سچائی اور شجاعت اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں اور صبحِ تازہ فصیلِ شہر کی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر نئی زمینوں کی طرف لوٹ جاتی ہے تو شہرِ بقا، شہرِ فنا کا سیاہ لباس پہن لیتا ہے۔ بہرحال جب ہم شہرِ ملال کے ایک بڑے سے ایوان میں داخل ہوئے تو سارا محل بے شمار اشیاء اور پرچھائیوں سے بھرا ہوا لیکن مکینوں سے خالی تھا۔ کیونکہ جب اشیاء کی اہمیت بڑھ جاتی ہے تو انسانوں کی قیمت گر جاتی ہے۔ چنانچہ اس ایوان میں ہمیں سوائے اشیاء اور پرچھائیوں کے کوئی بھی مکین دکھائی نہیں دیا کہ ہر طرف — ایک خاموشی تھی۔ سو ہم نے ایوانِ خاص کی بھیگی ہوئی دیواروں، دروازوں، کھڑکیوں اور ٹپکتی ہوئی چھتوں کو پُرسہ دیتے ہوئے کہا — اے شہرِ نابود کے ناموجود لوگو! ہمیں بڑے دکھ کے ساتھ تمہیں یہ کہتے ہوئے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ تم اپنے اندر کے خوف اور بزدلی کی وجہ سے باقی نہیں رہے کہ تم میں باقی رہنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔ اے شہرِ فسوں کے خاموش واسیو! تمہاری کاہلی اور ڈر، نے تمہیں باقی نہیں رکھا۔ اے شہرِ معدوم کی بے حرکت قومو! ہم جو مختلف ممالک سے تمہیں پُرسہ دینے کے لیے یہاں آئے ہیں، تمہیں اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ ہم تمہاری مغفرت کے لیے دعائیں ضرور کریں گے۔ لیکن کہتے ہیں کہ ایسی قوم کی مغفرت کے لیے دعائیں نہیں کی جاتیں جو غفلت میں پڑ کر نیست و نابود ہو جاتی ہیں۔ تاہم ہم تمہارے لیے دعائیں یا پرارتھنا ضرور کریں گے گو کہ ہمیں اس بات کا بھی یقین ہے کہ سروں تک نیند میں ڈوبی ہوئی ڈرپوک قوم کے لیے دعائیں کرنا عبث ہے کہ جو قوم اپنے کلچر اور اپنی زبان کی حفاظت نہیں کر سکتی اُس کا کسی بھی زمین پر کوئی مقام نہیں ہوتا — یہ کہہ کر ہم ایک اور گھر میں داخل ہو گئے تو وہاں پہلے ہی سے بہت سے سیاح موجود تھے اور بہت سے سیاح پُرسہ دے کر لوٹ رہے تھے۔ لہٰذا ہم نے بھی اخلاقاً گھر کی گرتی ہوئی دیواروں اور چھتوں سے کہا۔ ہمیں یہ کہتے ہوئے بڑا افسوس ہو رہا ہے کہ تم اب موجود نہیں رہے۔ مگر ہمیں حیرت ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا اور تم لوگ نابود کیسے ہو گئے۔ اس تعلق سے ہم بہت کم جانتے ہیں تاہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ تم سبھوں کی رگوں سے خون نچوڑ لیا گیا تھا یا پھر تم لوگوں نے خود ہی اپنا خون اُن کی نذر کر دیا تھا یا پھر شاید تم سوئے سوئے ہی بھیڑوں میں تبدیل ہو گئے تھے اور بھیڑیں تو بس بھیڑیں ہوتی ہیں کہ وہ جانتی نہیں کہ اُن کا انجام کیا ہوگا... اور... ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ تم لوگ ہر ایک کے اشاروں پر اپنے سر جھکا دیا کرتے تھے کہ سر جھکا دینا تمہاری عادت بن گیا تھا کہ سروں کی تمہارے پاس کوئی اہمیت ہی نہیں تھی اور... اور مرے ہوئے بھائیوں کا گوشت بڑے مزے لے لے کر تم کھایا کرتے تھے اور پھر اپنے

آبا و اجداد کے ناموں کے تبدیل کیے جانے پر بھی تمہیں کوئی افسوس نہیں ہوا کرتا تھا اور تم چپ چاپ انہیں قبول لیا کرتے تھے۔ حالانکہ ناموں کا بدل جانا حسب نسب کا خاتمہ ہے۔ پھر بھی تم خاموش ہو جاتے تھے کہ کسی زہریلے سانپ نے تمہیں سونگھ لیا تھا اور دستکوں کی آوازوں پر جاگنے کی بجائے کروٹیں لے لے کر سو جایا کرتے تھے اور چوہوں کی آوازوں پر بدک بدک کر ادھر اُدھر دوڑنے لگتے تھے اور مارے خوف کے اپنی عورتوں کے حمل بھی گرا دیا کرتے تھے۔ کیونکہ تمہیں اپنی عورتوں کے پیٹوں کے اندر سے اجنبی گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں — بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم نے اپنی پیٹھوں پر کنیر کے پودے اُگا لیے تھے اور اپنے ہی اندر اتر جانے والی شوریدہ زمین کو اپنا ٹھکانہ بنا لیا تھا اور آسمانوں سے اپنی آنکھیں ہٹا لی تھیں اور اپنے پانو کے ناخن ہی تمہاری نظروں میں آ کر جم گئے تھے اور جب کسی قوم کی نگاہیں سروں کی بجائے پانو پر جم جاتی ہیں تو سروں کو شہباز اڑا لے جاتے ہیں۔ اے شہرِ زوال کے بے حس مکینو! تم بظاہر موجود تھے۔ مگر دراصل ناموجود تھے کیونکہ نہ دیکھ سکتے تھے اور نہ سن سکتے تھے کہ تمہاری آنکھیں نکال کر زرد ایڑیوں والوں نے اپنے پانو کے انگوٹھوں پر لگا لی تھیں اور تمہارے سروں میں برف بھر دی گئی تھی اور تمہارے لبوں پر سامریوں نے اپنی سیاہ مہریں ثبت کر دی تھیں اور تمہارے سحر زدہ جسموں پر افراسیاب نے اپنا لمبا سایہ ڈال دیا تھا تاکہ تم اس کے طلسمی حصار سے باہر قدم نہ رکھ سکو اور تمہارے ماتھوں پر جلتے ہوئے ازلی چراغوں کو خاموش کر دیا گیا تھا اور تمہاری زبانوں پر گندگی لا کر بچھا دی گئی تھی۔ چنانچہ تم میں احساس باقی نہ تھا نہ شجاعت تمہارے اندر موجود تھی اور تمہاری ساری قدریں تم سے چھین لی گئی تھیں۔ اسی لیے تم اپنے ہی گھروں کے دروازوں، کھڑکیوں، دہلیزوں، چھتوں، محرابوں اور کتابوں سے لڑ جھگڑ کر لہولہان ہو جایا کرتے تھے کہ تم میں رائی برابر بھی عقل باقی نہیں رہی تھی کہ تم نے کووں کو اپنی بغلوں میں چھپا لیا تھا۔ لہٰذا آج تم باقی نہیں رہے کیونکہ جب بھی کسی قوم کی بغلوں میں کوّے اپنے گھر بنا لیتے ہیں، ان کے سروں پر گیدڑیں حملہ کر دیتی ہیں تو تاریخ اُن کے نام و نشان باقی نہیں رکھتی۔ چنانچہ آج تم تاریخ کے کسی بھی صفحہ پر موجود نہیں ہو اس لیے ہم تمہارے بجائے تمہارے گھروں کو پرسہ دینے دور دور سے یہاں چلے آئے ہیں کہ تم نہ سہی، کم از کم تمہارے گھروں کو تو پرسہ دیا جا سکتا ہے۔ سو، اے شہرِ نامراد کے نیست و نابود لوگو! — اب تم کبھی بیدار نہیں ہو سکتے۔ کہ پہلے بھی تم کبھی بیدار نہیں ہوئے تھے، اسی لیے باقی نہیں رہے۔ کیونکہ باقی وہ رہتے ہیں جو ہر لمحہ بیدار اور متحرک رہتے ہیں۔ لہٰذا تمہاری غفلت، بزدلی بے حسی، کاہلی اور نیندوں نے تمہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ تم وہ لوح ہو جس پر بے شمار الفاظ لکھ کر مٹا دیے جاتے ہیں۔ اے شہرِ خموشاں کے برباد لوگو! الوداع، الوداع، الوداع۔ ہم جا رہے ہیں۔ اس کائی جمے پانی پر فنائیل چھڑکتے ہوئے جن پر لاکھوں، کروڑوں مچھر بیٹھے ہوئے ہیں۔ لیکن ہم تمہاری بے نام کہانیاں، دوسری زمینوں کو ضرور سنائیں گے تاکہ اُن جلد مرنے والے شہروں کو جن کی توپوں پر اُلو بیٹھے ہوئے تھے۔ تمہاری بے نام کہانیوں سے کچھ عبرت حاصل ہو جائے — اور جب ہم سب سیاح واپسی کے لیے شہرِ فنا کے دروازے پر مرثیہ پڑھتے ہوئے پہنچے تو شہرِ معدوم پر سورج ڈوب گیا تھا اور فصیلِ شہر سے پشت لگائے بیٹھا ہوا وہ ہزار ہا سالہ بوڑھا دھاڑیں مار مار کر روتا ہوا شہرِ افسوس سے باہر نکل گیا تھا!!!

فرشتے

وہ تینوں فرشتوں کی طرح معصوم دکھائی دیتے تھے۔

ان میں سے ایک کافی دبلا پتلا تھا۔ ایک ذرا کم اور ایک فربہ۔

ان میں سے ایک زندگی کے تجربے اور سماجی وابستگی کا قائل تھا۔ مسائل پر سوچتے سوچتے وہ عملی زندگی میں تقریباً ایک ناکارہ سی شے میں تبدیل ہوتا جارہا تھا۔ ہر وقت تفکر میں غلطاں پیچاں جسمانی طور پر گھلتے ہوئے وہ تنکا پہلوان کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اسکا تدارک وہ اپنے افسانوں میں کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

کہتے ہیں، اس کے افسانوں میں کہانی پن، بیانیہ، سماجی و سیاسی وابستگی، تکثیری رویہ اور ثقافتی تشخص کی موجودگی نے اس کے قاریوں کا ایک اچھا خاصا حلقہ تیار کر دیا تھا۔ بظاہر مرنجان مرنج، نحیف و لاغر اور بے ضرر نظر آنے والا یہ انسان اپنی تخلیقیت میں دہکتی ہوئی آگ چھپائے ہوئے تھا جو بطور خاص مفلوک الحال مداحوں کو اس کا گرویدہ بنا چکا تھا۔ اجتہادی بندے کے روپ میں اسے اعلیٰ مقام پر متمکن کرتا تھا اور متمول اور تنومند لوگوں کو اس سے بے زاری اور بغض و عناد کا رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتا تھا۔

اسے یہ بھی احساس تھا کہ اس کے تخلیق کردہ متن سے باہر جا کر اور ان کے اردگرد طواف کرتے ہوئے اس کے بانی الضمیر کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔ اسی لیے تخلیقی ڈسکورس کے لمحے میں کبھی کبھی وہ عجب سی ادھیڑ بن کے ذہنی رویے سے دوچار رہتا تھا۔

اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی تھی جو بے ترتیب تھی۔

آنکھوں میں گہری اداسی لیکن ایک چمک کے ساتھ

بال بکھرے ہوئے اور گرد آلود

شرٹ کے ایک دو بٹن کپڑے کے رنگ سے میل نہیں کھاتے تھے۔ لگتا تھا کہ بٹن ٹوٹنے کے بعد مجبوری میں صحیح رنگ کے بٹن نہ ملنے پر کام چلانے کے لیے لگائے گئے ہیں۔ یا شاید شعوری طور پر وہ اظہار اور نمائش کے معاملے میں تنوع کا قائل تھا۔

وہ اکثر سر اٹھا کر آسمان کی طرف بھی دیکھتا اور پھر گرد و نواح پر نظر ڈال کر بعض افراد کو گھورنے لگتا۔ لال پیلی بتیوں والی گاڑیوں پر اس کی نظر پڑتی تو اس کی آنکھوں سے چنگاریاں اڑنے لگتیں۔ اس کا سارا جسم غصے سے کپکپانے لگتا۔ اگر کسی گاڑی سے سائرن کی آواز سنائی دیتی اور ٹریفک پولس کو اٹھلاتے ہوئے سواریوں کو کنارے ہٹاتے اور روکتے ہوئے دیکھ لیتا تو اس کا خون کھولنے لگتے

بازوؤں کی سوکھی ہوئی مچھلیاں تڑپنے لگتیں۔ مٹھیوں میں انگارے دہکنے لگے۔

فوراوہ بڑبڑانے لگتا۔

امریکہ سے کچھ اچھا بھی تو سیکھ...

دوسرا جو ذرا کم دبلا تھا۔ وہ تخیل کی وادیوں کا مسافر تھا۔ بات سے بات پیدا کرنا اور رائی کا پہاڑ بنا دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ پچویشن کے عوامل و محرکات سے اسے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ بس اس کی کسی ایک خارجی لہر کو گرفت میں لے کر وہ ایسے ایسے دریاؤں اور سمندروں کی تخلیق کر دیتا کہ لوگ عش عش کرنے لگتے۔ اپنے سر دھننے لگتے۔ اس کے ترنم میں بلا کا جادو تھا اور مشاعروں میں عموماً سب سے زیادہ داد وتحسین وصول کرتا۔ ایک غزل کے ختم ہونے کے بعد لوگ اسے چین سے بیٹھنے نہ دیتے اور ونس مورونس مور کی اس وقت تک رٹ لگاتے رہتے جب تک کہ وہ دوسری غزل چھیڑ نہ دیتا۔

اس کے پڑھنے کے انداز سے معروف و ممتاز شعراء بھی خار کھاتے تھے۔ بلکہ اب اس طرح کے جمے جمائے شعراء ان مشاعروں میں جانے سے گریز کرنے لگے تھے، جن میں وہ مدعو ہوتا۔ منتظمین مشاعرہ پر اگر ان کا بس چلتا تو وہ اس کا نام کٹوانے کی کوشش کرتے۔

لیکن اس کے پڑھنے کا بلا خیز انداز، فضا کا سینہ چیرتا ہوا ترنم اور زندگی کی تخیلی حقیقت کی بوقلمونی مشاعرہ کرنے والوں کو مجبور کرتی کہ وہ اس ابھرتی ہوئی آواز کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے۔

اس کے بال لانبے تھے۔ لمبی گردن پر لمبے گیسو، اسے بھیڑ میں منفرد اور ممتاز حیثیت عطا کرتے، کہتے ہیں، اس کے شائقین میں بڑی تعداد نوجوان لڑکیوں اور ادھیڑ عمر خواتین کی تھی۔ وہ گاڑیوں کی سائرن کی آواز یا جلتی بجھتی لال پیلی بتیوں کو دیکھ لیتا تو اسے غصہ نہ آتا۔ اس کا ذہن تخلیقی اڑان بھرتا ہوا اڑن کھٹولے میں مختلف غیر آباد جہانوں کی سیر کرنے لگتا۔

اس سر سپاٹے میں ابلتے ہوئے بدن کی دلکش عورتیں اس کے جسم کو اوڑھے ہوئے اس کے ہمراہ ہوتیں۔

تیسرا جو فربہ تھا، وہ عمر میں ان دونوں سے بڑا تھا۔ اس کے جسم کی فربہی تھل تھلی نہیں بلکہ گٹھیلی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ایک خاص طرح کا چوکنا پن عیاں ہوتا تھا۔ اس کی گرفت لفظوں اور معنویتوں پر بدرجہ اتم تھی اور اس کی بنا پر وہ ان دونوں کی تخلیقات میں اکثر کیڑے نکالتا۔ کبھی کبھی اس کے مشوروں سے ان دونوں کی تخلیقات میں چار چاند لگ جاتے۔ گرچہ سینئر ہونے کے ناطے دونوں اس کی بات آسانی سے نہیں اٹھاتے اور اس کا احترام کرتے تھے۔ لیکن دونوں اس کے منہ لگے تھے اور شوخیوں نے اسے ان دونوں کے دوست اور ہم جولی کا درجہ دے دیا تھا۔ اس کی تنقیدی نگارشات شائع ہوتیں تو یہ دونوں اس کے تعلق سے پرچے میں تجزیاتی خط لکھنا نہ بھولتے۔

تو اس طرح تخیل، تجربے اور مشاہدے کے اس تثلیثی امتزاج نے پورے ادب میں گہما گہمی پیدا کر رکھی تھی اور قومی سطح پر یہ مثلث لوگوں کے لیے موضوع بحث بنا ہوا تھا۔ اگر کسی سمینار میں یہ تینوں پہنچ جاتے تو لوگ سہم سے جاتے اور وہ لوگ جو کہ اپنے آپ کو مقتدر اور جید گردانتے تھے، اسٹیج پر جانے سے گریز

کرتے تھے کہ پتہ نہیں ان کی کون سی بات قابل گرفت ہوجائے۔ یہ تینوں ان ادیبوں کو کسی قیمت پر نہیں بخشتے تھے جو اقتدار کے حاشیہ بردار اور ہم نوا تھے۔ ساتھ ساتھ خود کو انقلابی اور احتجاجی بھی کہلوانا پسند کرتے تھے۔ کہتے ہیں، نام نہاد سفید پوشوں نے ان کے ڈر سے اب ایسی مجلسوں میں جانا بھی چھوڑ دیا تھا جہاں انہیں اپنی پگڑیاں اچھلنے کا اندیشہ رہتا۔

تینوں نہ صرف فرشتوں کی طرح دکھائی دیتے تھے بلکہ سچ مچ فرشتہ صفت بھی تھے۔ ایک عجیب طرح کا اضطراب، بے چینی اور بے ثباتی کا احساس ان تینوں کی شخصیت میں موجزن تھا اور تینوں اپنی مفلوک الحالی کے باوجود اپنے عمل سے اس شعر کی تجسیم کرتے تھے۔

اے جذبۂ خود داری جھکنے نہ دیا تونے
لکھنے کے لیے ورنہ سونے کے قلم آتے

ان کی نظروں کے سامنے دیہاتوں اور قصبوں سے لوگ آئے اور کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ کھڑکھڑاتی سائیکلوں والے موٹر گاڑیوں میں ہواؤں سے باتیں کرنے لگے۔

شاعر کہتا

کسی کو گھر سے نکلتے ہی مل گئی منزل
کوئی ہماری طرح عمر بھر سفر میں رہا

افسانہ نگار سوچتا

میں اس انجام کی جدلیات، عوامل اور حشر سامانی کو اپنی کہانیوں میں ٹٹولنا چاہتا ہوں۔ سماجی اور سیاسی ڈسکورس اور قاری سے ربط وارتباط کا جشن جاریہ۔

ناقد کہتا۔

خود مختار تخلیقیت اور آزاد خیالی کی تکثیری فضا کے بغیر عصری عہد کی آشفتہ حالی کا احاطہ ممکن نہیں۔

شاعر اس کی بات سن کر اس پر طنز کرتا

شہرت کی بلندی بھی پل بھر کا تماشا ہے
جس ڈال پہ بیٹھے ہو وہ ٹوٹ بھی سکتی ہے

تینوں مل کر قہقہے لگانے لگتے

''ٹھیک... ٹھیک کہا یارو...!''

جس ڈھابے میں وہ چائے پیتے تھے وہاں پر برگد کا ایک ایسا پیڑ تھا جس کے پرانے تنے میں پیپل کا پیڑ اُگ آیا تھا لیکن پنپنے سے قاصر تھا۔ اس پر بیٹھے ہوئے پرندے ان کے فلک شگاف قہقہوں سے اڑ کر فضا میں چکر کاٹنے لگتے۔ انہیں دیکھنے کی کوشش کرتے کہ درندوں کے شہر میں فرشتہ صفت قہقہے کون سے انسان لگا رہے ہیں۔

تینوں کے تینوں وقت کے مارے ہوئے تھے لیکن سمجھوتہ کرنے کی ریاکاری کے لیے اب تک آمادہ نہ

ہوئے تھے۔ جیسے تیسے زندگی کاٹ رہے تھے اور اپنی دربدری میں مست تھے۔ تینوں نے اپنے کیریئر اور مقتدر ادیبوں کو اپنے جوتوں کی نوک پر رکھا ہوا تھا اور اس طرح سینہ تان کر چلتے تھے جیسے پوری دنیا پر ان کی حکمرانی ہو۔

اس روز بھی تینوں دال روٹی کی سفاک صعوبتوں سے فرصت پانے کے بعد اکٹھا ہوئے تو ایک دوسرے کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے صدیوں بعد ملے ہوں۔ حالانکہ وہ تقریباً روزانہ ملا کرتے تھے اور اپنے جگر اور آنت کی پروا کئے بغیر لاپروائیاں بھی کرتے تھے۔

جب تک جینا ہے پورے لاابالی پن کے ساتھ جینا ہے کہ شیروں کا یہی وصف ہوا کرتا ہے اور احتیاط تو کتوں اور لومڑیوں کا وطیرہ ہے۔

اس دن بھی ایک خاص مسئلہ درپیش تھا۔

''کیا چلے گا؟''

''کتنا پیسہ ہے؟''

''اتنے میں تو دیسی ہی آسکتی ہے!''

اور راجدھانی کا جو ادیب یہاں آیا ہوا ہے اسے بھی اسی مہمان نوازی پر اکتفا کرنا ہوگا۔

ہم علاقائی ادیب راجدھانی والوں سے زیادہ مقدم ہیں کہ راجدھانی کی میکانکی اور مشینی زندگی میں تخلیقیت کی گنجائش کہاں۔ چھوٹے شہروں اور قصبوں کی ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر اور کونے کھدروں کے ملگجے اندھیروں میں جابجا کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔

راجدھانی والے کو لگا کہ سیمینار کے بعد وہ پھکڑوں کے بیچ پھنس گیا ہے۔ لیکن یہ احساس بھی اسے تھا کہ یہی دم دار لوگ ہیں۔ رنگین نائٹس اور چکنے موزیک والے فلیٹوں میں اس کی آؤ بھگت ضرور ہوتی لیکن تخلیقیت کے یہ رنگا رنگ نکتے وہاں کہاں نصیب ہوتے۔

کچھ دنوں پہلے کا مخصوص منظر وہ بھولا نہیں تھا۔

راجدھانی کی ایک بے تکلف محفل میں سب کے سب اونچی اڑان پر تھے۔ چھوٹے بڑے شہروں کے بڑے بڑے ادیب اکٹھا تھے۔

بات سے بات نکلی تو انقلاب تک پہنچی اور ایک بڑے شہر کے ایک چالاک نے خود کو ریڈیکل ظاہر کرنے کے زعم میں ایک انقلابی شہید کو کاؤنٹر ریوولیوشنری قرار دے دیا۔

اس رات چھوٹے شہر کے انہی میں سے ایک کا تیور دیکھنے کے قابل تھا۔

اس کا سارا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔

''تم بھاکڑے کے ایجنٹ... اخباروں میں اسے انٹرویو کر کے گلوری فائی کرنے والے... تمہارا زخرا چبا کر تھوک دوں تب بھی مری نفرت کی آگ دھیمی نہیں ہوگی... انقلاب دشمنی... اور الٹرالفٹ کا سوانگ...!؟''

تین چار مشترکہ دوستوں نے بیچ میں پڑ کر بات ختم نہ کی ہوتی تو اس رات قیامت بس چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔

راجدھانی والے نے خود سے زیرلب کہا۔

وہ صحیح جگہ پر ہے۔ وہ بالکل صحیح جگہ پر ہے۔

وہ اگر کہیں اور ہوتا تو وہی لجلجی باتیں۔ گھٹیا تعریف وتوصیف۔

پرتکلف ناشتہ اور کھانا۔ شاندار استقبالیہ۔

اور ایک سے ایک انگریزی بوتلیں۔

ان کے نشے آسمان کو چھونے لگے تھے۔

اس نے پھر خود کو اطمینان دلایا۔

وہ صحیح لوگوں کے بیچ ہے... بالکل صحیح لوگوں کے...

راجدھانی والے کو آج ہی رات بارہ بجے کی گاڑی بھی پکڑنی تھی۔ ہوٹل میں آکر سامان لینا تھا اور پھر اسٹیشن کی طرف روانگی۔

تینوں مہمان سے باری باری گلے ملے۔ جس طرح لڑکھڑاتے ہوئے انداز میں وہ معانقہ کر رہے تھے، اس نے ان کے گرد بھیڑ اکٹھا کر دی تھی۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ سب کے سب شاعر و ادیب ہیں اور خوشگوار موڈ میں ہیں۔ لہٰذا سرگوشیوں اور نکتہ چینیوں کے باوجود ان کے لیے ایک طرح کے احترام کا جذبہ بھی ان کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

ہر چند کہ تینوں نارمل نہیں تھے اور کافی تھکے ہوئے بھی تھے۔ خیل ٹھال کر مہمان کو گاڑی کے اندر پہنچا چکے تھے۔

گاڑی رخصت ہوئی تو خیال آیا کہ ان میں سے ایک کو اگلی گاڑی پکڑنی تھی۔ وہ لوکل پسنجر تھا۔

تینوں نے فیصلہ کیا کہ تینوں وہیں چلیں گے۔ لوکل پسنجر کے ہمراہ۔ دوسرے دن اتوار کو وہیں خوش گپیاں کرتے ہوئے گذاریں گے۔ تیسرا وہیں رہ جائے گا۔ دونوں اپنے شہر کو لوٹ آئیں گے۔

ٹرین میں بڑی مشکلوں سے تینوں کو بیٹھنے کی جگہ مل سکی۔

اندھیروں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی ہوئی ٹرین کی چھک چھک عجیب پراسرار سماں پیدا کر رہی تھی۔ تینوں کے تینوں بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگے اور پھر گہری نیند میں سو گئے — اٹھے تو اس پسنجر ٹرین کا آخری اسٹیشن تھا جو ان کے اسٹیشن سے کئی اسٹیشن آگے تھا۔

تینوں گاڑی سے اتر کر پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے واپسی کے لیے ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔

ان کے فلک شگاف قہقہے لوگوں کو بار بار ان کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے کے لیے مجبور کر رہے تھے۔

شاعر نے غزل کے یہ اشعار ترنم سے پڑھنے شروع کر دیئے۔

کوئی بھی شہر میں کھل کر نہ بغل گیر ہوا

میں بھی اکتائے ہوئے لوگوں سے اکتا کے ملا
دن کے کاندھے پہ دہکتے ہوئے سورج کی صلیب
رات کی گود میں ٹھٹھرا ہوا مہتاب ملا
کہیں اشکوں کے دیئے ہیں نہ تبسم کے چراغ
لوگ پتھر کے ہوئے جاتے ہیں رفتہ رفتہ

افسانہ نگار نے ان افعال و کیفیات کے عوامل و محرکات پر غور و خوض کرنا شروع کر دیا اور ناقد ان کی تخلیقی اڑان پر قدغن لگانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔

لوگوں کی بھیڑ اکٹھا ہو کر انہیں محویت کے عالم میں گھورے جا رہی تھی۔

تینوں بندے بے منزل ہو جانے کے صدمے کے باوجود ہشاش بشاش تھے اور فرشتوں کی طرح تازہ دم نظر آ رہے تھے۔

سامنے ٹی وی پر امریکی طیارہ راجدھانی کے ہوائی اڈہ پر لینڈ کر رہا تھا۔ بہت سارے پھولوں کے ہار ہوا میں آویزاں تھے۔

ایک طرف ریل کی پٹریوں پر چند کتے روٹی کے لیے ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی کر رہے تھے۔

شاعر نے موڈ میں آ کر بھرائی ہوئی آواز میں پھر گانا شروع کیا۔

کچھ بھی رہا نہ کہنے کو ہر بات ہو گئی
آؤ کہیں شراب پئیں رات ہو گئی
نقشہ اٹھا کے کوئی نیا شہر ڈھونڈیے
اس شہر میں تو سب سے ملاقات ہو گئی۔

روٹی کے چند ٹکڑوں کے لیے کتوں نے وہ شور مچایا کہ سر دھنتے ہوئے لوگوں کی محویت پارہ پارہ ہو گئی۔

ٹھیک اسی وقت بہت دور سے پٹریوں کے آخری سرے پر سانپ کی طرح ایک ٹرین رینگتی ہوئی نمودار ہوئی۔ سب کے سب فرشتوں کو چھوڑ کر اس سانپ نما ٹرین کی طرف دیکھنے لگے۔

فرشتے قدم اٹھاتے ہوئے سوچ رہے تھے۔ اس بار پھر بے نیازی انہیں کہیں منزل سے آگے نہ پہنچا دے۔

انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

ٹرین میں سوار ہونے کے بعد لوگ پھر انہی فرشتوں کے چہرے تک رہے تھے

اور وہ فرشتے اس کوشش میں مستغرق کہ نیند کی خوبصورت پریاں پھر ان کی پلکوں پر سوار نہ ہو جائیں۔

اچانک اسٹیشن ماسٹر نے گھبرائے ہوئے لہجے میں اعلان کیا:

''اس ٹرین کے انجن میں خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ مرمت ہونے یا نئے انجن کے آنے کے بعد ہی یہ گاڑی آگے جائے گی۔

شموئل احمد

منرل واٹر

اے۔ سی۔ کیبن میں اس کا پہلا سفر تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ایسا موقع اس کو ہاتھ آ گیا تھا ورنہ اس کی حیثیت کا آدمی اے۔ سی کا خواب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک دواساز کمپنی میں ڈسپیچ کلرک تھا اور اس وقت راجدھانی اکسپریس میں منیجر کی جگہ خود سفر کر رہا تھا۔

اصل میں کمپنی کا ایک معاملہ سپریم کورٹ میں اٹکا ہوا تھا۔ وکیل نے کچھ کاغذات طلب کیے تھے۔ منیجر خود جانا چاہتا تھا لیکن ایک دن پہلے وہ اچانک بیمار پڑ گیا تھا۔ کاغذات اہم تھے جن کا وکیل تک پہنچنا ضروری تھا۔ منیجر نے یہ ذمہ داری اس کو سونپ دی تھی اور اپنے نام کا ٹکٹ بھی اس کے حوالے کیا تھا۔ وہ منیجر کا ہم عمر تھا۔ منیجر کے نام پر سفر کرنے میں زیادہ دشواری نہیں تھی۔ راستے کے خرچ کے لیے کمپنی کی طرف سے دو ہزار کی رقم بھی پیشگی ملی تھی۔ اس کو سفر کا زیادہ تجربہ نہیں تھا۔ اس نے دلی دیکھی تک نہیں تھی۔ اس کی زندگی یوں بھی بہت بندھی ٹکی تھی جیسی عموماً دفتر کے کلرکوں کی ہوتی ہے۔ یہ سوچ کر اس کو گھبراہٹ ہوئی کہ اے۔ سی۔ میں بورژوا طبقے کے لوگ ہوتے اور اس کے پاس ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں ہیں۔ پھر بھی یہ سوچ کر وہ خوش تھا کہ منیجر نے اس کو معتبر سمجھا اور وہ کمپنی کے کام سے دلی جا رہا ہے۔

سب سے پہلے اس کو سوٹ کیس کی مرمت کا خیال آیا۔ اس کے پاس ایک پرانا سوٹ کیس تھا جس کی حالت اب خستہ ہو چکی تھی۔ اس نے سوچا نیا سوٹ کیس خریدے لیکن سوٹ کیس مہنگا تھا۔ اس کو ارادہ ترک کرنا پڑا۔ پرانے سوٹ کیس کو ہی جھاڑ پونچھ کر صاف کیا، مرمت کروائی اور نیا تالا لگوایا۔ کپڑے ہمیشہ اس کی بیوی پریس کرتی تھی۔ اس بار کپڑے اس نے لانڈری میں دھلوائے۔

ڈبے میں گھستے ہی اس کو فرحت بخش ٹھنڈک کا احساس ہوا لیکن گھبراہٹ ایک ذرا بڑھ گئی۔ اس کو چھتیس نمبر کی برتھ ملی تھی۔ پردے کے پیچھے سے اس نے کیبن میں جھانکنے کی کوشش کی۔ یہ چار برتھ والا کیبن تھا۔ اوپر کی دونوں برتھیں خالی تھیں اور سامنے ایک خاتون تشریف فرما تھیں۔ وہ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوا اور چاروں طرف طائرانہ سی نظر ڈالی۔ کھڑکی کا پردہ سمٹا ہوا تھا اور خاتون کے بال کھلے ہوئے تھے۔ وہ انڈیا ٹوڈے پڑھنے میں محو تھیں۔ ان کا سامان مختصر تھا۔ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس فرش پر رکھا ہوا تھا۔ ایر بیگ اور وینیٹی بیگ برتھ پر پڑے تھے اور ایک چھوٹا سا تھرمس جو کھڑکی سے لگے ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا تھا۔ رسالہ ان کی انگلیوں میں اس طرح دبا تھا کہ انگوٹھی کا نگینہ نمایاں ہو رہا تھا۔ ہاتھوں میں طلائی چوڑیاں تھیں، کانوں میں بندے ٹمٹما رہے تھے اور گلے میں سونے کی چین چمک رہی تھی جس کا لاکٹ آنچل میں

چھپا ہوا تھا۔ شاید ایمیٹیشن ہو... اس نے سوچا۔ آج کل عورتیں سفر میں زیادہ زیور نہیں پہنتیں... دفعتاً اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی... آخر وہ خاتون کے بارے میں ہی کیوں سوچنے لگا...؟

اچانک رسالہ ان کے ہاتھ سے پھسل کر گر پڑا۔ انہوں نے جھک کر اسے اٹھایا تو زلفیں شانوں پر بکھر گئیں اور گلے کا لاکٹ جھول گیا۔ لاکٹ پان کی شکل کا تھا جس پر مینا کاری کی ہوئی تھی۔ خاتون کی انگلیاں لمبی اور مخروطی تھیں اور ان پر عنابی رنگ کا پالش چمک رہا تھا۔ اس نے غور کیا کہ ساڑی کا رنگ بھی عنابی ہے... یہاں تک کہ چپل کا فیتہ بھی... دفعتاً خاتون نے سر کی جنبش سے بالوں کی لٹ کو پیچھے کیا تو اس کو پینٹین شمپو والی ماڈل یاد آ گئی... اس نے ٹی۔ وی۔ میں دیکھا تھا۔ اس کے بال اسی طرح لمبے اور چمکیلے تھے اور وہ اسی طرح ادائے خاص سے انہیں پیچھے کی طرح لہراتی تھی...

اس کی نظر اپنے سوٹ کیس پر پڑی۔ اس کو لگا سوٹ کیس کا میلا رنگ نئے تالے سے میچ نہیں کر رہا ہے۔ اس کو یاد آیا جب اس نے مرمت کروائی تھی تو سب ٹھیک ٹھاک لگا تھا۔ خاتون کا سوٹ کیس نیا نہیں تھا لیکن اس میں چمک باقی تھی۔ اے۔ سی۔ کیبین کے فرش پر آس پاس رکھے ہوئے دونوں سوٹ کیس طبقے کے فرق کو نمایاں کر رہے تھے۔ پرانے سوٹ کیس کا نیا تالا اس کی حیثیت کی جیسے چغلی کھا رہا تھا۔ اس نے دزدیدہ نگاہوں سے خاتون کی طرف دیکھا اور اپنا سوٹ کیس برتھ کے نیچے کھسکا دیا۔

بیرا منرل واٹر کی دو بوتلیں ڈیش بورڈ پر رکھ گیا۔ خاتون نے اپنے حصے کی بوتل ہینگر پر اوندھا کر رکھی دی۔ پھر اسنیکس اور چائے بھی آئی۔ وہ ایک بسکٹ منہ میں رکھ کر چبانے لگا۔ خاتون نے چائے کے پیکٹ کو پیالی میں آہستہ آہستہ ایک دو بار ڈپ کیا۔ پھر بسکٹ کا چھوٹا سا ٹکڑا توڑ کر منہ میں ڈالا تو اس کو احساس ہوا کہ کھانے کے بھی آداب ہوتے ہیں۔ اسکو لگا وہ دلدر کی طرح بسکٹ چبا رہا ہے۔ جبکہ خاتون کس سلیقے سے...

خاتون اسی بے نیازی سے رسالے کی ورق گردانی میں مصروف تھیں۔ اس دوران انہوں نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس کو سگریٹ کی طلب ہوئی۔ کیبن سے نکل کر وہ باتھ روم کے پاس آیا۔ ایک سگریٹ سلگائی اور ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ اچانک خاتون کے لمبے بال اس کی نگاہوں میں لہرا گئے اور اس کو بیوی کی یاد آئی... اس کو کھلے بالوں میں اس نے کم دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ جوڑا باندھ کر رکھتی تھی۔ صرف غسل کے وقت اس کے بال کھلے رہتے۔ اس کو یاد آیا کہ ان دنوں اس کی بیوی نے صابن کا برانڈ بدلا ہے اور لرل استعمال کر رہی ہے... لرل کا ٹی۔ وی۔ اشتہار اس کی نگاہوں میں گھوم گیا... بکنی پہن کر جھرنے میں نہاتی ہوئی لڑکی... پیڑ کی لتاؤں سے جھولتی ہوئی۔ ہو ہڑپ کرتی ہوئی۔ وہ آہستہ سے مسکرایا۔ اس کی بیوی آزادی سے جھرنے میں نہیں نہا سکتی۔ پیڑ کی لتاؤں سے نہیں جھول سکتی۔ ہو ہڑپ نہیں کر سکتی۔ لیکن لرل استعمال کر سکتی ہے... لرل اس کو لڑکی سے جوڑتا ہے... اس طبقے سے جوڑتا ہے جو بورژوا ہے... لرل دونوں میں مشترک ہے... اس طرح وہ اپنے ماحول سے فرار حاصل کرتی ہے جہاں تنگی بے روز کی کھچ کھچ ہے... لرل اس کے فرار کا ذریعہ بن جاتا ہے... اپنے تجزیے پر دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے

اس نے سگریٹ کا آخری کش لیا اور کیبن میں لوٹ آیا۔

گاڑی رینگنے لگی تھی۔ خاتون نے ایک بار کھڑکی کے شیشے سے سٹ کر باہر کی طرف دیکھا اور کہنی کے بل نیم دراز ہوگئیں۔ پھر ٹخنے کے قریب ساری کی سلوٹوں کو درست کیا تو پاؤں کے ناخن جھلک گئے۔ ناخن پر عنابی رنگ کا پالش تھا اور بیچ کی انگلی میں بچھیا چمک رہی تھی۔ خاتون کے پاؤں اس کو خوش نما معلوم ہوئے۔ اس کو پھر بیوی کی یاد آگئی۔ وہ بھی بچھیا پہنتی تھی اور پاؤں میں التا بھی لگاتی تھی۔ پھر بھی وہ کھردرے معلوم ہوتے۔ اس نے سوچا کہ بورژوا عورتیں جامہ زیب ہوتی ہیں۔ کچھ بھی پہن لیں بھاتا ہے... ساری کتنی خوبصورت ہے اور سلوٹوں کو کس سلیقے سے درست کیا... اس کو یاد آیا کہ اس کی بیوی کے پاس ایک مصنوعی سلک کی ساری ہے جسے وہ جوگا جوگا کر رکھتی ہے اور محلے ٹولے میں کہیں جاتی ہے تو وہی ساری پہنتی ہے اور چلتی ہے۔ بطخ کی طرح بھد... بھد... بھد... اور پٹی کوٹ کا میلا کنارہ ساری کے پائینچے سے جھانکتا ہے... اس کو حیرت ہوئی کہ وہ اس طرح اپنی بیوی کے بارے میں کیوں سوچ رہا ہے...؟ کہاں سے لائے گی وہ کپڑے؟ کپڑا تو گہنا ہے اور گہنا تو سپنا...؟ گاڑی کسی اسٹیشن پر رکی تھی۔ پلیٹ فارم کا شور سنائی نہیں دے رہا تھا۔ لوگ خاموش پتلے کی طرح چل پھر رہے تھے۔ اس کے جی میں آیا اپنے پاؤں پھیلائے لیکن اس نے محسوس کیا کہ ایک جھجھک مانع ہے اور اس کو حیرت ہوئی کہ وہ ابھی تک سہج کیوں نہیں ہوسکا ہے...؟ بیرا کھانے کا پیکٹ دے گیا۔ پیکٹ کھولتے ہی اس کو خیال آیا کہ آہستہ آہستہ کھانا چاہیے... اس کو کوفت ہوئی کہ نوالہ چباتے ہوئے اس کے منہ سے چپڑ چپڑ کی آواز کیوں نکلتی ہے...؟ پھر وہ زیر لب مسکرایا... شاید مفلوک الحال آدمی کھاتا اسی طرح کھاتا ہے...! کھانے کے بعد اس کو پھر سگریٹ کی طلب ہوئی۔ وہ جھنجھلایا کہ کیبن سے باہر جانا ہوگا۔ وہ اتر کر پلیٹ فارم پر آیا۔ پلیٹ فارم طرح طرح کے شور سے گونج رہا تھا۔ خوانچے والے ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے سوچا کہ پلیٹ فارم کا شور ریل کے سفر کا حصہ ہے جس سے اے۔ سی۔ کیبن محروم ہے۔ اے۔ سی۔ میں آزادی جیسے سلب ہوجاتی ہے۔ سگریٹ نہیں پی سکتے... کھڑکی کا لطف نہیں لے سکتے... لیکن بھیڑ سے تو راحت ہے... ہاں بھیڑ سے... اور یہ میڈم کہاں تک جارہی ہیں...؟ ان کے زیور اصلی ہیں...؟

گاڑی نے سیٹی دی تو اس نے آخری دو تین کش لگائے اور اچک کر ڈبے میں گھس گیا۔

بیرا بیڈ رول دے گیا۔ خاتون نے بیڈ لگایا اور تکیے کے سہارے نیم دراز ہوگئیں۔ گاڑی رینگنے لگی تھی۔ اس کی جھجھک کچھ کم ہوگئی تھی، اس نے بھی اپنا بستر لگایا اور کھڑکی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

اچانک خاتون نے کروٹ بدلی تو کولھے کے گناؤ نمایاں ہوگئے... اور وہ ادھر دیکھے بغیر نہیں رہ سکا... زلفیں ایک طرف بکھر گئی تھیں اور پشت کا بالائی حصہ جھلک رہا تھا۔ جہاں بلوز کی نیچی تراش قوسین سا بنا رہی تھی اور گردن کے قریب سنہری چین کا خفیف سا حصہ کیبن کی دودھیا روشنی میں چمک رہا تھا۔ خاتون کا جسم متناسب تھا۔ کمر کے گرد گوشت کی ہلکی سی تہہ کولھے کے ابھار کو نمایاں کررہی تھی۔ گاڑی رفتار پکڑ رہی

تھی۔ وہ کچھ کچھ ہچکولے سا محسوس کر رہا تھا۔ اس کو جھپکی آنے لگی تو اس نے پاؤں پر کمبل ڈالا اور دراز ہو گیا۔ لیکن لیٹتے ہی جھپکی جیسے غائب ہو گئی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

خاتون بھی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ پھر تھرمس سے پانی ڈھال کر پیا اور گلاس کو ڈیش بورڈ کے دوسرے کنارے پر رکھ دیا جہاں اس کی منرل واٹر کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ اس کو عجیب لگا... خاتون نے اپنا گلاس وہاں کیوں رکھا...؟ اس کے سامان کے قریب...!

خاتون کا بلوری گلاس منرل واٹر کی بوتل کو قریب قریب چھو رہا تھا اور وہ چہرہ ہتھیلی پر ٹکائے ادھ لیٹی فرش کو تک رہی تھیں۔ گاڑی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ اچانک پٹری بدلنے کی آواز کیبن میں ابھری۔ شاید گاڑی جنگل سے گذر رہی تھی۔ خاتون نے روشنی گل کر دی۔ کیبن مین ملگجا اندھیرا پھیل گیا اس کو دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہوئی...

وہ پھر کیبن سے باہر آیا۔ راہ داری میں سناٹا تھا۔ سبھی کیبن کے پردے کھینچے ہوئے تھے اور روشنی بجھی ہوئی تھی۔ صرف نیلے رنگ کا بلب روشن تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ اس کو پھر سگریٹ کی طلب ہوئی۔ اس نے سگریٹ سلگائی۔ جلدی جلدی دو چار کش لیے اور کیبن میں واپس آیا۔ خاتون نے اپنی برتھ سے لگا پردہ برابر نہیں کیا تھا۔ وہ چاروں خانے چت لیٹی تھیں اور پاؤں پر کمبل ڈال رکھا تھا... ان کی آنکھیں بند تھیں اور ہاتھ سینے پر بندھے تھے۔

گاڑی کی رفتار اچانک دھیمی ہو گئی۔ کسی اسٹیشن کا آوٹر تھا۔ گاڑی سیٹی دیتی ہوئی رک گئی۔ اس نے باہر کی طرف دیکھا۔ دور اِکا دکا مکان نظر آ رہے تھے جن میں روشنی بہت مدھم تھی۔ پاس ہی برگد کی شاخوں کے درمیان چاند بلور کی چوڑی کی طرح اٹکا تھا۔ پتے ہوا میں زور زور سے جھوم رہے تھے۔ ان میں یقیناً سرسراہٹ بھی تھی جو کیبن میں سنائی نہیں دے رہی تھی۔

دفعتاً اس کو محسوس ہوا کہ وہ کسی آسیب کی طرح کیبن میں بیٹھا ہے اور خاتون اس کے وجود سے قطعی غافل۔ اس کو حیرت ہوئی کہ واقعی خاتون نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کو لگا خود اس نے اپنے وجود کو گم کرنے کی کوشش کی ہے... اس نے سوٹ کیس برتھ کے نیچے کیوں چھپا دیا...؟ اور اگر خاتون کیبن میں نہیں ہوتیں تو کیا یہ بات اس کے ذہن میں آتی کہ بیوی نے صابن کا برانڈ بدلا ہے... اور مصنوعی سلک میں چلتی ہے بطخ کی طرح... ایک طرح سے اس نے بیوی کے وجود کی بھی نفی کی... اس کو لگا وہ ایک موہوم سی آگ میں جل رہا ہے... اس نے خاتون کی طرف دیکھا... اس کے جی میں آیا ان کو اپنے ہونے کا احساس دلائے۔ لیکن اس کی نظر بلوری گلاس پر پڑی اور وہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ کیا معنی رکھتا ہے۔ آخر بھری بوتل کے پاس رکھا ہوا بلور کا خالی گلاس—؟ اچانک خاتون نے آنکھیں کھولیں اور اسکی طرف دیکھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ تنہا کیبن کے ملگجے اندھیرے میں پہلی بار خاتون کی نگاہ غلط پڑی تھی۔ وہ سہرن سی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ خاتون اٹھ کر ڈیش بورڈ کے قریب آئیں تو اس کو اور بھی حیرت

ہوئی۔ وہ اسکے بہت قریب کھڑی تھیں... یہاں تک کہ وہ ان کے بدن کا لمس صاف محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے تھوڑا کھسک گیا۔ خاتون بھی بیٹھ گئیں۔ پھر بوتل سے پانی ڈھال کر پیا اور پھر ایک نظر اس پر ڈالی...

گاڑی اچانک ہچکولے کے ساتھ چل پڑی... بلوری گلاس بوتل سے چھو گیا... خاتون اس پر جھکیں اور اس نے اپنے بازو پھیلائے اور جیسے سکتے میں آ گیا...

خاتون اس کے سینے سے لگی تھیں اور اس پر عجیب سا خمار چھا رہا تھا۔ لذت کی گراں باری سے اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں... اس نے ایک بار ادھ کھلی آنکھوں سے خاتون کی طرف دیکھا اور پشت کے اس حصے کو ایک بار چھو کر محسوس کرنے کی کوشش کی جو بلوز کی نیچی تراش نمایاں تھا۔ خاتون نے بھی ادھ کھلی آنکھوں سے اس کو دیکھا اور ہاتھ پیچھے لے جا کر بلور کے ہک کھول دیئے... لذتوں کے نئے باب اس پر کھل گئے... نشہ بڑھ گیا... بازوؤں کے شکنجے کس گئے... اس عالم میں اس نے بار بار آنکھیں کھول کر خاتون کی طرف دیکھا... اس کو جیسے یقین نہیں تھا کہ ایک بورژوا حسینہ کا تن سیمیں اس کی بانہوں میں مچل رہا تھا۔

اور ایسا ہی تھا... بورژوا خاتون کا مرمریں جسم اسکی بانہوں میں تھا۔ لب و رخسار کے لمس جادو جگا رہے تھے... ہر لمحہ اس کا استعجاب بڑھ رہا تھا۔ یہ لمحہ خود قدرت نے انہیں عطا کیا تھا۔ یہ خالص فطری ملن تھا جسمیں ارادے کو قطعی دخل نہیں تھا۔ دونوں انجان تھے... نہ آپس میں گفتگو ہوئی... نہ اشارے ہوئے... نہ پاس پاس بیٹھے... نہ ایک دوسرے کو لبھانے کی کوشش کی... بس ایسا ہو گیا... چاند برگد کی شاخوں سے سرک کر اوپر آ گیا اور چاندنی ملگجے اندھیرے میں گھلنے لگی... کیبن کے فرش پر سوٹ کیس کا فرق بے معنی ہو گیا تھا... جبلت کے فرش پر دو مخالف جنس فرط و انبساط کی بے کراں لہروں میں ڈوب رہے تھے... ابھر رہے تھے...!

صبح اس کی آنکھ کھلی تو گاڑی دلی پہنچ گئی تھی۔ اس نے مخمور سی انگڑائی لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں رات کا خمار باقی تھا اور چہرے پر تازگی تھی۔ خاتون کیبن میں موجود نہیں تھیں۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ ان کا سامان بھی نہیں تھا۔ ڈیش بورڈ پر منرل واٹر کی خالی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ اس نے برتھ کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ چائے کے خالی کپ لڑھکے پڑے تھے۔

پلیٹ فارم پر اترتے ہی گرم ہوا کے جھونکوں نے اس کا استقبال کیا اور اس کو اچانک سب کچھ خواب سا معلوم ہونے لگا... رات کی باتوں کو اس نے یاد کرنے کی کوشش کی... خاتون کے خدوخال مٹتے نقوش سے ابھرے... اس کو اپنا سفر بھی خواب معلوم ہوا... اس کو لگا جیسے وہ دھند میں چلتا ہوا یہاں تک آیا ہے... پھر بھی وہ ایک سرور سا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پراسراری تمازت تھی۔ اس نے ایک سگریٹ سلگائی اور سامنے پھیلی بھیڑ کی طرف دیکھ کر مسکرایا...

''بچاروں کو کیا پتہ کہ وہ رات ایک بورژوا حسینہ سے ہم بستر تھا...''

اس کی نظر کتابوں کے اسٹال پر پڑی۔ اس نے انڈیا ٹوڈے کا شمارہ خریدا اور یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ اسی طرح اس کی بیوی لرل صابن خریدتی ہے...!

کوآپریٹو سوسائٹی

وہ کھرا آدمی بالکل مایوس کھڑا تھا۔

ہاتھ میں تالا لیے ادب سے اس کے ہال سے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔

بظاہر یہ بات انتہائی غیر منطقی تھی۔ اس کے ذہن میں معاملے کا یہ انتہائی رخ اس سے پہلے کبھی نہیں ابھرا تھا۔ وہ اس سوسائٹی کا جس کی میٹنگ ابھی ابھی ختم ہوئی تھی، ایک بنیادی ممبر تھا اور اس کے فروغ کے لیے ہمیشہ ہی اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ یہ سوسائٹی اس کالونی کے مکینوں کے فلاح و بہبود کے لیے بنی تھی اور اس کا قیام اس مقصد سے ہوا تھا کہ کسی سامان پر جو خرچ آئے اتنے ہی پیسوں میں وہ اس کالونی کے لوگوں کو مل جائے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد دیکھا گیا کہ اس کالونی کے اردگرد رہنے والے کچھ اور لوگ بھی یہیں سے سامان خریدنے کے لیے لپکنے لگے تھے۔ ان کو روکنا عملاً ممکن نہیں تھا کیونکہ عملہ کا کوئی رکن کالونی کی تمام عورتوں اور بچوں کو نہیں پہچانتا تھا۔ لیکن اس بڑھتی ہوئی بھیڑ سے جو بے چینی پیدا ہوئی اس کا اظہار لوگوں نے اگلی میٹنگ میں کیا۔ اس پر بحث ہوئی اور تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد یہ طے پایا کہ سوسائٹی چیزوں کی قیمت پر کچھ منافع بھی لے اور اس منافع میں سے تھوڑی رقم سوسائٹی کے اراکین میں تقسیم کر دی جائے اور تھوڑی رقم سوسائٹی کے مشترکہ مقاصد کے لیے خرچ ہو جس میں ایک عمدہ عمارت کی تعمیر اور دیگر سہولیات کا ذکر ہوا۔

اس میٹنگ کے دوران کچھ لوگوں نے یہ بات دلچسپی سے سنی تھی کہ اگر منافع کمایا جائے تو اس سے سستا سامان دینے کے علاوہ کچھ اور بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ جیسے اس آمدنی میں سے کچھ خرچ کر کے اچھا خاصا سماجی، معاشی اور سیاسی اثر خریدا جا سکتا تھا جو سوسائٹی کے اراکین کے کام آ سکتا تھا۔ گفتگو اور بحث کے دوران ذہین تر مقرروں کے یہ اشارے بھی سننے کو ملے کہ کسی بھی سوسائٹی کے کسی عام رکن کی دلچسپی کا مرکز تو صرف وہی پیسہ ہوتا ہے جو وہ اپنی جیب سے دیتا ہے۔ صرف اسی کے اوپر وہ کڑی نگاہ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی منافع پیدا ہوتا ہے تو اس کے انتظام کی ذمہ داری کو لوگ انتظامیہ کے سرگرم اراکین کے اوپر چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ یہ پہلو کسی عام رکن کے تخیل کے دائرے سے باہر تک پھیلا ہوتا ہے۔

میٹنگ میں ہو رہی ایسی گفتگو کو سن کر اس کھرے آدمی کو اپنے لاشعور کی گہرائی میں کوئی بنیادی بات ادھر سے ادھر کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی لیکن وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ وہ کیسا محسوس کر رہا تھا اور اس کو وہ لفظوں میں کیسے پکڑے۔ میٹنگ تیز رفتاری سے منطق کی گہری لیک پر چل رہی تھی۔ وہ خاموش رہا۔ پھر بھی جب

گفتگو اختتام کو آئی تو اسے محسوس ہوا کہ کم از کم اسے ٹوک تو دینا ہی چاہیے۔ اس نے ایک انتہائی صاف گو اور کھرے انسان کی طرح کھڑے ہو کر کہا۔

''آپ لوگ جو کچھ سوچ رہے ہیں اور کرنے جا رہے ہیں اس میں مجھے کوئی برائی نہیں دکھائی دیتی۔ پھر بھی میں ایک بات کو دہرانا چاہتا ہوں کہ جس مقصد کے لیے یہ سوسائٹی قائم ہوئی تھی وہ مقصد ہمیشہ مدنظر رکھا جانا چاہیے اور مقصد یہ ہے کہ جو سامان جتنے میں حاصل کیا جائے... اس کے بعد آپ کچھ بھی کرتے ہوں اس میں اگر اچھے امکانات پیدا ہو رہے ہیں تو یہ اچھی ہی بات ہے۔''

اس نے یہ کیوں کہا تھا اس کا تو اس کو اندازہ نہیں ہوا لیکن اس مداخلت کے بعد اس نے خود اپنے کو مطمئن پایا۔ چیرمین نے پوچھا بھی تھا کہ وہ کہنا کیا چاہتا تھا کہ اس کی بات کو میٹنگ کی روداد میں لکھ لے لیکن اس نے الجھن میں اکڑے ہوئے اپنے ہی سر کو جھٹکتے ہوئے کہا تھا۔

''نہیں، میں کہہ کچھ نہیں رہا ہوں۔''

اس کی سادہ بات اپنے اندر اس قدر بنیادی بات تھی کہ اس کو دہرانا ایک لغوسی بات لگ رہی تھی اور لوگوں نے مذاق اڑاتی ہنسی کے ساتھ اسکی طرف دیکھا تھا۔ اس کے بعد میٹنگ کی کارروائی اور آگے بڑھی۔ چونکہ اب سوسائٹی کی کارکردگی کے امکانات اور وسیع ہو رہے تھے اس لیے اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اس سلسلے میں ایک واضح آئین مرتب ہو جس میں لوگوں کے فرائض اور حقوق کے بارے میں حتی الامکان وضاحت موجود ہو۔ بلکہ ایسی ٹھوس وضاحت موجود ہو کہ اس کو کوئی بھی کبھی توڑ مروڑ نہ سکے۔

اس نکتۂ نظر کی سب نے پُرزور حمایت کی کیونکہ دنیا سب نے دیکھی تھی اور سب جانتے تھے کہ اگر کہیں وضاحت اور معنوں میں ذرا بھی گنجائش رہ جاتی ہے تو مکار لوگ آگے چل کر اس کا کس قدر فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ سوسائٹی کے اوپر اختیار کے سلسلے میں بھی کئی دفعات بنائے گئے اور اس میں یہ بات بھی بالکل واضح کر دی گئی کہ سوسائٹی کی پچاس فیصد سے زیادہ کی اکثریت کسی بھی وقت میٹنگ بلا کر انتظامیہ کمیٹی کو بدل سکتی ہے۔ یہ بھی طے پایا کہ سوسائٹی کے سارے کاروبار اور لین دین کا حساب کتاب رکھنے کے لیے مستند رجسٹر ہوں گے جن پر تمام ممبران کے دستخط ہوں گے تاکہ یہ رجسٹر کبھی دھوکے سے تبدیل نہیں کیے جا سکیں اور گو کہ وہ بات جو اس کھرے شخص نے کہی تھی وہ بے نکتہ تھی لیکن وہ بات بھی اس میں شامل کی گئی کیونکہ دل ہی دل میں اس کی اہمیت کو سب سمجھ رہے تھے اور وہ ہنسے صرف اس لیے تھے کہ وہ بات کسی ذہین شخص نے کہی تھی۔ سوسائٹی تیزی سے آگے بڑھی اور ایک پھلتے پھولتے کاروبار کی طرح اس میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے علاوہ اب بڑے بڑے سامان بھی منگانے کی بات ہونے لگی۔ کہاں آلو پیاز اور اب کہاں ٹیلی ویژن اور ماروتی کاروں کی بکنگ۔ سوسائٹی کی میٹنگوں میں انتظامیہ کمیٹی کے اراکین سنجیدگی اور دوراندیشی سے فیصلے کرتے ہوئے دور دور تک کے فائدے کے امکانات پر گرفت رکھنے لگے۔ پھر تو سوسائٹی کا یہ عالم ہوا کہ ایک دن یہ فیصلہ کیا گیا کہ لوگوں کو سامان اس سے بھی کم قیمت پر دیا جائے جتنی

اس کی لاگت آتی ہے اور اس کے باوجود منافع میں بھی ان کو سالانہ حصہ دیا جائے۔ لوگوں کو منافع کی ایسی رقم ملنے بھی لگی۔

سوسائٹی کے دفتروں کے لیے اب ایک الگ پُرشکوہ عمارت بنائی گئی اور اس کے کاغذات اور پیسوں کی حفاظت کے لیے گارڈ بھی لگائے گئے جو سوسائٹی کے ممبروں کو بھی بغیر ضروری پوچھ تاچھ کے اندر نہیں جانے دیتے تھے۔ سوسائٹی کے دفتروں میں ایک پرسکون فضا قائم رکھنے کے لیے اور غیرضروری بحث مباحثوں کے شور کو الگ رکھنے کے لیے ایک دن یہ سختی بھی کرنی پڑی کہ کوئی ممبر بھی کسی ضروری کام یا اجازت یا آئین کے مطابق ملے ہوئے اپنے اختیارات یا کسی ذمہ دار کارکن کی دعوت کے بغیر اندر نہیں جاسکتا تھا اور یہ طے پایا کہ اگر کوئی ایسی بنیادی ضروری بات نہ ہو کہ اندر گئے بغیر کام ہی نہ چلے تو پھر محض گفتگو اور تبادلہ خیال وغیرہ کے لیے اراکین سوسائٹی کی طرف سے بنائی گئی اس کینٹین میں جایا کریں جہاں سستی قیمت پر چائے ملتی تھی اور یہ مشورہ دیواروں پر لکھ کر لگا دیا گیا کہ گپ شپ اور تبصرہ کے لیے وہیں کی فضا زیادہ موزوں تھی۔ یہ کینٹین واقعی شاندار تھی۔

پوری کالونی کو اس سوسائٹی کی طرف سے مکمل اطمینان تھا۔ اراکین کے گھر پر سوسائٹی خود ہی سامان بھجوا دیتی تھی تاکہ اراکین کو سوسائٹی کی دوکانوں یا دفتروں میں جانے کی زحمت نہیں کرنی پڑے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی سامان خراب نکلتا تو سوسائٹی کی گاڑی خود اسے واپس لے جاتی تاکہ اراکین کو اس سلسلے میں سوچنے کی زحمت بھی نہ کرنی پڑے۔ اس سے واقعی کالونی والوں کو جو ذہنی فراغت نصیب ہوئی تو انہوں نے اپنی اپنی جگہوں پر یکسوئی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ دفتروں میں انہیں زیادہ عزت ملنے لگی اور کاروبار میں برکت دکھائی دینے لگی۔

سوسائٹی کی اس کامیابی کو سبھی ننگی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ایک دن کہیں سے یہ بات بگولے کی طرح اٹھی کہ سوسائٹی کے معصوم اراکین سرمستی میں اس بات سے بے خبر ہیں کہ دراصل اب سوسائٹی اس قدر چل نکلی ہے کہ اس کی آمدنی میں ہر ممبر کا جو حصہ ہوتا ہے وہ دراصل اس ممبر کی ذاتی آمدنی کے ایک بڑے حصہ کے برابر ہے، لیکن ان کو اتنا مل نہیں رہا تھا۔ یہ چہ چا زوروں سے ہوا کہ سوسائٹی کے امکانات بے حد روشن ہیں اور ملک کی دوسری سوسائٹیوں نے تو اتنی ترقی کی ہے کہ سو سو اراکین کی سوسائٹیاں اب منافع اور سرکاری مراعات کی وجہ سے کروڑوں روپے کی مالک ہوگئی ہیں اور کئی سوسائٹیاں تو اب پونجی پتیوں سے مل کر یہ بھی کرنے لگی ہیں کہ ان کے سامان کو اپنے کھاتے کے ذریعے بیچتی ہیں تاکہ اس سے ٹیکس کی بچت ہو۔ اس کے بعد ہر ممبر کے دماغ میں ایک سوال تو ضرور اٹھنے لگا۔

''کیا ہماری سوسائٹی میں بھی ایسا ہو رہا ہے؟''

لوگوں میں ایک گفتگو سی چل پڑی۔

''ہمیں چھان بین کرنی چاہیے۔''

کچھ لوگوں نے تو اس گفتگو کو یہ کہہ کر روکنا چاہا کہ اس بات کو بے جا ہوا دی جا رہی ہے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ سوسائٹی کے منتظمین کو ڈسٹرب کرنے سے کیا فائدہ؟ لوگوں کو فائدے سے مطلب ہے اور فائدہ انہیں مل رہا تھا۔

انہیں میں سے ایک نے اس کھرے آدمی سے کہا۔

''کون سی سہولت ہے جو شہر کی کسی دوسری سوسائٹی میں اس قدر ملتی ہے جو ہم لوگوں کو مل رہی ہے۔ ایک دن تمہیں نے کہا تھا کہ تمہیں اور کسی چیز سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ تمہیں صرف ایک بات سے زیادہ تعلق ہے اور وہ یہ کہ سوسائٹی جس مقصد کے لیے قائم ہوئی تھی اس میں اس کے اراکین کو دھوکا نہ ہو اور تم اسی پر زور دینا چاہتے تھے جو لوگ سوسائٹی کے کارکن ہیں وہ سوسائٹی کو کیسے چلا رہے ہیں یہ وہ بہتر جانتے ہیں۔ یہ کیا کم ہے کہ ہمیں بے شمار دیگر سہولیات بھی میسر ہیں۔ کیا یہ محض ہماری ذہنی الجھن کا نتیجہ نہیں کہ اب ہم ان کارکنوں کی کارکردگی میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگے ہیں اور آخر یہ سارا کچھ فائدہ انہیں کی محنت کا تو نتیجہ ہے۔''

''میں کہاں اس آئین کے خلاف کچھ کہہ رہا ہوں جو پہلے دن طے ہوا تھا لیکن ہمیں یہ تو دیکھنا ہی ہے کہ اگلے انتخاب میں ہمیں کمیٹی کے ان ممبروں کو بدلنا ہے یا انہیں کو رکھنا ہے۔'' کھرے آدمی نے کہا۔

پچھلے بارہ سالوں میں سوسائٹی کے سو ممبروں میں سے ہر سال پانچ نئے لوگ ہی کارکن مقرر ہوئے ہیں اور اب تک تو تقریباً آدھے سے زیادہ ممبر خود کارکن رہ چکے ہیں۔ پھر ہم شبہ کس کے بارے میں کر رہے ہیں؟ آپ خود کارکن بن کے دیکھ لیں۔ آپ تو خود اس کی الجھنوں سے دور بھاگتے ہیں۔ ہر بار تقریباً اسی قسم کے اعتراضات کی وجہ سے یا حفظ ماتقدم کی بنا پر نئے لوگوں کو کمیٹی میں لایا گیا۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہر سال یہی اعتراض ہوتا ہے کہ سوسائٹی کا کام ٹھیک سے نہیں چل رہا ہے جس کے پس پردہ دراصل یہ اشارہ ہوتا ہے کہ کہیں نہ کہیں کچھ گھوٹالہ ہے لیکن اس کے باوجود کچھ بولتا نہیں۔ وہ تو جانتے ہیں جو خود کمیٹی کے ممبر رہ چکے ہیں، جن کو تجربہ نہیں ہے صرف وہی لوگ اعتراض کرتے ہیں اور پھر یہ کہ اس تمام شور شرابا کے باوجود کبھی کوئی ٹھوس بات سامنے نہیں آئی۔

اگلی میٹنگ میں کھرے آدمی نے سختی کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ 'میں یہ مانگ کرتا ہوں کہ سوسائٹی کے اکاؤنٹس کی آڈٹ کرائی جائے۔

چیرمین نے فوراً اس کی بات کی طرف توجہ کی اور کہا۔

''میں سوسائٹی کے اراکین کے اعتماد کو بحال رکھنے کے لیے اپنے معزز دوست کی اس عمدہ رائے کی تائید کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ حضرات خود اپنے درمیان سے ایک ممبر ایسا دیں جسے آڈٹ پارٹی کا سربراہ مقرر کیا جائے۔''

فوراً کسی شخص نے اٹھ کر کسی آدمی کا نام تجویز کیا۔

دوسرے لوگوں نے اٹھ کر چستی سے اس کی تائید کی۔

''لیکن میں چاہتا ہوں کہ آؤٹ پارٹی کا ممبر کوئی ایسا شخص ہو جو ابھی تک انتظامیہ میں نہیں رہا ہو۔''

اس کھرے آدمی نے کہا۔

'ٹھیک ہے آپ کے جذبات کا لحاظ رکھا جائے گا۔ کوئی شخص جو پہلے انتظامیہ کا ممبر نہیں رہا ہو۔ میٹنگ میں سوسائٹی کے ایک سو اراکین میں تیس پینتیس اراکین غیر حاضر تھے۔ باقی لوگوں میں ساٹھ اراکین ایسے تھے جو پہلے کمیٹی کے ممبر رہ چکے تھے۔ صرف پانچ اراکین ایسے تھے جو کمیٹی کے کبھی ممبر نہیں رہے تھے۔

''کیا ایسے لوگ ہاتھ اٹھائیں گے جو انتظامیہ کے کبھی ممبر نہیں رہے۔''

صرف وہی پانچ ہاتھ اٹھے۔

بھاری اکثریت خاموش رہی۔

''یہ انتہائی افسوس کی بات ہے' چیرمین نے بھاری لہجے میں کہنا شروع کیا' ہمارے اراکین سوسائٹی کے کاموں میں دلچسپی نہیں لیتے اور سچ تو یہ ہے کہ جو لوگ انتظامیہ کے ممبر ہوتے آئے ہیں وہ اپنی دل جمعی کی وجہ سے منتخب ہوئے وہ لوگ انتہائی سرگرم اراکین تھے اور آج بھی ان میں اس قدر مستعدی ہے کہ وہ پورے کے پورے موجود ہیں۔ اعتراض صرف ست لوگ کرتے ہیں۔''

ہال میں تالیاں گونج اٹھیں۔

'بہرحال۔ آپ حضرات ان میں کسی کے نام کی تائید کریں۔

کھرے آدمی نے اٹھ کر اس میں سے ایک شخص کا نام تجویز کیا اور آؤٹ پارٹی کے سربراہ کی حیثیت سے اس آدمی کا انتخاب ہوگیا۔

میٹنگ کی کارروائی آگے بڑھی۔

''اب آپ کو اپنی نئی انتظامیہ کمیٹی کا بھی انتخاب کرنا ہے۔ اب تک کی تاریخ یہ رہی ہے کہ جو بھی کمیٹی اس انتظامیہ میں آئی اس کی مخالفت اس بنا پر کی گئی کہ وہ کمیٹی ایماندار نہیں تھی۔ حالانکہ کبھی بھی بے ایمانی ثابت نہیں ہوسکی۔ جن لوگوں نے نکتہ چینی کی وہی لوگ منتخب کر لیے گئے اور اب وہ سب آپس میں خاموش اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی تنقید بے جا تھی۔ 'بہرحال' اس وقت اس کمیٹی کا سربراہ میں ہوں۔ اس موجودہ کمیٹی کی بھی ایک سال کی میعاد پوری ہوچکی ہے اور اب آپ کو نئی کمیٹی کا انتخاب کرنا ہے۔''

لوگ خاموش رہے۔ چیرمین نے آگے کہا۔

''گو کہ اب تک یہ روایت قائم ہوچکی ہے کہ ہر بار وہی لوگ کمیٹی کے ممبر ہوتے ہیں جو اس سے پہلے کمیٹی کے ممبر نہیں تھے لیکن یہ بات اب بہت ہی تنگ آمیز لگنے لگی ہے اور یہ بے حد لغوی بات ہے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ مجھے اکثریت پر شک کرتے ہوئے جو پشیمانی ہو رہی ہے اس کا اظہار کیے بغیر میں رہ نہیں سکتا۔ اس لیے میں اس روایت کو توڑنے کی پرزور سفارش کرتا ہوں۔ ایسا میں اس لیے کر رہا ہوں

کہ سوسائٹی کی عظیم کامیابیوں کے باوجود ہماری میٹنگوں میں یہ ناگوار رویہ قائم رہا ہے کہ ہر بار اس کے کارکنوں کو تعریفی نظر سے سراہنے کے بجائے ان کی توہین کی گئی ہے۔ ہمیں دراصل اس پرانے گھٹیا نقطہ نظر کو بدلنا چاہیے اور دیکھنا یہ چاہیے کہ کسی کمیٹی نے سوسائٹی کے اثاثے کو کہاں تک آگے پہنچایا ہے۔ ہمیں منفی انداز میں سوچنے کے بجائے مثبت انداز میں سوچنا چاہیے۔"

چیرمین نے اس تقریر کے بعد سامعین سے پوچھا۔

"کیا آپ چاہتے ہیں کہ کمیٹی کا کام ان لوگوں کے ہاتھوں میں سونپا جائے جن کو اس سلسلے میں تجربہ نہیں ہے یا آپ یہ چاہیں گے کہ اب یہ ذمہ داری ان لوگوں کو دی جائے جنہوں نے ماضی میں اپنی خدمات کے زمانے میں سوسائٹی کو بلند سے بلند تر کیا۔ میں انتخاب کے کسی اصول کی مخالفت نہیں کر رہا ہوں اور یہ بھی نہیں کہہ رہا ہوں کہ انتخاب کامیابی کی صلاحیتوں کی بنیاد پر ہو۔ میں ان بنیادی جمہوری اصولوں کی نفی قطعی نہیں کر رہا ہوں جو انسان کی مرضی اور سروکار کی عکاسی کرتے ہیں۔ لیکن بے جا تعجب اور بے جا خوف اپنے ذہن میں بسا کر اپنی رائے کو اس کا قیدی بنا دینا بھی مناسب نہیں ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ اپنے ذہن کو خوف کا قیدی بنائے رکھنے کے بجائے اپنی آزادی فکر کا استعمال کرتے ہوئے غور کریں کہ سوسائٹی کی ترقی کس بات میں مضمر ہے۔"

"ٹھیک ہے مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے" وہ کھرا آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔ "لیکن یہ فیصلہ بھی اسی میٹنگ میں ہو جائے تو بہتر ہے کہ جس شخص کے خلاف آڈٹ رپورٹ میں کوئی بھی بے ایمانی کی بات پائی جائے گی۔"

تھوڑی دیر تک میٹنگ پر ایک بھاری خاموشی طاری رہی۔ پھر چیرمین نے کہا۔

"آپ بجا فرما رہے ہیں لیکن آپ کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ ہم آڈٹ کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ ہمارے بارے میں ان تفصیلات میں جائے جہاں ہم نے سوسائٹی کے مفاد کے لیے نیک نیتی سے کچھ کیا ہے اور میں چاہوں گا کہ آپ کی باتوں کا اطلاق ان لوگوں پر نہ ہو جنہوں نے کوئی نمایاں کامیابی دکھائی ہے کہ میں ایمانداری اور بے ایمانی کے اصولوں سے زیادہ اہم اراکین کے مفاد کو سمجھتا ہوں اور یہ اس لیے کہ ہماری سوسائٹی ایمانداری کے معنوں پر تحقیق کرنے کے لیے نہیں بلکہ اراکین کے لیے سستے داموں پر سامان مہیا کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔"

وہ کھرا آدمی اسٹیل کی چھڑی کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دوبارہ اپنے نکتے پر زور دینے کی کوشش کی۔ "میں آپ کی باتوں کی اہمیت اور معنویت کا اعتراف کرتا ہوں لیکن میں کہتا ہوں کہ آڈٹ کے اصولوں اور ایمانداری کو بہر حال قائم رکھا جائے کہ یہی مستقبل میں بھی سوسائٹی کی کامیابی کے ضامن ہوں گے۔"

"یعنی ہماری اب تک کی کامیابی ہماری ایمان داری کا ٹھوس ثبوت نہیں ہے اور اس بنیاد پر جو آپ کی

ہی گفتگو کی بنیاد ہے' میں کہہ سکتا ہوں کہ مستقبل میں ہم اسی طریقہ کار پر بھروسہ کر سکتے ہیں جس پر چل کر ہم یہاں تک پہنچتے ہیں۔"

"نہیں۔ میں ایمانداری کو پھر بھی۔" اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ لیکن وہ سنبھل کر پھر بولا۔ "آپ غالباً یہ سوچ رہے ہیں کہ اگر آپ کا کوئی کارکن مستقبل میں بھی سب کو دھوکے دیتا ہوا خود پیسے بناتا رہے اور محسن کے پیسے سے اپنا کاروبار کہیں اور چمکاتا رہے تو اس میں کوئی برائی نہیں۔"

کھرے آدمی کو لگا کہ جیسے اس نے مخالفین کے اوپر ایک بہت بڑا پتھر پھینک دیا ہو۔ لیکن ہوا کچھ بھی نہیں۔ بلکہ مزید وہ غصہ میں آ گئے۔ چیرمین نے سخت لہجے اور قدرے اونچی آواز میں اسی کھرے آدمی کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ اس میں کوئی برائی نہیں۔ یہ میری رائے ہے اور میری رائے یہ بھی ہے کہ آپ خواہ مخواہ سوسائٹی کے ان اراکین کا جو بھی معزز ہیں اور اس میٹنگ میں اپنا اپنا کاروبار چھوڑ کر شامل ہوئے ہیں۔ ان کا بے حد قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ممکن ہے یہ بات آپ کو بری لگے لیکن میں ایمانداری سے اپنی اس رائے کا اظہار کر رہا ہوں۔" وہ ہیرو کی طرح گرجا۔ "ہاں، اگر ان کی بات پر غور کرنا ضرور ہی ہو تو ہم اگلے مہینے انہیں کے اٹھائے ہوئے نکتے پر سوسائٹی کی جانب سے دانشوروں کا ایک سمینار کر لیں گے اور اس سمینار میں طے کریں گے کہ برائی اور اچھائی کے سلسلے میں اخلاقیات ارتقا کی کس منزل تک پہنچی ہے۔" چیرمین نے اور لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

ہال میں زوردار تالیاں بج اٹھیں۔

چیرمین نے آگے کہا 'ہم کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتے۔ ہم ساری باتیں کھل کر کہنا چاہتے ہیں۔ وہ کھڑا کا کھڑا رہا۔

چیرمین نے لوگوں کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور ان آنکھوں میں کچھ پرکھا اور آگے کہا۔ "بلکہ میں یہ کہوں گا کہ ہم اس آڈٹ پارٹی کا قیام کر کے خواہ مخواہ اپنی ترقی کی راہ پر گامزن سوسائٹی کو لگام نہ دیں بلکہ اسے آزادانہ آگے بڑھنے دیں کیونکہ یہ سوسائٹی جو دوسری سوسائٹیوں سے کامیابی کی دوڑ میں برسرِ پیکار ہے ایک مقابلے سے بھرے نازک دور سے گزر رہی ہے۔"

میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ ایک نے اٹھ کر کہا۔

"اور میں تجویز رکھتا ہوں کہ ابھی ابھی جو تجویز آڈٹ پارٹی قائم کرنے کے بارے میں پاس ہوئی ہے وہ رد کی جائے۔

ہال میں تالیاں بجیں

ٹھیک ہے، چیرمین نے پہلے والی تجویز سرخ قلم گھما کر رد کر دی۔

"بلکہ میری ایک اور تجویز ہے۔ وہ سارے اکاؤنٹس نذرِ آتش کر دیئے جائیں جو ہمارے مردہ ماضی کی

زندہ یادگاریں ہیں۔"

ہال میں زبردست تالیاں بجیں۔

کھرا آدمی کھڑا کا کھڑا رہا۔

"میں اس تجویز کی تائید کرتا ہوں" ایک آواز آئی۔ پھر کئی آوازیں ایک لڑی میں گھنی ہوئی آئیں۔

"ہم سب تائید کرتے ہیں۔" تائیدی آوازوں کا ایک سلسلہ دیر تک گونجتا رہا۔

یہ تجویز نوٹ کرلی گئی۔ چیرمین نے لوگوں کے چہرے کی بشاشت دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ لوگ ہاتھ اٹھائیں جو اس تجویز کی تائید کرتے ہیں۔"

پورے پچپن لوگوں نے ہاتھ اٹھائے۔

"اور آپ سب؟" اس نے انتظامیہ کمیٹی کے ساتھیوں سے بھی پوچھا۔

"ہم بھی تائید کرتے ہیں۔"

"اب کل سے سارے اکاؤنٹس نئے لکھے جائیں گے اور پرانے تمام اکاؤنٹس کو ان میں سے موجودہ لین دین کے اقتباسات لے لینے کے بعد جلا دیا جائے گا۔ یہ کام ایک ماہ کے اندر ہو جانا چاہیے۔ اس عمل سے سوسائٹی ترقی کے ایک نئے مرحلے میں آجائے گی۔"

"کیوں نہ یہ کام دس دن کے اندر کریں۔"

"میں تو کہتا ہوں کہ دو دن کے اندر کیوں نہیں ہوسکتا۔ کبھی تو ہم اپنی غیر معمولی چستی کا مظاہرہ کریں۔ اس سے اراکین کے اندر خود اعتمادی اور حوصلے کا جذبہ اور بڑھے گا۔"

گھنٹی بجی۔ باہر سے چیف اکاؤنٹنٹ کو بلایا گیا اور اس سے سکریٹری نے پوچھا کہ وہ کم سے کم کتنے عرصہ میں اس کام کو کرے گا۔

"ایک دن"

"کیا اور جلدی نہیں کرسکتے؟ چیرمین نے بظاہر ممبروں کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے کہا' کوشش کروں گا۔"

کوشش کی جارہی ہے کہ جلد سے جلد یہ پرانے کاغذات جلا دیئے جائیں۔ چیرمین نے اعلان کردیا۔ وہ کھرا آدمی کھڑا کا کھڑا رہا۔

"اب میٹنگ برخواست کی جاتی ہے۔" سب اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر لوگ نکلنے والے راستے سے ہوکر باہر جانے لگے۔ کچھ لوگ جو پیچھے تھے اور آہستہ آہستہ چل رہے تھے، بھیڑ کم ہوتے دیکھ کر وہ بھی جلدی جلدی دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

صرف وہ تنہا ہال میں رہ گیا تھا۔ اس کی نظر دروازے پر کھڑے ایک آدمی پر پڑی۔ وہ چوکیدار تھا جو دروازے کا تالا ہاتھ میں لیے ادب سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

حسن جمال

اِدھر مت بہو ہوا

صبح بے طبیعت ست تھی اور اب یہ سفید کاغذ کا پرزہ! فجر کی نماز میں پیش امام کے پیچھے سجدے میں گرتے ہوئے اسے یکا یک کپکپی چھوٹ گئی تھی۔ وہ شاید جبراً نیند سے بیدار ہونے کی وجہ سے تھی۔ بعد میں دیر تک مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر نمازیوں کی بے مطلب بحث کو بے دلی سے سنتا رہا۔ ٹیڑھی میڑھی سڑک پر رینگتی ہوئی اس کی نگاہ شہر پناہ کے دروازے کے برجوں کے اوپر افق پر پھیلتی روشنی پر گئی تو وہ اٹھا اور ہولے ہولے پاؤں گھسیٹتے ہوئے چلنے لگا۔ حالانکہ وہ ابھی چھیالیس برس کا ہی تھا لیکن روز اسے یوں لگتا تھا، جیسے اپنی عمر پوری کر لی ہو۔

گھر پہنچتے پہنچتے اس نے فیصلہ کر لیا کہ آج وہ کام نہ مانڈے گا۔ نہ ہوا تو دوپہر کے بعد۔ جسم ساتھ نہ دے تو کیسا کام؟ کیسی کمائی؟

دبے پاؤں بیٹھک میں داخل ہوا جو اس کی بیٹھک بھی تھی اور کارخانہ بھی۔ میلی چیکٹ گدی پر نڈھال سا پسر گیا اور روز روز کی سستی اور چکر سے نجات پانے کا کوئی ٹھوس اوپائے سوچنے لگا۔ آنکھیں موند کر، گہرائی میں اترتے ہوئے۔

''ٹیلی گرام'' کی آواز پر چونکا۔ لفافہ کھولتے ہوئے، لرزتے ہوئے ہاتھ... ایک تشویش جو ہمیشہ آس پاس منڈراتی رہتی ہے۔ تار تبھی آتا ہے جب خیریت نہیں ہوتی۔

''کس کا ہے؟'' ایک بڑھیا نے جو اس سے پانچ برس چھوٹی تھی، چکنے پتھر کی سل پر بنا ہینڈل کا کپ رکھتے ہوئے پوچھا۔

تار گھر کا آدمی جا چکا تھا۔

''نسیمہ کمنگ الیونتھ جون!''

تھوڑی انگریزی وہ جانتا ہے۔ مطلب سمجھایا۔ ایسی خبریں اس طرف سے بہت آنے لگی ہیں... ۷۱ء کی جنگ کے بعد سرحدیں کھلتے ہی... بار بار... جیسے طوفان زدہ جہاز سے ایک کے بعد ایک پیراشوٹ اتر رہے ہوں۔ لیکن پیراشوٹ والوں سے دھرتی کو خطرہ نہیں ہوتا۔ خطرہ ان گھروں کو بھی محسوس نہ کرنا چاہیے جہاں کبھی کبھار پیراشوٹ اتر آتے ہیں۔ سائبریائی پرندوں کی طرح۔ لیکن وہ ایک خاص موسم میں وارد ہوتے ہیں جب کہ مہمانوں کے لیے خاص موسم کبھی نہیں ہوتا۔ نسیمہ مہمان نہیں تھیں۔ اس کی سب سے بڑی

بہن تھیں... تین حج اور پانچ عمرہ کی ہوئیں۔

چائے زہر کی طرح لگی۔ کڑوی، بے ذائقہ اور ٹھنڈی۔ نگاہ اٹھا کر بڑھیا کو دیکھا۔ اس کے دائمی زرد مرجھائے چہرے سے بچا کھچا خون بھی ان چند لفظوں نے سوکھ لیا تھا۔ ایک دم سفید اجلے کفن کی طرح۔ وہ چپ تھی لیکن کہہ رہی تھی۔ اب کیا ہوگا؟

وہ دیر تلک اسی طرح بیٹھے رہے۔ گم صم۔ جیسے کاٹھ کے پتلے ہوں۔ کسی کوشش کے بغیر نہ ہلیں گے اور نہ ڈلیں گے۔ منجھلی صغریٰ ایک دفعہ وہاں آئی اور ابا اماں کو گم صم بیٹھے دیکھ کر الٹے پاؤں لوٹ گئی۔ خالی کپ ساتھ لے کر۔ سفید کاغذ کا وہ پرزہ جوتیوں کے سل کے پاس پڑا تھا جسے دونوں بے بسی سے دیکھ رہے تھے۔

''پچھلی بار کب آئیں؟'' کاغذ کو تہہ کر کے بنڈی کی جیب میں ڈالا اور اٹھا، کلینڈر دیکھنے کے لیے۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ آج گیارہ تاریخ ہی تھی۔ جوتی میکرس کی کاپرینو سوسائٹی کے گودام میں مال پہنچانے کا آخری دن۔ پرسوں خلیل آیا تھا۔ دھمکی دے گیا تھا۔ ''زیادہ پیسہ چاہیے تو زیادہ محنت کرو، رمضان چچا۔ یوں کیسے کام چلے گا؟ کتنا ایڈوانس لے چکے ہیں آپ؟ نہیں ہوتا ہے تو چھوڑیے یہ سب۔''

چھوڑنا اتنا آسان ہوتا ہے! یہ کل کا لونڈا... اس کے پہلے و آخری بیٹے کی عمر کا۔ آج اگر وہ زندہ ہوتا تو اسی کی عمر کا ہوتا، اتنا ہی خوبصورت اور گبرو۔ مگر افسوس، وہ اپنی لاچار ماں کو، بدنصیب باپ کو اور آرزومند بہنوں کو کلپنے کے لیے چھوڑ گیا۔ اگر اسے زندگی ملی ہوتی تو وہ تمیز سکھاتا۔ خلیل کی طرح گستاخ نہ ہونے دیتا۔ خلیل کا باپ ساری عمر جوتیاں گانٹھتے گانٹھتے مر گیا۔ کبھی محرومیوں سے نہ نکلا مگر خلیل میاں دیکھتے ہی دیکھتے فاختہ اڑانے لگے۔ زمانہ کتنی جلد کروٹ بدل لیتا ہے۔ چپکے سے... سب بدل جاتا ہے۔

''خواجہ جی کے چاند میں۔'' طویل خاموشی کے بعد ٹھنڈا سا جواب ملا۔

''رمضان بھی تو یہیں کیا تھا۔''

''ہاں۔ شب بارات بھی۔''

''بڑا بیٹا اور بڑی دلہن ساتھ تھی۔ اس بار منجھلے کے لیے کہہ گئی تھیں۔ شاید داماد بھی آئے۔ دو بیٹیاں بھی اور بچے تو ہوں گے ہی...''

''پارسال بہنوئی صاحب آئے تھے۔ ان کے دو دوست بھی ساتھ میں تھے۔ ان کو لے کر اجمیر، دلی اور آگرے بھی جانا پڑا۔ بمبئی کی بھی ضد کر رہے تھے...''

''وہ آپ کے عرفان چچا... کتنے دن ہوئے ہوں گے! لگتی سردی میں آئے تھے شاید۔''

''مجھے تو لگتا ہے، بارہ مہینے کوئی نہ کوئی آتا ہی رہا ہے۔ ان کے آنے اور جانے کے درمیان ہم ان کو خود سے الگ نہیں کر پاتے۔ تم کیا سوچتی ہو؟''

''میں کیا سوچوں؟ سوچنا تو ان لوگوں کو چاہیے جن کی محبتیں یکا یک امڈ آتی ہیں۔''

وہ یوں بول رہے تھے بے ربط جیسے اسٹیج کے نئے کلاکار ہوں، جنہیں کسی طرح مکالمے ادا کرنے ہیں۔ باوجود درد کے ان کے چہرے پر ہلکی سی چمک اتر آئی تھی۔ اپنے پن سے بھرپور! کوئی کسی کے پاس کیوں جاتا ہے" اپنا ہی سمجھ کرنا! لیکن محبت اور اپنے پن کے علاوہ بھی زندگی میں کچھ اور ہوتا ہے۔ وہی "کچھ" شاید اپنے پن کو کھا جاتا ہے۔

کاش! ان کا احسان زندہ رہتا۔ پانچ بہنوں کا ایک بھائی اور ان سب کی امیدوں کا چراغ... لیکن چراغ کی زندگی کا بھروسہ نہیں ہوتا اور اندھیرے لمبی عمر پاتے ہیں!

وہ پھر گدی پر تھا۔ اپنی جنت کو دیکھتا ہوا۔ جنت!۔ کیا سوچ کر نام رکھا ہوگا ماں باپ نے جنت بدلے جہنم ملا ہے۔ سینک سا بدن۔ پھونک مارو تو اڑ جائے۔ گوری چٹی ہونے کے باوجود بھی "جنت" نہ لگی۔ شروع میں دبلی پتلی۔ اب تو گوشت بھی باقی نہ رہا۔ سب سے زیادہ آفت اس "تنکے" پر آئی ہے۔ کہاں تک گھلے گی بیچاری! اس کی آنکھیں ڈب ڈبا آئیں۔

گلوگیر آواز میں بولا۔ "میں تجھے کبھی سکھ نہ دے سکا۔"

"نہیں، ایسی بات نہیں۔" جنت نے دھیرے سے کہا۔ "انہیں بھی ہماری حالت کا اندازہ ہونا چاہیے۔ آج چار پیسے ہوگئے تو پرانے دن تو نہ بھولنا چاہئے۔ چلو وہ بھی نہیں لیکن چھوٹی بھاوج کو اتنا حقیر سمجھنا... ساس کی طرح ہر بات میں نقص نکالنا۔

ہم غریب ٹھہرے، امیر والے طور طریقے کہاں سے لائیں؟ دسترخوان یوں بچھایا جاتا ہے... سالن یوں پکایا جاتا ہے... روٹی اس طرح سینکا کرو... بچوں کو یوں تمیز سکھاؤ... شوہر کے سامنے یوں جایا کرو... اماں تو ایسی نہ تھیں۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے!

وہ باجی کے دفاع میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر جنت کے دکھ کو بہہ دینے میں اسے بھی ایک چھوٹا سا سکھ مل رہا تھا۔ مانو، وہ اسی کی ترجمانی تھی۔ بڑے پیار سے نہارتا رہا اسے۔

"آپ کی دوسری بہن تو ایسی نہیں ہیں۔ انہوں نے بھی برے دن دیکھے۔ اب خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ کیا پاکستان کی ہوا میں ہی تکبر ہے؟"

"ایسا نہیں کہتے سب کا اپنا اپنا سبھاؤ ہوتا ہے۔ چھوٹی آپا کا مزاج جدا ہے۔"

"نہیں، وہ ہماری حالت کو سمجھتی ہیں۔ ہم سے بیجا امید نہیں رکھتیں۔ الٹے آڑے وقت میں مدد ہی کرتی ہیں۔ اپنی بھتیجیوں کے لیے ہر وقت فکر مند رہتی ہیں۔ نسیمہ باجی کو سوچنا چاہیے نا! غصے میں نتھنے پھول جاتے ہیں جنت کے۔" مانا کہ بھائی کی خودداری کچھ طلب نہیں کرتی۔ لیکن وہ خود بھائی کا ہاتھ مضبوط کر سکتی ہیں۔ یہ ڈھیر ساری دولت کس کام کی؟ مدد نہ کریں، ہمیں بار بار آزمائش میں تو نہ ڈالیں۔

آزمائش!

وہ چپ رہا۔ سچ مچ وہ دن آزمائش کے ہوتے ہیں جب اُدھر سے کوئی اِدھر آتا ہے۔ اس کے ہوتے وہ ہوٹل یا مسافر خانے میں تو قیام نہیں کر سکتے۔

لیکن جن آرام و آسائش کے وہ عادی ہو چکے ہیں، لاکھ کوشش کرے تب بھی وہ مہیا نہیں کر سکتا۔ ٹویا ٹاکار... آرام دہ بستر، مرغن کھانے، شاندار ریستورانوں میں پرتکلف دعوتیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ ان کے معیار کے مطابق ذرا بھی نہیں۔ مجبوری نہ ہو تو کیوں ٹھہریں۔ لوگ کیا کہیں گے؟ مسافت میں کچھ تکلیفیں برداشت کرنا ہی پڑتی ہیں۔ اپنی ناگواری کو وہ خاموشی کے خول میں چھپا لینا چاہتے ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ان کی خاموشی بھی ایسے پریشان کر دیتی ہے اور بڑبولا پن بھی۔ ہر لمحہ جب تک وہ قیام کرتے ہیں، اسے چھیلتے رہتے ہیں اور وہ متواتر چھوٹا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کی زبان تتلانے لگتی ہے اور ہر وقت سہما ہوا رہتا ہے۔ اپنوں کے سامنے، جو قریب ہوتے ہوئے بھی دور دکھائی پڑتے ہیں۔

گلی میں گہما گہمی شروع ہو چکی تھی۔ صبح کی دھوپ چپکے سے نالی میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ نالی... جس میں آس پاس کے سنڈاسوں کا میلا بہے گا اور پوری گلی ایک سڑاند کی گرفت میں آ جائے گی۔ کوٹھی میں رہنے والی باجی کو یہ سب پسند نہیں۔ کتنے گندے ہو تم لوگ، کچھ کرتے کیوں نہیں؟ جب تک میلا بہتا رہے گا، عورتوں اور مہتارنیوں کی چیخ چلتی رہے گی اور وہ ناک پر دوپٹے کا ڈانا لگائے صحن کے پاس والے برآمدے میں پڑی رہیں گی۔ نڈھال سی۔ پھر بھی مائکہ انہیں بہت پیارا ہے۔ جڑیں تو اسی گھر میں دبی پڑی ہیں۔ نالی تک! اماں کہا کرتی تھیں۔

یکا یک جنت رونے لگی۔ وہ جب تب ہر کسی کے سامنے اپنے اکلوتے احسان کو یاد کر کے آنسو بہانے لگتی ہے۔ اس کے اندر سدا کچھ نہ کچھ گھمڑتا رہتا ہے اور اچانک آنسوؤں کی صورت میں باہر نکل آتا ہے۔ پھر آپ ہی آپ پرسکون ہو جاتی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ جب وہ کسی فکر کی گرفت میں ہوتا ہے تو مسلسل ایک چھٹ پٹاہٹ اس کے پاس ہوتی ہے جیسے اندھی چڑیا پنکھ پھڑ پھڑا رہی ہو۔

''اسٹیشن جائیں گے نا!'' جنت اٹھتے ہوئے بولی۔ ماتم کرنے سے کیا ہوگا؟

''ہاں، جانا تو ہوگا ہی۔ ویسے آج طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے تو کوئی بڑی بیماری لگتی ہے۔ کب تک ڈاکٹر سے منہ چھپاؤں گا؟ یہ چکر... یہ ڈوبتا ہوا دل...''

نماز کے درمیان والی بے چینی نے پھر سر اٹھایا۔

''مت جاؤ۔'' جنت نے اس کے کندھے کو چھوا۔

''وہ آس رکھتی ہیں دلی تک کی۔ اسٹیشن بھی نہ جاؤں؟ آخر تار کس لیے بھیجا ہے؟

جنت چپ چاپ اندر چلی گئی۔ بے ترتیب گھر کو سنوارنا ہوگا۔ آتے ہی شروع ہو جائیں گی۔ ''تم

گندے لوگ!"

وہ بت کی طرح بیٹھا رہا۔ جنت کی پشت کو دیکھتا ہوا۔ مرجائے گی بے چاری! سب چھوڑ چھاڑ کے ہر وقت ان کی حاضری میں رہنا ہوگا۔ بڑی نند جو ٹھہریں۔

سامنے... الماری میں... چھوٹی بڑی خالی شیشیوں کے درمیان رکھی میز گھڑی کی طرف دیکھا۔ سات بجے تھے۔ گاڑی گیارہ بجے آئے گی۔ تب تک کچھ کام کرلے۔ اب تو کرنا ہی پڑے گا۔ ادھوری سلائی والے ڈھیر میں سے کچھ نامکمل جوتیاں نکالیں اور سوا دھاگا سنبھال لیا۔ ایک طویل سانس کھینچا تاکہ تازہ دم ہولے۔ رات رات بھر جاگ کر۔ بیوی بچوں کو بھی جگا کر پانچ سو جوڑی کا کوٹہ پورا نہ ہوا۔ آج بھی خلیل آئے گا۔ چچا چچا کہتے ہوئے چمچماتا رہے گا اور وہ خجالت سے، اپنے احسان کی عمر کے بچے سے مہلت مانگتا رہے گا۔

"ٹھیک ہے، کل ہر حالت میں مل جانی چاہئیں۔" دھمکی کے انداز میں وہ کہے گا۔

"رسیا کا آرڈر ہے کوئی مذاق نہیں۔ بلگاریہ کے بعد اتنا بڑا آرڈر پہلی بار ملا ہے ہمیں۔ کام نفیس ہونا چاہیے۔ جو بدمعاشی کی چچا تو ہماری ناک کٹے گی سو الگ، ملک کی بھی ساکھ مٹی میں مل جائے گی۔ کیا سمجھے؟"

سب سمجھتا ہے وہ۔ مال ہی کھرا اور پورا نہ ہو تو کام نفیس کیسے ہوگا؟ وہ تو پوری دیانت داری دکھاتے ہیں... مال میں اور محنت میں۔ ٹکوں میں مجبوراً کترنیں ڈالنی پڑتی ہیں۔ شکایت ابھرتی ہے تو کھنچائی بھی انہی کی۔ بنی ہوئی جوتی کو مرغی کی طرح چھیل کر ہوا میں نچاتے ہوئے چیخے گا خلیل... "یہ ہے آپ کا کام چچا؟ بدمعاشی چھوڑو۔ بتاؤ، چرایا ہوا مال کہاں چھپایا ہے؟"

اس اُدھ مرے کے پاس چھپانے کے لیے کیا ہے رے؟ درد ہی درد ہے۔ دیکھ سکتا ہے تو! کاش وہ دیکھ سکتا کہ اس تھوک تیاری میں کتنوں کی ناراضگی اس نے جھیلی۔ اپنے عزیز دوستوں کے لیے ایک جوڑی بھی محبت اور چاؤ سے بنانے کی مہلت نہ ملی۔ سب پیسوں کی بگاڑ کی نذر ہوگیا۔

مشین کی طرح اس کے ہاتھ چل رہے تھے جیسے حقیقتاً خلیل سر پر کھڑا ہو۔ پوشیدہ چابک لیے۔ اندر صحن میں گرد اڑ رہی تھی۔ جنت، صغریٰ، طاہرہ، زاہدہ سب جٹی ہوئی تھیں، جھاڑ پونچھ میں۔ سب سے چھوٹی زہرہ... گڈی گھوم گھوم کر تماشے کی طرح لطف لے رہی تھی... یہ میرے بابا کی فوٹو ہے! اماں! اماں!! بابا پہلے ایسے تھے؟ داڑھی بھی نہیں، عینک بھی نہیں۔ کیسے دیکھتے ہیں!

پرانی تصویر خود اس کے لیے اجنبی سی ہے... صرف پندرہ برس پرانی تصویر! گڈی کو پکار کر تصویر لے لی۔ وہ دس پیسے پاکر خوش خوش لوٹ گئی۔ اس کے لیے دس پیسے تصویر سے زیادہ قیمتی تھے مگر خود اس کے لیے تصویر محض تصویر نہیں، ایک تاریخی دستاویز تھی جیسے دیکھتے ہی خزاں کا موسم یاد آتا یا جہاز کا ڈیک جس پر

سے ایک کے بعد ایک مسافر، جو مسافر نہ تھے، اترتے چلے گئے۔ بڑے بھائی احمد آباد، منجھلے لاہور، اور چھوٹے کا پتہ نہیں کہ اسے بمبئی کا سمندر نگل گیا۔ اماں قبرستان میں لیٹی ہوئیں اور ابا منجھلے کے ساتھ۔ کبھی پلٹ کر بھی نہ آئے، بس وہ رہ گیا ہے اجاڑ ڈیک پر.... تنہا.... ہر تھپیڑا سہن کرتا ہوا۔

اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ اٹھ کر بیچ کا دروازہ بھیڑ دیا۔ جو صحن میں کھلتا تھا۔ گرد سے دمہ ابھر آتا ہے۔ آنکھیں بند کر کے وہ دیر تک سانسوں کے ہجوم سے الجھتا رہا۔ اس وقت وہ یوں لگ رہا تھا جیسے تاریکی میں کسی شاخ پر اکڑوں بیٹھا ہوا کوئی بندر ہو۔ گر پڑنے کے لیے تیار۔

یکا یک زور کا کھٹکا ہوا۔ تو باجی آگئی ہیں، لیکن وہ ڈبہ گرنے کی آواز تھی۔ جنت چیخی تھی۔ ''مال زادی سمیٹ سب۔ جوانی چڑھی ہے تجھے۔''

بچیوں میں سے کوئی نہ بولی۔ وہ کچھ نہیں بول سکتی تھیں۔ وہ حقیقی مہمان تھیں اس گھر کی۔ سب سے بڑی ہاجرہ کی رخصتی کے بعد چار مہمان! یہ جنت بھی جانتی ہے۔ وہ غصہ تو کسی اور پر تھا جس پر اختیار نہیں۔ ان بچیوں کے پژمردہ چہرے دیکھ کر وہ ہر بار کانپ اٹھتا ہے کہ بدنصیب باپ کی بدنصیب بیٹیاں... رات دن مخمل پر بیل بوٹے کاڑھنے والی نازک انگلیوں کو جانے کب کوئی پھول نصیب ہوگا! جی چاہتا ہے، انہیں سامنے بیٹھا کر کبھی سر جھکا دے کہ اے میرے باغ کی کلیو! مجھے سزا دو کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر پاؤں گا۔ مگر شریف بیٹیاں باپ کے سامنے اُف نہیں کرتیں۔ مگر ان کی خاموشی اس کا کلیجہ چیر ڈالتی ہے۔

کتنے اچھے دن تھے جب جہاز آباد تھا۔ تب ایک بچی خوشی نسیمہ باجی کے ساتھ آئی تھی۔ تب زمانہ اور تھا اور رشتوں میں مٹھاس برقرار تھی۔ وہ مٹھاس اب خواب کی چیز لگتی ہے۔

وہ جشن کے دن ہوتے تھے جب باجی آتی تھیں یا بہنوئی صاحب۔ بڑے پرخلوص اور تپاک سے ملنے والے۔ کبھی محسوس نہ ہونے دیتے کہ وہ ان سے چھوٹا ہے۔ اب تو ان سے بات کرتے وقت سہم جاتا ہے۔ پتہ نہیں ان کی آنکھوں کا رنگ ان برسوں میں کیوں بدل گیا؟ یا نہیں بدلا...! صرف اسے ہی ایسا محسوس ہورہا ہے۔ باجی کی رخصتی تو اسے یاد بھی نہیں۔ ۴۷ء کے پہلے کی بات ہے۔ وہ چار سال کا رہا ہوگا۔ اُن دنوں باجی کے سسرال کی حالت اچھی نہیں تھی۔ تبھی تو یہ شہر چھوڑنا پڑا۔ بعد میں حیدرآباد ہی ان کی شناخت بن گیا اور آبائی شہر بدیش۔ سنا ہے، دالوں کی تجارت میں ان کی بڑی حکومت ہے۔ ایک بار اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔ اب ان کی ساری دلچسپیاں سیاست میں گم ہو چکی ہیں اور ان کے بیٹے... اس کے بھانجے بڑے سلیقے سے تجارت سنبھال رہے ہیں۔ سب سے بڑے رحمان کی یاد آتی ہے... اسی صحن میں کچھوے کی طرح رینگتا تھا اور مٹی کے گل بوٹے بنایا کرتا تھا۔ وہ کئی بہنوں کے بعد ہوا تھا اور باجی اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔

وہی رحمان پچھلی بار آیا تھا۔ گینڈے کی طرح گیم شیم۔ پٹھانی سوٹ میں۔ باپ کی طرح دراز قد۔

بڑی بے تکلفی سے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہتا تھا۔ ''یار ماموں! آپ بڑے گاؤدی ہو۔ میں اتنی دور سے آیا ہوں اور آپ گم صم بیٹھے ہیں۔ آپ بلا کے بور ہیں۔''

وہ کیا بولتا؟ جشن کے دن بیت چکے تھے۔ حیران نگاہوں سے اپنے ہونہار بھانجے کی خوداعتمادی سے لبریز آنکھوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ اس کے سامنے اپنے آپ کو چھوٹا۔ بہت چھوٹا محسوس کرتا تھا۔ بھانجے نے اسی شہر میں ایک نئی دنیا آباد کر لی۔ ان دوستوں کے درمیان جو گاہے بگاہے وہاں جا کر اسے مہمان نوازی کا موقعہ فراہم کرتے تھے۔ کار میں گھومنا... مرغ مسلم اڑانا... یا خریداری کے لیے رقم کا بندوبست کرنا...

رحمان بھی غالباً ان سے ویسی ہی توقعات رکھتا ہوگا۔ کیا پوری کر پاتے ہوں گے یہ باتونی اور خوشامدی لوگ؟ خود وہ بھی کہاں کر پاتا ہے؟ روز گوشت، کھیر، مال پوے اور مشہور مٹھائیاں... ان سب میں ہی سانس پھولنے لگے تو کیسے انکی توقعات پوری ہو سکتی ہیں؟

ہر مہمان کے ساتھ اجمیر، آگرہ، احمد آباد، بمبئی کا سفر کرنا کیا اتنا آسان ہے؟ آخر کار پیسے پیڑ پر تو نہیں اگتے؟ مہمانوں کے ہمراہ سیر سپاٹا کرتا پھرے گا، تو کام دھندا کون دیکھے گا؟ کون ہے اس کا مدد معاون۔ کوئی بھی تو نہیں۔ وہ بے رخی کی حد تک خاموشی اختیار کر لیتا ہے، اس کے باوجود کوئی اس کا پرسانِ حال نہیں... یکے بعد دیگرے، سلسلہ ہے کہ ٹوٹتا ہی نہیں۔ وہ ہی ٹوٹ جائے گا ایک روز۔ سوکھ لو لہو کی ایک ایک بوند کہ کوئی حسرت باقی نہ رہے۔ اس ملک میں مجھے رہنے کی سزا دو۔ جہاں ترقی کے مواقع کچھ لوگوں کے لیے کبھی نہیں آتے۔ وطن سے جو نکلتا ہے وہی سرخ رو ہوتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ کبھی کہتے ہیں، وہ خوش نصیب ہے کہ آبائی جائداد اس کے پاس ہے۔ وہ کہنا چاہتا ہے۔ اے بھلے لوگو! جائداد لے لو اور اپنی پشت دے دو کہ اب اس کے بنا وہ ٹھیک طرح کھڑا بھی نہیں رہ سکتا۔

مگر کچھ آوازیں کبھی سنائی نہیں دیتیں۔ کم از کم اُن کانوں کو تو بالکل نہیں، جو روپوں کے کھنک سننے پک جاتے ہیں۔ اس کھنک سے گھبرا کر یا اکتا کر ہی تو وہ ادھر آتے ہیں۔ تین روز کی طویل مسافت کی صعوبتیں جھیل کر لاہور، امرتسر، دلی، جودھ پور، ڈھیروں سامان کے ساتھ گاڑی در گاڑی، بارڈر پر سودے بازی کرتے ہوئے۔ ساتھ لائے سامان کو مقامی کرنسی میں تبدیل کرتے ہوئے۔ کھوکھرا پار، منابہ کا راستہ اگر کھل گیا تو کیا ہوگا؟ وہ تو یوں ہوگا کہ اپنے ہی ملک میں ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر کر رہے ہوں۔ شام ہندوستان میں اور صبح پاکستان میں۔ سنا ہے، ہوائی سفر تو اور بھی آسان ہے۔ اس کے باوجود بیشتر لوگ ٹرین کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر مختصر راستہ کھل گیا تو اس کا کیا حشر ہوگا؟ اب جب بھی راستہ کھلنے کی خبر اڑتی ہے تو اس کی اور جنت کی نیند اڑ جاتی ہے۔ مستقبل کے خدشات سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جنگ کے بادل منڈلاتے رہیں، سرحدیں ہمیشہ بند رہیں، امن کی فضا کبھی قائم نہ ہو، یہ آرزو کرتے ہوئے اسے اپنے آپ پر شرم آنے لگتی ہے۔ کتنا کمینہ ہو گیا ہے وہ۔ امن کا دشمن، جنگ کا دیوانہ،

ہاں، یہ سرد جنگ ہی اسے کسی حد تک محفوظ رکھ سکتی ہے۔ پتہ نہیں لوگ ہمیشہ جنگ کو برا کیوں کہتے ہیں؟ کئی بار سوچتا ہے کہ صرف مالی حالت ہی اس کی ذمے دار ہے۔ لیکن ہر بار لگتا ہے، نہیں وہ کچھ اور ہے، جسے وہ بیان نہیں کر سکتا... اپنے درد کو... جو بھینسوں کی خوفناک ڈکاروں کو سن کر اٹھتا ہے، اس مغرور فضا میں جو اسے احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے آتی ہے مختلف شکلوں میں۔ ہاں، وہ مغرور ہوا ہی ہے جو اس کی چھوٹی سی دنیا میں طوفان برپا کر کے چلی جاتی ہے اور اس کی تھرتھراہٹ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ شاید اس ہوا سے دور بھی کچھ ہے جسے وہ پکڑ نہیں پا رہا، نہ پکڑ پائے گا اور کسی روز غبارے کی طرح پھٹ جائے گا۔ یا دمے کی سانس تھم جائے گی۔ نہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی معصوم بچیوں کا، غریب جنت کا کیا ہوگا؟

سن رہی ہو نسیمہ باجی! میں آپ کو کبھی خوش آمدید نہیں کہہ سکوں گا۔ سن رہی ہو نا؟ اس بار کفن لا رہی ہوا پنے ساتھ۔ اپنے بھیّا کے لیے، امریکی کمبل اور جاپانی شال کی طرح، سستہ کا کفن۔ آب زم زم میں تر کیا ہوا۔ پر مفت میں نہ لوں گا۔ پوری قیمت ادا کروں گا۔ ادا کرتا آیا ہوں۔

میں جانتا ہوں، سوغات اسے دی جاتی ہے جو سوغات دینے کے قابل ہو۔ میں تو ڈھنگ کا ایک جوڑا بھی اپنی باجی کو نہیں دے پاتا۔ اس لیے کفن بھی نہ لوں گا سوغات میں۔ اگلی بار آئیں گی تو میں اس کفن میں لپٹا مزے سے قبر میں لیٹا آرام کر رہا ہوں گا اور آپ پاگل ہوا کی مانند سر پٹخ رہی ہوں گی اس سونے شہر میں۔ اگلی بار آنا چاہتی ہیں تو مجھے ذرا سانس لینے دیں۔ سن رہی ہو نا نسیمہ باجی؟

''یہ آپ کس سے باتیں کر رہے ہیں؟'' پلو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی جنت داخل ہوئی۔

''کسی سے نہیں۔'' وہ ہڑبڑا گیا۔ کہاں تھا اتنی دیر؟

''ساڑھے دس ہو گئے۔ چلئے کھانا کھا لیجئے۔''

''نہیں اب میں چلوں گا۔'' اٹھتے ہوئے بولا۔ ''پیدل ہی جانا ہوگا۔ ٹیکسی کرنے کی سکت کہاں؟ واپسی میں کرنی ہی ہوگی؟ جانے کتنے لوگ ہوں گے؟ چائے... دودھ وودھ ہے کہ نہیں... آٹا... چاول... سب کا بندوبست کرنا ہوگا۔''

''پیسے؟''

''واپسی پر... ہاں ضرور... اللہ مالک ہے۔ خلیل آئے تو روکنا۔''

سیڑھیوں سے اترنے لگا تو ایک بار پھر کپکپی طاری ہوگئی۔ جیسے فجر کی نماز میں۔ اپنے آپ کو سنبھالا۔ نہ سنبھالتا تو نالی میں گرتا۔ گلی ہنوز گلزار بنی ہوئی تھی۔ مہترانیوں اور جاں باز عورتوں کی بک جھک اور میلے کے بچے ہوئے پرنالے... سڑاند اور گرد میں ڈوبی ہوئی تاریک گلی۔

تین فرلانگ کا راستہ بیس منٹ میں طے ہوا تھا۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ ٹھیک وقت پر اسٹیشن پہنچا تھا۔ دہلی میل آ چکا تھا۔ پلیٹ فارم کی گہما گہمی اسے مچھروں کا شور معلوم ہو رہی تھی۔ بھن بھن

بھن... مچھر اس کی آنکھوں میں بھی تیر رہے تھے۔ وہ بار بار آنکھیں مسلتا تھا اور گڑگڑاتا تھا... اے درد! ذرا ٹھہر۔ کچھ رحم کر مجھ پر۔

سر جھٹک جھٹک کر وہ ہوش میں آنے کی کوشش کرتا ہوا بھیڑ میں ٹکریں کھا رہا تھا۔ ایک دفعہ ٹوپی گر گئی۔ اٹھاتے اٹھاتے کئی پیروں تلے روندی جا چکی تھی۔ دل ڈوب رہا تھا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ایک عجیب سی دہشت اور گھبراہٹ۔

آخر کار نسیمہ باجی دکھائی دیں۔ غصے میں بھن بھناتی ہوئیں اور کلیوں کی ٹولی سے الجھتی ہوئیں۔ باجی کے بیٹے، بیٹیاں، داماد اور بچے کل بارہ ممبران بارات کی سی خوشی میں چہک رہے تھے۔

''ارے، تم اب آئے ہو!'' دیکھتے ہی برس پڑیں۔ ''تار ملا کہ نہیں؟''

اس کی زبان گنگ تھی۔ سر ہلا سکا۔ بس!

کمپارٹمنٹ کے دروازے کے پاس بیسویں بگ پر نگاہ ڈالتے ہوئے ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔

''سارا سامان اتر چکا؟

''کہاں؟ بڑے والا ٹرنگ اندر پڑا ہے۔'' باجی نے نتھنے پھلا کر کہا۔ ''سب بچوں نے اتارا ہے۔''

''اچھا، میں دیکھتا ہوں۔'' وہ ڈبے میں چڑھا۔

''امی! یہ ہمارے ماموں ہیں؟ رحمان بھائی ٹھیک کہتے تھے۔ بالکل مردے جیسے ہیں۔ نہ ہنسنا۔ نہ بولنا۔ اس طرح خیر مقدم کیا جاتا ہے؟ ہم کیا روز روز آتے ہیں؟

باجی نے آنکھیں دکھائی ہوں گی۔ مگر یہ جملے اس کی پشت میں خنجر کی طرح اترتے چلے گئے۔ ٹرنک بہت وزنی تھا۔ ان کی طاقت کو چنوتی دیتا ہوا۔ باہر سب کھڑے تھے اور وہ اکیلا جوجھ رہا تھا پسینے میں شرابور۔ ایک مسافر نے مدد نہ کی ہوتی تو وہ ٹرنک اتارنے میں کبھی کامیاب نہ ہوتا۔

قلی اب بھی گھیرے ہوئے کھڑے تھے، ایک چکنی آس میں۔ قلیو پر پیسہ لٹانا فضول تھا۔ چند سیڑھیاں چڑھ کر ایک پل ہی تو پار کرنا ہے اور اس طرف مین گیٹ! خواہ مخواہ ۲۰-۳۰ کا چونا لگ جائے گا۔ لیکن وزنی ٹرنک اور گٹھروں کو دیکھ کر مجبوراً ایک قلی کو پکا کرنے کی کوشش کی۔

''نا بابا نا۔'' وزنی ٹرنک دیکھ کر قلی گھبرا گیا۔ تب مجبوراً دو قلی کرنے پڑے۔ اب دونوں قلی ٹرنک اور گٹھروں سے جوجھنے لگے۔ اس نے ایک صندوق سر پر قلی کی طرح اٹھالیا۔ ایک ہاتھ میں چھوٹا گٹھر۔ باقی چھوٹے بڑے سامان مجبوراً بیٹوں اور دامادوں کو اٹھانا پڑا۔ وہ بے رحمی سے اپنے میزبان کو گھور رہے تھے... یہ مسکین صورت اور کنجوس سیرت آدمی ہماری کیا میزبانی کرے گا؟ بور ہو جائیں گے ہم تو!''

وہ ایک قدم سنبھل کر اٹھاتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ہر بار اسے لگتا کہ وہ گر جائے گا۔ دھکدھکی بڑھ رہی تھی اور اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اس قدر کہ سامنے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ اسے محسوس ہونے لگا جیسے اسے

کسی گیس چیمبر میں ڈال دیا گیا ہو۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اب وہ ہمیشہ یہ سیڑھیاں چڑھتا اور اترتا رہے گا اور بوجھ ڈھوتا رہے گا... رشتوں کا بوجھ!

وہ لوگ گلیوں کے پیچھے چل رہے تھے لیکن اس کے پاؤں سیڑھیوں کے اس طرف خالی گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے جو چند گھنٹوں بعد کھلے گی۔

صندوق کو ایک خالی ڈبے کے دروازے میں دھکیل کر وہ دروازے پر ہی پسر گیا۔ اس کے پاؤں پلیٹ فارم پر جھول رہے تھے۔ کچھ دیر بعد جب سانسوں سے سمجھوتا ہوا تو وہ اکڑو ہو کر بیٹھ گیا۔ جیسے کوئی قلی مسافر کا انتظار کرتا ہے... ایسے قلی کی طرح جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی جو ہر روز کتنے ہی بے نام مسافروں کو ان کی منزلوں کی طرف بڑھنے میں مدد کرتا ہے اور خود وہیں پڑا رہتا ہے۔ جیسے مائلیج دکھانے والا بے حرکت پتھر۔ گاڑیاں آئیں اور زناٹے سے گزر جائیں اور وہ پڑا رہے ہمیشہ دبا ہوا۔

لیکن اس وقت وہ بڑا ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ وداعی کے وقت کا ہلکا پن جو بہت دنوں کے انتظار کے بعد نصیب ہوا کرتا ہے۔

''ارے، تم یہاں بیٹھے ہو؟'' باجی بوکھلائی ہوئیں اس کے سر پر کھڑی تھیں۔ ''صندوق کہاں ہے؟''

اس نے انگلی سے اشارہ کیا اور جوش و خوشی کے ساتھ بولا۔ ''باقی سامان بھی لے آتے ہیں باجی چلو سب گن لیے ہیں نا! ابھی ٹھیک طرح رکھ دیں گے۔ اس دفعہ آپ بہت جلد لوٹ رہی ہیں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

یک لخت باجی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور بالکل جنت کی طرح وہ آبدیدہ ہو گئیں۔ ان کی پرنم آنکھوں میں اس کا سراپا متواتر چھوٹا ہوتا جا رہا تھا... اتنا چھوٹا کہ ۴۷ء کے پہلے کی طرح وہ اسے، اپنے ننھے بھائی کو گود میں اٹھا سکتی تھیں۔

''رمضان! چلو، گھر چلیں۔'' اسے لگا اماں نے چپکے سے اس کے کان میں سرگوشی کی ہے۔ بالکل مدھم آواز..... اماں کی۔ لیکن وہ باجی تھیں۔

''بھائی جان! ماموں پاگل ہیں کیا؟''

یہ نشتر نما جملہ باجی کے آخری صاحب زادے کا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی آرا مشین میں شہتیر کی جگہ اس کا جسم آ گیا ہو... سر... سر...

اس نے پھر بھی اٹھنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں وہ باجی کے ہاتھوں میں جھول گیا۔

طارق چھتاری

برف اور پانی

"**تمھارے چھرے** کے آگے تو اس پہاڑی پر جمی برف بھی میلی معلوم ہوتی ہے۔"

سیما، جسکی شرٹ کا پچھلا دامن بازوؤں کو ہوا میں بار بار لہرانے کے سبب جینس سے نکل کر جیکٹ کے باہر آ گیا تھا اور جسکی بے باک ادائیں جسم کو ہر لمحے تھرکتے رہنے کا عادی بنا چکی تھیں، آج جاوید کی بات سنکر کچھ اس طرح شرما گئی تھی جیسے چوٹی پر جمی برف کی اوپری تہہ سورج کی پہلی کرن کو دیکھتے ہی پانی پانی ہو جاتی۔

جاوید نے چنچل اور شوخ سیما کے دونوں بازو پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھایا اور تعجب یہ ہے کہ وہ بیٹھ بھی گئی۔ پھر اس نے سردی سے کپکپاتے ہاتھوں کو بغلوں میں چھپا لیا۔ آج سردی بہت تھی اور اس روز گری...!

"گری بہت ہے سیما۔ آؤ تھوڑی دیر اس مولسری کے نیچے بیٹھ لیں۔"

"کیوں؟ مجھے لائبریری جانا ہے، اسکے بعد فلاسفی کا پیریڈ ہے۔ تمہیں بیٹھنا ہے تو بیٹھو۔ سنیتا، مریم، عقیل اور پنکی کی طرح۔ بس بیٹھے رہو، جو ہونا ہے اپنے آپ ہو جائیگا... زمانے کا دستور ہے، وہ کیا ہے کہ..."

"ارے بھئی تم سے تو پوچھنا غضب ہو گیا۔ اب جاؤ گی بھی یا..."

"یا کیا...؟ اوں... یا کیا...؟"

اور وہ بیٹھ گئی... پھر سنیتا بھی آ گئی۔ مریم، عقیل اور پنکی بھی۔

"لیجئے آ گئی آپ کی منڈی... کیجئے باتیں..."

"یار سیما، تم پھر الجھ رہی ہو بیچارے جاوید سے۔"

"بے چارہ جاوید..."

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

"ہاں تو بے چارے جاوید صاحب آپ نے جیوے ڈیئن کا انگریزی ناول Snow on the Hill پڑھا ہے؟" اس سے پہلے کہ جاوید کچھ بولے، سیما خود ہی بول پڑی۔

"تم نے کہاں پڑھا ہوگا۔ اس میں جو صاحب ہیرو کے نام پر مرکزی کردار نباہ رہے ہیں، وہ بالکل تمہاری طرح ہیں۔ آؤ بیٹھو... بیٹھے رہو، بولو مت... بور... نہایت بور..."

"سیما میں نے وہ ناول پڑھا ہے۔ اس کے مرکزی کردار میں اور مجھ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ بے سمتی کا مسافر ہے۔ جب کہ میں اپنے ٹریڈیشن اور ویلیوز کا پابند..."

"ٹریڈیشن اور ویلیوز..."

سیما کے قہقہے کی گونج نے فضا کو دیر تک بوجھل بنائے رکھا۔

''کبھی اندھیری رات میں سورج کی روشنی سے آنکھیں چندھیائی ہیں آپ کی؟ بے چارے جاوید صاحب...''

''میں نے سورج کو آنکھوں میں قید کرلیا ہے سیما...''

جاوید کی نظریں سیما کے تمتماتے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''اور جناب رات کی سیاہی سے محروم ہوگئے ہیں...''

سیما نے زلفیں جھٹکیں تو آدھے سے زیادہ سیاہ اور گھنیری زلفوں میں چھپ گیا۔

''لیکن...''

''لیکن کیا...؟''

اور جب بات طول پکڑنے لگی تو ایک ایک کر کے سب اٹھ گئے۔ بس جاوید بہت دیر تک اس ناول کے مختلف پہلوؤں پر سیما سے بحث کرتا رہا، جب کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جیوے ڈیئن نام کا نہ کوئی رائٹر ہے اور نہ ہی Snow on the hill نام کا کوئی ناول۔

لیکن آج اسے یقین ہوگیا ہے کہ جیوے ڈیئن نام کا رائٹر بھی ہے اور... اور Snow on the hill نام کا ناول بھی اور یہ یقین اسے اس وقت ہوا تھا جب سیما شرما کر برف کی طرح پگھل گئی تھی۔

برف پگھلی، پانی کے جھرنے گرے جیسے شہنائیاں بج رہی ہوں۔ برف پھر جمی، اس بار برف کا رنگ زرد تھا، ابٹن کے رنگ کی طرح اور اس کے بعد برف پانی بن کر جاوید اور سیما کے دنوں، مہینوں اور برسوں کو نم کرتی رہی۔ آخرکار دونوں نے مل کر پہاڑی راستے کے ایک بڑے پتھر کو ڈھکیل ہی دیا۔ پتھروں کی رگڑ سے جو آواز ہوئی تو جاوید چیخ پڑا۔

''کیا ہوا سیما؟''

''کچھ نہیں... شاید کچن میں بلی نے سارا دودھ گرا دیا۔ ابھی دیکھتی ہوں...''

ایسے موقعوں پر وہ جھنجھلا جایا کرتا تھا مگر آج خاموش رہا۔

''ستیاناس ہو اس کالی بلی کا۔ آج تو...''

وہ بڑبڑا رہی تھی اور جاوید مسکرا رہا تھا۔

''چلو سیما، آج پہاڑی کی اس چوٹی پر چلتے ہیں جہاں تم پہلی بار شرمائی تھیں اور چوٹی پر جمی برف خود بخود پگھلنے لگی تھی۔''

''اور دودھ...؟''

دودھ جیسے پوری پہاڑی پر جم گیا ہو، برف کچھ اس طرح جمی تھی۔ برف جمی تھی، نرم نرم پانی کا چشمہ بہہ رہا تھا اور وہ دونوں میاں بیوی، جو برسوں سے ساتھ رہ رہے تھے، ایک دوسرے کی طرف بہت دیر تک

اس طرح دیکھتے رہے جیسے دو اجنبی ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

جاوید اجنبیت اور آشنائی کے احساس سے اس وقت واقف ہوا تھا جب اسی پہاڑی سے لوٹ کر وہ فیکلٹی لان میں سیما کے ساتھ کھڑا مولسری کے پیڑ کو دیکھ کر سوچ رہا تھا...

'کتنا اجنبی تھا کل تک یہ مولسری کا پیڑ، جب کہ ہم اکثر یہیں بیٹھا کرتے تھے۔ مگر آج پہاڑی سے لوٹنے کے بعد یہ کتنا آشنا ہوگیا ہے۔ اب یہاں سے آتے جاتے محسوس ہوتا ہے کہ درخت کی گھنی چھاؤں میں بیٹھی سیما کسی کا انتظار کر رہی ہے۔ کس کا؟ پتا نہیں... کہ اچانک اس کے پاس کوئی آبیٹھتا ہے۔ کوئی بھی... بس میرے دل میں سارنگی کی دل سوز آواز گھٹ کر رہ جاتی ہے... سیما تیرے پاس کھڑی ہے تو پھر پیڑ کے نیچے کون بیٹھا ہے؟ اور وہ جو اس کے پہلو میں ہے؟ نہیں...'

اس خیال کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش میں سر اتنی زور سے ہلا کہ سیما پوچھ بیٹھی۔

''کیا ہوا جاوید؟''

''کچھ نہیں۔ بس ذرا سی محبت اور ذرا سی نفرت کا معاملہ تھا۔ تم کیا سمجھو گی۔''

''دونوں میں فرق ہی کیا ہے۔''

اس نے بال جھٹکے اور آگے بڑھ گئی۔ جاوید کی نظریں سیما کے تھرکتے قدموں کے پیچھے دبے پاؤں چلتی رہیں۔ سیما نے اپنا پلو اتار کر کمر سے باندھ لیا۔ بس جاوید کا دل دھڑکا تو دھڑکتا ہی چلا گیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے سیما کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اگر راستے میں پنکی نہ مل جاتی تو آج قیامت ہی آجاتی۔

''جاوید دیوانوں کی طرح کہاں جا رہے ہو؟''

''ایں...!'' وہ چونکا... ''لائبریری...''

''ارے وہاں مت جاؤ۔ وہاں وہ جھکی لڑکی گئی ہے ابھی...''

'اب میں اسے کیا بتاتا، ہاں میں ہاں بھی نہ ملا سکا اور اس کے ساتھ ہولیا۔ یوں تو پنکی بھی بلا کی خوبصورت تھی، مگر سیما تو جیسے وہم اور یقین کی سرحد تھی، جو ہوتی تو ہے مگر محسوس نہیں ہوتی...'

''کیا سوچ رہے ہو جاوید؟''

پیچھے سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ خوبصورت لمحہ بکھر کر ریزہ ریزہ ہوگیا۔

''اف...''

اس نے مڑ کر دیکھا پہاڑ کی چوٹی پر برف جمی ہوئی تھی اور اس کی بیوی کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''جاوید شام ہو چکی ہے، گھر.....''

''اف سیما، تم آخر چاہتی کیا ہو؟ میں اپنے کھوئے ہوئے لمحوں کی تلاش میں یہاں آیا ہوں اور تم...''

سیما کو لگا کہ اس کا وجود کافور ہوتا جا رہا ہے۔

''کیا تم بھول گئی ہو کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں.....''

''مجھے تو ایک ایک پل یاد ہے مگر میں سمجھی تھی کہ شاید تم سب کچھ بھول چکے ہو...''

اس نے جیسے سیما کی بات سنی ہی نہیں اور دور ایک پتھر پر جا بیٹھا، اکیلا اور خاموش...

رات نے خاموشی کا دامن پھیلا دیا تھا۔ یونیورسٹی کے اسٹاف کوارٹروں کی کھڑکیوں میں روشنی چھپی بیٹھی تھی۔ سیما نے ہولے سے کھڑکی کا پٹ کھولا۔ جاوید لان میں کودا اور دبے پاؤں کھڑکی کے نیچے آ کھڑا ہوا۔

''جاوید ہم روز کلاس میں ملتے ہیں پھر.....''

اس نے سیما کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

''جس میں ایڈونچر نہ ہو وہ ملنا بھی کوئی ملنا ہوا۔''

''اف...'' اور سیما نے کھڑکی بند کر لی۔

جاوید نے کھڑکی پر یوں ہاتھ رکھا جیسے سیما کے دل کی دھڑکنیں گن رہا ہو۔

''کیا ہے؟''

''جا رہا ہوں...''

وہ مڑا... اور اس نے دیکھا کہ سیما پہاڑی کے ایک پتھر پر گردن جھکائے تھکی ہاری سی بیٹھی ہے۔ بال اس کے چہرے کو ڈھکے ہوئے ہیں۔ جتنا چہرہ نظر آ رہا ہے وہ جھلسا ہوا ہے۔ پھر اسے لگا کہ خوبصورت پنکی اس کے پاس کھڑی قہقہے لگا رہی ہے۔ پنکی کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔

''جاوید، اس سر پھری لڑکی میں آخر ایسی کیا بات ہے جو تم...''

سوال پورا ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑا تھا۔

''پنکی تم نے بلبل کو گاتے سنا ہے؟''

''ہاں...''

''تو پھر تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ گانے سے لمحے بھر پہلے اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔''

پنکی خاموش رہی۔

''بس اسی کیفیت کا نام ہے سیما۔''

اور پنکی نے جھنجھلا کر بال جھٹکے تو اس کا چہرہ گھنیری زلفوں کے گھونگھٹ میں چھپ گیا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ زلفوں میں چھپا چہرہ پنکی کا ہے یا سیما کا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

''اب آنکھیں کھولو...''

کالج کے لان میں سیما دونوں ہاتھ پیچھے باندھے اس کی طرف جھکی کھڑی تھی۔

''سیما کیا ہے بھئی...؟''

''ہے کیا... کچھ بھی نہیں... تمہیں جی بھر کے دیکھنے کو دل چاہا، اس لیے آنکھیں بند کر ڈالیں۔''

''بس تمہاری یہی ادائیں تو ہفتوں کی نیند اڑا دیتی ہیں۔''

''تمہاری ہفتوں کی نیند تو عقیل نے اڑائی تھی۔ وہ ایک روز میرے ساتھ سوئمنگ پول کیا چلا گیا کہ قیامت آ گئی۔''

''سیما تمہیں تو عقیل کے ذکر کا ایک بہانہ چاہیے۔''

''بہانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ میرا دوست ہے۔ اس سے کبھی بھی مل سکتی ہوں میں...''

''مل سکتی ہوں کیا مطلب؟ ملتی ہی ہو...''

''دیکھو تم خواہ مخواہ بات بڑھا رہے ہو...''

پھر جاوید نے سیما سے جو کہا وہ سنکر سکتے میں آ گئی۔ کچھ دیر خاموش رہی، پھر جاوید کی طرف دیکھا اور وہاں سے چلی گئی۔ نہ پشیمانی نہ غصہ نہ ناراضگی... نہ جاوید سے قطع تعلق کیا اور نہ ہی کوئی تعلق رکھا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اب وہ بالکل خاموش رہنے لگی تھی۔ کئی مہینے گزر گئے۔ کالج کا آخری سال تھا۔ امتحان ہو چکے تھے۔ فیئر ویل پارٹی ہو رہی تھی۔ جاوید سیما کے قریب آ کر اس طرح بیٹھا کہ اس کی کہنی سیما کے پیٹ سے جا لگی۔

'وہ بھڑک جائے گی اور بات کرنے کا بہانہ مل جائے گا...'

اس نے سوچا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

''ہیلو...''

''ہیلو...'' اور بات ختم۔

فنکشن کے بعد وہاں صرف سیما اور عقیل رہ گئے تھے۔ جاوید اندھیرے میں کھڑا تھا اور اسے اندازہ تھا کہ ان دونوں نے اسے دیکھ لیا ہے۔

'یہ جانتے ہوئے کہ میں انہیں دیکھ رہا ہوں اگر سیما، عقیل سے قربت کا اظہار کرتی ہے تو اس کا مطلب وہ مجھ سے قربت کا اظہار کر رہی ہے۔ مجھے جلا کر...'

اور ایسا ہی ہوا۔ سیما نے ہاتھ عقیل کے کندھے پر رکھا اور کنکھیوں سے دیکھا۔ دور کھڑے جاوید کی طرف۔ دیکھا کچھ اس انداز سے تھا کہ جاوید کو محسوس ہوا کہ جیسے ہاتھ عقیل کے نہیں اس کے اپنے کندھے پر رکھا گیا ہو۔ بس پھر کیا تھا جاوید کی ٹھنڈی سانسوں میں حرارت دوڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد عقیل نے اپنی راہ لی اور سیما اسٹاف کوارٹر والی سڑک پر مڑ گئی تو جاوید نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔

''جی کہیے...''

سیما کے سرد رویے نے جاوید کے پورے جسم میں شعلے بھر دیے۔ وہ مسمسا کر رہ گیا۔ سڑک پر نظر دوڑائی، وہاں کوئی پتھر نہ تھا، سر پھوڑے بھی تو کس سے؟ اس کا جی چاہا کہ سیما کا سینہ چیر کر پتھر نکالے اور اپنے سر پر دے مارے۔

''سیما آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

''اوں...'' سیما نے بے نیازی سے پوچھا۔

''اف سیما...''

اب وہ پاگلوں کی طرح کچکچا کر ہوا میں ہاتھ چلانے لگا اور اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگیں... دو چار ہاتھ سیما کے گال پر بھی پڑ گئے اور اس کلائی سے چوڑیاں ٹوٹ کر سڑک پر بکھر گئیں۔ وہ جھکا، اندھیرے میں ٹٹول کر چوڑیوں کے ٹکڑے سمیٹے، جیب سے کاغذ نکالا اور بڑے اطمینان سے چوڑیوں کے ٹکڑوں کو کاغذ کی پڑیا میں باندھ کر جیب میں رکھ لیا۔ سیمی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

آج سیما بھاری پتھر پر خاموش اور اداس بیٹھی تھی اور پنکی قہقہے لگا رہی تھی، کھلکھلا کر ہنس رہی تھی، چہرہ پھول کی مانند کھلا ہوا تھا۔ جاوید آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔ پنکی کے تھرکتے شانے اسے اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ وہ بڑھتا گیا اور اس نے کانپتے ہاتھوں سے پنکی کے شانوں کو پکڑا۔ اداس بیٹھی سیما کے شانے جاوید کے ہاتھوں میں تھے۔ وہ چونک پڑا۔ اس نے جلدی سے اپنے ہاتھ ہٹائے اور دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے دیکھا کہ خوبصورت پنکی برہنہ حالت میں مکھ پر کیس ڈالے سیما کے قدموں میں پڑی ہے۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے بڑھنا چاہتا ہے مگر اسے اپنے دونوں بازو بھاری ہوتے محسوس ہوئے۔

''پنکی...'' اس نے چیخنا چاہا مگر اس کے منہ سے آواز نکلی... ''سیما...''

''میں یہاں ہوں جاوید...''

سیما نے گھبرا کر کہا اور اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

''مجھے ڈسٹرب مت کرو۔ میں یہاں سیما کی یاد میں کچھ پل بتانے آیا ہوں...''

''جاوید تمہیں جس کی تلاش ہے، وہ تمہارے سامنے ہے...''

''نہیں... مجھے سیما کی تلاش ہے، تمہاری نہیں...''

''جاوید، میں وہی ہوں، تمہاری سیما...''

''وہ تو تمہارے قدموں میں برہنہ...''

''جاوید تم سے کہیں کوئی غلطی ہو رہی ہے...''

''کیسی غلطی؟''

''مجھ تک پہنچنے کا راستہ غلط چنا ہے تم نے۔ تم شاید کسی اور کے بدن میں تلاش کر رہے ہو مجھے...''

اب سیما، جاوید کے اتنا قریب آ کر کھڑی ہو گئی تھی، جیسے اس میں سما جانے کی کوشش کر رہی ہو۔

''مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ جو مجھ سے کھو گیا ہے، اسے پا کر ہی رہوں گا۔''

سیما نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

''شام ہو چکی ہے، گھر...''

''سیما...''

ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں جاوید نے اتنی طاقت سے دھکا دیا کہ سیما کا سر ایک بڑے پتھر سے جا

ٹکرایا اور اس کے ہاتھ کی چوڑیاں ایک چھناکے کے ساتھ ٹوٹ کر پتھریلی زمین پر بکھر گئیں۔

سامنے چشمے کا نرم پانی سخت اور نکیلے پتھروں پر دھیمی رفتار سے بہہ رہا تھا۔ وہ تیزی سے چشمے کی طرف بڑھا اور جوتے اُتار کر ٹخنوں ٹخنوں پانی میں اتر آیا۔ اب اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ برف کے ریزے آسمان سے گر کر اس کے سر پر جمنے لگے تھے۔ وہ آنکھیں بند کیے کھڑا رہا۔ قدموں میں پانی بہہ رہا تھا، سر پر برف جم چکی تھی، لیکن پورا بدن جل رہا تھا۔

اوپر برفیلے پہاڑ... نیچے سمندر کی لہریں... اور بیچ میں تپتے ریگستان...

پہاڑوں سے آگ کی لپٹیں اٹھنے لگیں اور سمندر کا پانی لال ہوگیا...

وہ پورا کا پورا جل رہا تھا اور اس کی روح سیما، اب پنکی کی لاش میں تبدیل ہوچکی تھی۔ اسے اپنے بہت قریب سے سیما کی آواز سنائی دی۔

''آنکھیں کھولو جاوید کہ آنکھیں بند کرلینا بزدلی ہے۔ حقیقت وہ نہیں جو آنکھیں بند کر کے نظر آتی ہے۔ حقیقت وہی ہے جو تمہارے سامنے کھڑی ہے۔ باہر کچھ نہیں بدلا ہے، تمہارے اندر بدلا ہے۔ مجھے محسوس کرو اور آنکھیں کھولو...''

''مگر پنکی...؟''

سیما قہقہہ مار کر ہنس پڑی...

''اچھا یہ بتاؤ، پنکی تمہیں پھر کبھی ملی؟''

''نہیں...''

''ملتی کیسے، وہ تھی ہی نہیں...''

جاوید کے سر پر برف پوری طرح جم چکی ہے، قدموں میں پانی بہہ رہا ہے مگر اس کا پورا بدن جل رہا ہے۔ اسے سیما کے قدموں کی چاپ دھیمی سنائی دی۔ آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں... سامنے ایک پگڈنڈی انجانی سمت کو جارہی تھی، اس پر سیما کہیں دکھائی نہ دی تو اس نے پلٹ کر دیکھا کہ پتھر پر خون کا ایک دھبہ ہے اور چوڑی کے ٹکڑے زمین پر بکھرے پڑے ہیں۔ وہ بڑھ کر ان چوڑی کے ٹکڑوں کو اٹھا لینا چاہتا تھا مگر ایک انجانی طاقت اس کے قدم باندھے ہوئے تھی۔ اچانک اسے کچھ یاد آیا اور وہ جیب سے پرس نکال کر کانپتے ہاتھوں سے ٹٹولنے لگا کہ ایک بوسیدہ کاغذ کی پڑیا ملی تو اس کے جسم کی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں اور سانسوں میں سکون کی سنسناتی لہریں دوڑ گئیں جیسے اس کی یادداشت واپس آگئی ہو۔ پڑیا کو جلدی سے کھول کر دیکھا۔ چوڑی کے ٹکڑے آپس میں سہمے سمٹے پڑے تھے۔ بڑی نرمی سے ان کو چھوا اور پھر چوڑی کے ان ٹکڑوں کو اپنی آنکھوں سے لگالیا۔

پھر اس کے بعد جو دیکھا تو سامنے پتھر پر بکھرے چوڑی کے ٹکڑے غائب تھے... شام ہوچکی تھی اور سیما دور اس راستے پر جارہی تھی جو ان کے اپنے گھر کی طرف جاتا ہے۔

محسن خان

نیند

مجھے خوب زور کی نیند آرہی ہے۔ میں سوجانا چاہتی ہوں۔ ایسی گہری نیند کہ جس کے بعد وجود کا احساس ہی نہ رہے۔ نیند آتی ہی کب ہے۔ رات گئے تک کام دھندوں کی مصروفیت اور بچوں کے شور و غل سے اعصاب شل ہوجاتے ہیں، پنڈلیاں پھڑکنے لگتی ہیں اور ایسی ہلکی، اچٹتی ہوئی نیند آتی ہے جیسے سفر کے دوران آجاتی ہے کہ ایک ذرا سی نامانوس آہٹ ہوئی یا کوئی موڑ آیا اور آنکھ کھل گئی۔ ایسے میں خواب بھی ایسے بے کیف اور بے چین کردینے والے آتے ہیں جن سے فرحت اور تازگی ملنے کے بجائے تکان کا احساس ہونے لگتا ہے۔ سر بھاری ہوجاتا ہے اور ذہن سارا دن پریشان رہتا ہے۔ جیسے کوئی قیمتی چیز کھوگئی ہو۔ شادی سے پہلے ایسی کیفیت کبھی نہیں رہی۔ ہاں کسی کی ڈانٹ پھٹکار یا کچھ مخصوص دنوں میں یہ حال ہوجاتا تھا کہ چادر سے منہ ڈھانپ کے پڑ جاتی گھنٹی رہتی اور اس کیفیت میں غافل ہوجاتی۔ مگر عام طور پر یہ ہوتا تھا کہ ادھر لیٹی نہیں کہ سوگئی پھر کوئی ہزار بار پکارے مجھے خبر کہاں اور خواب بھی اچھے اچھے آتے تھے۔ اماں میری عادت سے بہت چڑتی تھیں۔ کہتی تھیں کہ ایسی گھوڑے بیچ کے سوتی ہے کہ دنیا جہاں کا ہوش ہی نہیں رہتا ہے بالکل بچوں کی سی صفتیں ہیں۔ ان کی موہوم سی آواز جو اکثر خواب کا حصہ بن جاتی تھی، مجھے سنائی دیتی تھی۔

''ٹانگیں کہیں ہیں تو ہاتھ کہیں ہیں، جامے تک ہوش نہیں... یہ بھی خیال نہیں کہ گھر میں باپ اور جوان جوان بھائی بھی ہیں... پرائے گھر میں جائے گی تو روز ڈانٹی جائے گی۔'' پھر جیسے اپنے آپ سے کہتیں ''پہلے مجھے بھی ایسی ہی بے خبری کی نیند آیا کرتی تھی مگر اب جانے کہاں اڑ گئی آنکھیں نیند سے خالی ہوگئیں۔''

میری آنکھیں بھی نیند سے خالی ہوگئی ہیں۔ بے خودی کا سا وہ خمار جانے کہاں چلا گیا۔ پہروں نیند کا انتظار کرتی ہوں مگر نہیں آتی۔ ہاں، کبھی کبھار اک عجیب طرح کی، غنودگی سی طاری ہوجاتی ہے، جیسی اس وقت ہے۔ پپوٹے بوجھل ہوتے جاتے ہیں، آنکھوں کے ڈھیلے ٹپکے پڑ رہے ہیں اور دماغ اس طرح سنسنا رہا ہے جیسے ہانڈی میں ابال آرہا ہو۔ ایسی کیفیت میں نمک کی چائے پینے سے طبیعت سنبھل جاتی ہے اور ذرا دیر کے لیے نیند بھی بھاگ جاتی ہے۔ چائے پیلوں ورنہ آدھی رات تک جاگنا مشکل ہوجائے گا۔ سوچا تھا آج رات میں رفعت کی فراک سیوں گی۔ اس کے پاس گت کی کوئی فراک نہیں رہی۔ صبح اٹھ کے روئے گی کہ میرے لیے فراک کیوں نہیں سی۔ روز کوئی بہانہ کردیتی ہوں... باجی کو خط بھی لکھنا تھا۔ کتنے دن ہوگئے ہیں ان کا خط آئے ہوئے اور میں اب تک جواب نہیں دے سکی۔ سوچتی ہوں کہ اب کہکشاں کو مجھ سے محبت نہیں رہی۔ کیا کروں روزانہ سوچتی ہوں کہ آج لکھوں گی مگر نہیں لکھ پاتی۔

پہلے کیسا انتظار رہتا تھا باجی کے خطوں کا اور کیسے اہتمام سے جواب لکھا کرتی تھی۔ یہ بھی ایک طرح

کا مشغلہ تھا۔ اب لکھنے بیٹھتی ہوں تو سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔ بیچ بیچ میں کوئی کام یاد آجاتا ہے اور اٹھ کھڑی ہوتی ہوں۔ قلم کاغذ بھی ایسے ٹھکانے پر رکھ دیتی ہوں کہ ڈھونڈے نہیں ملتے۔ باجی بھی اب عادی ہوتی جارہی ہیں۔ پہلے ہر خط میں میری سرد مہری کی شکایت ضرورت کرتی تھیں مگر اب نہیں کرتیں اور ان کے خط بھی اس پابندی سے نہیں آتے۔

نیند کا جھونکا پھر آگیا۔ چائے بنالوں ورنہ سوگئی تو پھر آنکھ نہیں کھلے گی۔ خفا ہوں گے کہیں گے میرا انتظار نہیں کرسکتی تھیں، ایسے موقعوں پر میرا جلدی سوجانا انہیں اچھا نہیں لگتا۔ مجھے بھی بڑی الجھن ہوتی ہے۔ جاگنے کی بہت کوشش کرتی ہوں مگر نہ آنکھیں کھلتی ہیں نہ کچھ سمجھ میں آتا ہے۔ پچھلی مرتبہ ایسی ہی بے تحاشا نیند آگئی تھی اور کیسا ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ لگتا تھا کسی نے خوب زور سے دبوچ لیا ہو اور گلا گھونٹے دے رہا ہو۔ بری بری آوازیں نکلنے لگی تھیں اور اس دن انہوں نے کیسا غصہ کیا تھا مجھ پہ زور سے چیخے تھے۔ یہ کیا پڑی ہوئی ہو مردوں کی طرح... ہاتھوں میں دم ہے نہ پیروں میں جان۔ کبھی جو ساتھ دیتی ہو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی جرم کررہی ہو۔'' شروع میں میں ان کی باتوں کی پروا نہیں کرتی تھی مگر اب یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اگر میں نے اس طرح بے پروائی برتی تو ایک نہ ایک دن اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ ویسے بھی اب میں روز بہ روز بدشکل اور بدوضع ہوتی جارہی ہوں۔ مذاق مذاق میں کہہ بھی دیتے ہیں۔ اس دن لائٹ جلا کے مجھے دیکھا تھا اور کتنے ہنسے تھے مجھ پہ۔

اب یہ بدن میں نے اپنے ہاتھ سے تو بنایا نہیں، اللہ میاں جس کو جیسا چاہیں بنادیں۔ پہلے تو میرا بدن ایسا نہیں تھا۔ شکل کی بھی سب لوگ تعریف کرتے تھے۔ اب بھی بعض دنوں میں جب ذرا سکون ملتا ہے، اچھی لگنے لگتی ہوں۔

چائے میں نمک زیادہ پڑ گیا، چلو ٹھیک ہے، اب دیر تلک نیند نہیں آئے گی۔ مگر یہ نیند آتی خوب زور سے ہے، سو جاتی ہوں تو کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ خواب بھی سب یاد رہتے ہیں۔ بیچ بیچ سے ٹوٹتے نہیں۔ ایسی نیند کے بعد صبح جلدی اٹھنا مشکل ہوجاتا ہے۔ جی چاہتا ہے بس سوتی ہی رہوں اور اچھے اچھے خواب دیکھتی رہوں۔

آج ہوا نہیں چل رہی ہے، جب ہوا نہیں چلتی تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے سب چیزیں کسی خیال میں کھوگئی ہوں یا گہری نیند سوگئی ہوں۔ ایسے میں بڑا ہول آتا ہے۔ رات بھی تو زیادہ ہوگئی ہے۔ سب کے گھروں میں روشنیاں بجھ چکی ہیں۔ جب زمین پہ روشنی ہوتی ہے تو آسمان دکھائی نہیں دیتا۔ اندھیرا ہوتا ہے تو دکھائی دیتا ہے۔ اب اس وقت نیچے روشنی نہیں ہے تو آسمان دکھائی دے رہا ہے۔ ستارے کیسے چمک رہے ہیں۔ کس قدر ستارے ہیں آسمان میں۔ گننے بیٹھوں تو عمر گزر جائے اور گنائے نہ گنیں۔ یہ ستارے جو یہاں سے اتنے چھوٹے چھوٹے سے دکھائی دیتے ہیں، سنا ہے اتنے بڑے بڑے ہوتے ہیں کہ ان پر دنیائیں آباد ہوسکتی ہیں... یہاں تک سنا ہے کہ بعض ستارے تو ایسے بھی ہیں کہ جن پر ہماری ہی جیسی مخلوق آباد ہے۔ پتہ نہیں سچ ہے کہ جھوٹ یہاں سے تو وہی ستارے نظر آتے ہیں جنہیں بچپن سے دیکھتی آرہی ہوں۔ آج جانے کتنے دنوں کے بعد آسمان کی طرف دیکھ رہی ہوں۔ پہلے جب اپنے گھر کے آنگن میں لیٹ کے آسمان کی

طرف دیکھتی تھی تو کتنا اچھا لگتا تھا۔ دور دور تک پھیلے ہوئے ستارے، گھٹتا بڑھتا ہوا چاند، جو کبھی مشرق کی طرف سے اٹھتا تھا کبھی مغرب کی طرف سے اور ستاروں کے بیچ میں وہ آڑی ترچھی، سفید کا مدار دوپٹے کی سی کہکشاں۔ اب تو مہینوں یہی خیال نہیں آتا کہ آسمان بھی ہے، اس میں ستارے ہیں اور چاند بھی ہے۔

پتہ نہیں کہاں چلے گئے۔ کہہ کے گئے تھے سونا مت جلدی آجاؤں گا۔ انہیں بھی کیسے کیسے تماشے سوجھتے ہیں۔ موسم بدلنے کا اثر ہوتا ہے یا کیا کہ بعض دنوں میں بالکل بدل جاتے ہیں۔ ذرا ذرا سی باتوں پر توجہ دینے لگتے ہیں۔ خوب باتیں کرتے ہیں اور جی کھول کر ہنستے ہیں۔ بچوں کی سی کیفیت ہو جاتی ہے اور بعض دنوں میں چپ سادھ لیتے ہیں۔ کسی بات کا جواب دینا بھی گوارا نہیں کرتے۔ مجھے تو ان کی یہ عادت اچھی لگتی ہے نہ وہ عادت، جی چاہتا ہے کہ بس انسانوں کی طرح رہیں ابا کی بھی ایسی عادتیں تھیں۔ عام طور پر خاموشی اختیار کیے رہتے تھے، خوب غصہ کرتے تھے اور کبھی کبھی خوب خوش نظر آتے تھے۔ ہر بات کا جواب رسانیت سے دیتے۔ میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ بعض دنوں میں ابا کو کیا ہو جاتا ہے کہ ابا ابا ہی نہیں لگتے۔ اماں صحیح کہتی تھیں مردوں کا مزاج کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ گجرا بھی الجھ گیا۔ نیند کا جھونکا جو آ گیا تھا۔ پتہ نہیں میک اپ ٹھیک سے ہوا بھی یا نہیں، قریب سے آئینہ دیکھ لوں ورنہ ذرا بھی کسر رہ گئی تو یہی کہیں گے کہ تم کو کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ بے دلی کے ساتھ بیٹھی انتظار کر رہی ہو۔ صبح سے شام تک جھاڑتی پونچھتی رہتی ہوں مگر یہ گرد تو پیچھا ہی نہیں چھوڑتی۔ روز آئینہ صاف کرتی ہوں اگر گرد آ کے پھر بیٹھ جاتی ہے۔ میک اپ تو ٹھیک ہی ہے۔ ٹھیک کیا ہے بس ہے انکا دل رکھنے کو۔ آنکھیں کیسی حلقوں میں گھسی جا رہی ہیں جیسے برسوں کی بیماری کے بعد بستر سے اٹھی ہوں ابھی۔ بڈی عورتوں پر کچھ اچھا نہیں لگتا۔ نہ بدن پر کپڑے نہ چہرے پر میک اپ۔

نمک کی چائے پیتے ہی آنکھیں جیسے کھل سی گئیں۔ اب کچھ دیر تک جاگ سکوں گی۔ سہاگ رات کا جوڑا پہن لوں ورنہ آ گئے تو کہیں گے ابھی تلک وہی جیکٹ کپڑے پہنے بیٹھی ہو۔ نہائی بھی نہیں۔ اب کون نہاتا رات کے وقت۔ بال گیلے کرلوں گی کہہ دوں گی نہائی تھی۔ پاوڈر تو لگا ہی لیا ہے۔ سہاگ رات کا یہ جوڑا اب کتنا بھاری لگنے لگا ہے پتہ نہیں۔ چوتھی چالوں تک کیسے سنبھالا تھا اسے میں نے۔ جی چاہتا ہے کسی دن اس کو چپکے سے ادھیڑ کے رفعت کا سوٹ بنا دوں۔ مگر ڈر لگتا ہے خفا ہوں گے۔ کہیں گے تم نے مجھے جلانے کے لیے کیا ہے۔ یہ سب کچھ۔ پتہ نہیں ابھی اور کتنے دنوں تک۔

سہاگ رات کے اس جوڑے میں بج بج کے ان کا انتظار کرنا پڑے گا۔ موسم بدل رہا ہے۔ رات میں خنکی ہو جاتی ہے۔ مگر دن میں کیسی کڑا کے کی دھوپ نکلی ہے۔ پھول جلدی مرجھا جاتے ہیں۔ آج پیڑوں میں پانی بھی نہیں ڈالا۔ روزانہ پانی ملتا رہے تو یہ کتنی جلدی بڑھتے ہیں اور کیسے تر و تازہ رہتے ہیں۔ سنا ہے رات کے وقت پیڑوں میں پانی ڈالنا اچھا نہیں ہوتا۔ صبح ڈالوں گی۔ رات کے وقت پیڑ پودوں کے پاس جانا بھی نہیں چاہیے۔ سائے کا اثر ہو جاتا ہے۔ سانپ بچھوؤں کا بھی ڈر ہوتا ہے۔ اف اس موذی کا خیال آتے ہی جھرجھری آجاتی ہے اور بدن میں سرسراہٹ کا سا احساس ہونے لگتا ہے۔ ابھی تک اسی طرح یاد ہے، جیسے کل کی بات ہو۔ ایک بار آنگن میں لیٹی ہوئی بے خبر سو رہی تھی۔ پتہ نہیں کیا بجا تھا۔ بہت رات ہو گئی تھی۔ کسی چیز کا لجلجا اور ٹھنڈا ٹھنڈا سا لمس محسوس ہوا جیسے کوئی چیز سرسراتی ہوئی پیروں کے اوپر سے پیٹ کی

طرف جارہی ہو۔ جلدی سے، گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔ دوڑ کے چراغ لائی اور اس کی لو اونچی کر کے دیکھا تو دل کی دھڑکن بند سی ہوگئی اور سارا بدن ٹھنڈا پڑ گیا۔ بے جان سی ہو کر اماں کے پلنگ پر ڈھ گئی پھر مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا۔ بہت دیر کے بعد ہوش و حواس درست ہوئے تو دیکھا کہ سب لوگ میرے اوپر چراغ کی روشنی کیے میرے بدن میں سانپ کے کاٹے کا نشان ڈھونڈھ رہے ہیں۔ ایک دن پہلے برتن دھوتے وقت پتیلی کی دھار سے انگلی کٹ گئی تھی۔ اماں کے ڈر سے چھپائے رہی تھی کہ ڈانٹیں گی۔ کس پھوہڑپن سے کام کرتی ہو کہ روزانہ کوئی نہ کوئی زخم ہو جاتا ہے۔ زخم کا نشان نمایاں تھا۔ اماں اسی انگلی کو پکڑے بیٹھی تھیں۔ کلائی پر ایک ڈوری اتنی سختی سے باندھ دی گئی تھی کہ اگر زیادہ دیر تک بندھی رہتی تو... خون کا دوران بالکل ہی بند ہو جاتا اور انگلیاں بے حس ہو جاتیں۔ کچھ دیر تک تو مجھے بھی وہم رہا کہ یہ سانپ کے کاٹے کا نشان ہے۔ مگر کچھ دیر کے بعد جب ہوش و حواس بالکل درست ہو گئے اور آواز قابو میں آئی تو میں نے ٹھہر ٹھہر کے، بیماروں کے سے لہجے میں واقعہ بیان کیا۔ پھر یہ واقعہ جو ایک حادثہ بنتے بنتے رہ گیا تھا، اک دلچسپ لطیفہ سا بن کے رہ گیا اور اس میں کلیاں پھندنے لگتے چلے گئے۔ ابا کی غیر موجودگی میں یہ واقعہ ڈرامائی انداز میں بیان کیا جاتا۔ رفعت باجی نڈھال سی ہو کر پلنگ پر گر جاتیں اور اسی انداز اور اسی کیفیت کے ساتھ بیان کرتیں جیسے میں نے بیان کیا تھا۔ میں چڑتی تھی۔ پیر پٹختی تھی اب خیال آتا ہے تو سب کچھ اچھا لگتا ہے... اگر سانپ کاٹ لیتا اور میں مر گئی ہوتی تو... یہ واقعہ بیان کر کر کے سب لوگ رویا کرتے... بھائی جان نے سانپ کو مار ڈالا تھا۔ گھور پر پڑا ہوا مردہ سانپ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ خوب چوڑے پھن والا، پتلا پتلا سا۔ اس کے اوپر بنے ہوئے سیاہی مائل پھولوں کے سے پٹے دھوپ میں کیسے چمک رہے تھے۔ دو تین دن کے بعد جب ہوا چلی تو کیسا تعفن گھر میں بھر گیا تھا۔ پھر بھائی جان اسے اٹھا کے کہیں دور پھینک آئے تھے۔ اس کے بعد جب بھی سانپ کا خیال آتا تو تعفن کا احساس ضرور ہوتا، اب بھی ہوتا ہے۔ حالانکہ مرا ہوا سانپ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مگر مہینوں یہی احساس رہا کہ سانپ مرا نہیں ہے۔ یہ بھی وہم رہا کہ سانپ اپنی پتلیوں پہ بھائی جان کا عکس چھوڑ گیا ہوگا اور ایک نہ ایک دن اس کی مادہ انتقام ضرور لے گی۔ کتنے دنوں تک پاؤں پھیلا کے سو نہیں سکی۔ سانپ مر گیا تھا مگر اپنا ٹھنڈا ٹھنڈا سا رونگٹے کھڑے کر دینے والا لمس میرے بدن پر اور دھوپ میں چمکتے ہوئے سیاہی مائل پھول میری آنکھوں میں چھوڑ گیا تھا۔ پتہ نہیں کہاں سے اس موذی کا خیال آ گیا۔ جہاں پیڑ پودے ہوتے ہیں اور زمین میں نمی ہوتی ہے۔ یہ موذی آ جاتا ہے۔ یہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔ جس دن ہ دیر میں لوٹتے ہیں کیسا ہول آتا ہے۔ گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے اب تو خیر اتنا احساس نہیں ہوتا۔ شادی کے بعد شروع شروع میں بڑا ڈر لگتا تھا جہاں گلیوں میں سناٹا ہوا اور گھروں کی روشنیاں بجھیں نہیں کہ دل بیٹھنے لگتا تھا۔ اپنے آپ کو کام میں مصروف رکھنے کی کوشش کرتی تھی مگر کہیں اک ذرا آہٹ ہوئی اور لگتا تھا کہ اب کوئی دیوار پر سے پھاندا کہ جب پھاندا۔ کمرے میں ہوتی تھی تو برآمدے سے ڈر لگتا تھا اور برآمدے میں ہوتی تھی تو کمرے میں جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔

گل دان پر بھی روزانہ گرد جم جاتی ہے۔ پھول بھی کملا گئے۔ صبح تازے پھول لگا دوں گی کسی دن بازار سے نقلی پھول لا کے سجا دوں گی۔ روزانہ پھول سجانا بھی ایک مسئلہ ہے۔ ویسے بھی اب ان پھولوں میں

خوشبو کہاں ہوتی ہے۔ کل ان ڈائننگ ٹیبل کو دوسری طرف کردوں گی۔ ٹی وی بھی کہیں اور رکھ دوں گی۔ چیزیں ایک جگہ پر زیادہ دنوں تک اچھی نہیں لگتیں، کشش ختم ہوجاتی ہے۔ ہوائی جہاز جارہا ہے۔ یہ روزانہ، اسی وقت یہاں سے گزرتا ہے۔ کیسی عادی سی ہوگئی ہوں اس کی آواز کی۔ اگر کسی دن نہ گزرے تو ضرور کچھ کمی کا احساس ہوگا... نیند آرہی ہو اور سونے کو نہ ملے تو کیسا عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ ذہن ماؤف سا ہوجاتا ہے اور پپوٹے آپ ہی آپ ایک دوسرے میں چپکنے لگتے ہیں۔ چلو شادی والا البم ہی دیکھتے ہیں۔ کتنے دنوں سے نہیں دیکھا۔ اکثر سوچتی ہوں کہ کسی دن ایک نیا البم لاکے اس میں فوٹو لگا دوں گی مگر سوچتی ہی رہ جاتی ہوں۔ ہو بھی تو گیا ہے کتنا پرانا۔ شادی کے وقت کا ہے۔ ہوں... یہ ہے میری شادی کے وقت کی تصویر... شادی کے وقت میں کیسی اچھی لگتی تھی... کھلایا بھی تو تھا امی نے خوب میوہ کہ سسرال جائے تو تندرست ہوکے جائے نہ معلوم وہاں کتنا کام کرنا پڑے اور اچھا کھانے پینے کو ملے کہ نہ ملے۔ جنہوں نے مجھے پہلے دیکھا تھا۔ اب دیکھتی ہیں تو حیرت کرتی ہیں کہ یہ کہکشاں ہے، کیا ہوگیا ہے اس کو۔ آئینہ دیکھتی ہوں تو اپنے آپ کو پہچانا نہیں جاتا... اس وقت ابا کیسے ٹاٹھے تھے۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ اتنی جلدی مرجائیں گے۔ کتنے جھمیلے چھوڑ گئے ہیں ابا اپنے پیچھے۔ جانے کیا سوجھی تھی کہ دوسری شادی کر بیٹھے۔ سب لوگ کہتے ہیں کہ محلے والوں نے ان کا خوب مذاق اڑایا تھا... ٹھیک تو ہنستے تھے لوگ۔ بھلا اس عمر میں شادی کی کیا ضرورت تھی اور وہ بھی ایک جوان لڑکی سے۔ پھر ہم لوگوں کی پیدائش پر ان کا اور مذاق اڑایا گیا۔ شادی تو کی ہی تھی۔ آدھا درجن بچے اور پیدا کردیئے۔ ابا کے تیرہ اولادیں ہوئیں۔ آٹھ میری پہلی والی اماں سے اور پانچ میری سگی امی سے۔ دو بچے ضائع ہوگئے وہ الگ۔ اسی میں تو امی کی صحت خراب ہوگئی تھی۔ توبہ توبہ۔ ابا نے تو کچھ سوچا سمجھا ہی نہیں۔ اگر ابا دوسری شادی نہ کرلیتے تو گھر جہنم نہ بنتا۔ ابا کے مرنے کے بعد امی بھی بجھ سی گئی تھیں۔ سہاگ اجڑنے کے بعد بھلا کون عورت خوش رہ سکتی ہے۔ چہ چہ چہ... بے چاری زہرا باجی... ان کی تصویروں میں کیسی معصومیت اور بے کسی جھلکتی ہے۔ آدمی لاکھ مسکرائے، ہنسنے کی کوشش کرے مگر چہرے کی بناوٹ اور آنکھوں کا رنگ سب کچھ بتا دیتا ہے۔ اگر ابا دوسری شادی نہ کرلیتے تو زہرہ باجی اتنی جلدی نہ مرتیں۔ ایک تو اپنی اماں کی موت کا دکھ، اوپر سے میری امی کی زیادتیاں۔ کتنے دکھ جھیلے تھے بے چاری نے۔ اللہ میاں کے گھر ان کو اس کا اجر ضرور ملے گا۔

ان تصویروں کو دیکھتی ہوں تو ایک ایک منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ سب باتیں یاد آنے لگتی ہیں۔ جی چاہتا ہے پھر وہی دن لوٹ آئیں جی گھبرا گیا، جماہیاں لیتے منہ دکھنے لگا۔ بچے دن بھر شور مچاتے ہیں اور رات میں کیسی بے خبری کے ساتھ سوتے ہیں۔ لو اس کمبخت ماری نے ابھی سے پیشاب کردیا۔ اب صبح الادی دھونا پڑے گی۔ شاید دروازے پر دستک ہوئی ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ جب انتظار کرتی ہوں تو ذرا ذرا دیر کے بعد یہی احساس ہوتا ہے... ایک بجنے کو ہے۔ یہ گھڑی کی سوئی بھی خوب ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جب اس پر نظر پڑتی ہے تو یہ چلنا شروع کردیتی ہے۔ اب غور کررہی ہوں تو اس کی آواز بھی سنائی دے رہی ہے۔ روشنی آنکھوں میں لگ رہی ہے۔ بجھا دوں گی تو نیند آجائے گی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ چلو پیڑوں میں پانی ڈالتے ہیں رات ہے تو کیا ہوا۔ آخر جاگتے رہنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔

نالی میں اُگے پودے

سردیوں کے دن تھے۔ لان پر اگی ہوئی لش گرین گھاس پر کرسیاں رکھی ہوئی تھیں، جن پر کالج کے اساتذہ بیٹھے اپنا کلاس رجسٹر مکمل کر رہے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی انٹرول کے بعد طالب علموں کی چھٹی ہوئی تھی۔ وہ لان سے ذرا پرے ہٹ کر ایک کاریڈور میں رکھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے بھی اس کا کلاس رجسٹر کھلا ہوا رکھا تھا لیکن آنکھیں کہیں آسمان میں بھٹک رہی تھیں۔ اس کے ساتھی اساتذہ نے اسے بھی لان پر بلانے کی کوشش کی تھی اور پھر اس کے انکار پر ذکیہ بولی تھی—

''دھوپ میں بیٹھ کر کالے ہو جانے کا خوف ستا رہا ہے کیا؟'' اس نے ذکیہ کی بات کا جواب صرف ایک مسکراہٹ سے دے کر اپنی توجہ اس کی طرف سے ہٹا لی تھی۔ اس کی آنکھیں اب بھی آسمان میں بھٹک رہی تھیں۔ پھر اس کی آنکھوں نے ۲۸ برس پرانی اس تصویر کو ڈھونڈ ہی نکالا کہ جب وہ اس کالج میں اپنی ملازمت شروع کرنے کے بعد اس کاریڈور میں پہلی بار بیٹھا تھا۔

اس کے لیے یہ دنیا نئی تھی لوگ نئے تھے اور ان کی سوچ سمجھ اس کے لیے نئی تھی اور یہ سب کچھ اس کی اپنی دنیا سے قطعی مختلف تھا۔ بڑی مشکلوں سے اس نے اپنے آپ کو کالج کے ماحول میں ایڈجسٹ کیا تھا۔ اس نے دوہری زندگی گذارنی شروع کر دی تھی۔ ایک زندگی کیمپس کی دوسری کیمپس کے باہر کی۔

کتنا تضاد تھا دونوں زندگیوں میں

کیمپس کے باہر کی زندگی کتنی وسیع تھی۔ دانشوروں کے درمیان اٹھنا بیٹھنا، علمی ادبی بحثیں، سیاست پر گفتگو، اسپورٹس پر باتیں اور سماجی کاموں میں دلچسپی، کیا کچھ نہیں تھا اس زندگی میں۔ اس کے برعکس کیمپس کی زندگی کتنی محدود۔ جہاں وسیع القلبی سے دور کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ ایک ہی جیسی باتوں کا سلسلہ۔

''سنو یار اس بار تمہیں کتنے ٹیوشن ملے؟''

''کچھ زیادہ نہیں مل سکے۔''

''کیوں؟''

''پتہ نہیں کیوں۔ لڑکے شاید دوسرے ٹیچروں کے پاس چلے گئے۔''

''تم نے بیوقوفی کی۔ لڑکوں کو اتنا پریشان کرتے کہ وہ خود بھاگ کر تمہارے پاس ٹیوشن پڑھنے چلے آتے۔ میں تو یہی کرتا ہوں۔''

''چھوڑو یار۔ یہ بتاؤ کہ مہنگائی بھتہ والا، جی۔ او۔ آیا یا نہیں۔''

ابھی تو نہیں آیا۔ ارے جی۔ او۔ کو کون کہے ان سالے مینیجنگ کمیٹی والوں نے ابھی تک اس سال کا

انکریمنٹ بھی نہیں لگایا۔"

مہنگائی بھتہ، ٹیوشن، انکریمنٹ اور ایسی ہی دوسری بہت سی باتیں بس کالج کیمپس کی یہی دنیا تھی۔ اسے حیرت ہوتی کہ آخر کالج کے اساتذہ آپس میں کبھی علمی ادبی گفتگو کیوں نہیں کرتے۔ کیا کتابوں کو انہوں نے اپنی زندگی سے باہر نکال دیا ہے، اسے اپنے ساتھیوں کے ان رویوں پر افسوس ہوتا لیکن وہ خاموش رہتا۔ وہ جانتا تھا کہ جو اساتذہ بورڈوں کے امتحانات میں نقل کرانے کا ٹھیکہ لیتے ہوں اور ہوم اگزام (Home Exam) میں ان طالب علموں کو پرچہ آؤٹ کرا دیتے ہوں کہ جو ان سے ٹیوشن پڑھتے ہیں، وہ اس کی بات کیسے مان سکتے تھے۔ وہ انہیں سمجھا نہیں سکتا تھا۔ بس سب کچھ دیکھتا اور کڑھ کر رہ جاتا۔

چائے پئیں گے؟" ذکیہ اس کے پاس آتی ہوئی بولی، تو وہ خیالوں کے لکڑ جال سے باہر آ گیا۔

"ہاں ہاں کیوں نہ پیوں گا۔" وہ اسے دیکھتا ہوا بولا۔

"یہ چائے کانٹر ٹیوشن سے آ رہی ہے۔"

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ روپے نکال کر دے دیئے۔

"اور میرے حصے کے پیسے؟ وہ بھی آپ کو دینے ہیں۔ وہ مسکراتی ہوئی بولی

"یہ پانچ روپے میری اور تمہاری چائے کے لیے کافی ہیں۔"

ذکیہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔

اس نے سوچا کہ یہ جو چھ سات خواتین اساتذہ پڑھانے کے لیے آ گئے ہیں ان کی وجہ سے کالج کے ماحول میں خاصی تبدیلی آ گئی ہے۔ کچھ لوگ جو ہفتوں اپنی ڈاڑھیاں نہیں بناتے تھے، اب روز ہی بنانے لگے ہیں۔ کچھ دوسرے لوگ جنہیں میلے کچیلے اور شکن آلود کپڑے پہن کر کالج آنے میں کوئی عار نہ تھا، اب قدرے بہتر اور اچھے کپڑے میں دکھائی پڑنے لگے تھے۔ اتنا ہی نہیں کئی لوگوں نے تو اسپرے سینٹ کا استعمال بھی کرنا شروع کر دیا تھا اور سب سے بڑی بات تو یہ ہوئی تھی کے کالج کے چند اساتذہ جو ڈھکے چھپے طریقوں سے خوبصورت لڑکوں میں دلچسپی رکھتے تھے اور اپنے غیر فطری مذاق کے لیے جانے جاتے تھے، نے بھی اپنے چولے بدل لئے تھے۔ کیسی چپراسی کو چائے لانے کے لیے کہہ کر ذکیہ اپنی جگہ واپس آ چکی تھی۔ لان پر بیٹھے اساتذہ اب بھی اپنے اپنے رجسٹر مکمل کرنے میں منہمک تھے۔ اس نے دیکھا کہ ذکیہ دوبارہ اپنے کاموں میں لگ گئی ہے۔ اس کی نظریں ذکیہ پر ٹھہر گئیں۔

وہ ذکیہ کو ایک لمبے عرصے سے جانتا تھا۔ ان دنوں سے کہ جب وہ اس کالج میں ملازم نہیں ہوئی تھی۔ شہر میں کتنا چرچا تھا اس کا ان دنوں۔ شاید اس نے بھی طے کر رکھا تھا کہ وہ بدنامی کی تمام منزلیں طے کر کے ہی رہے گی۔ رات برات بڑے بڑے ہوٹلوں سے تنہا نکلنا، نامناسب لوگوں سے یاری اور فیشن کی انتہا ختم کر دینا ہی شاید اس کی زندگی کا مقصد بن کر رہ گیا تھا۔

اچانک ذکیہ نے ایک لمبی چھلانگ لگائی تھی۔

اس کالج میں اسے ملازمت مل گئی تھی اور جب اس نے ذکیہ کو ملازمت ملنے کے بعد پہلی بار کالج

کیمپس میں دیکھا تھا تو اسے بے انتہا حیرت ہوئی تھی اور اس نے کالج کے اساتذہ کے لیے دعاء خیر کی تھی۔ لیکن کچھ دنوں بعد ہی اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ ذکیہ اب وہ ذکیہ نہیں رہی کہ جس کے چرچے شہر میں عام تھے۔ یہ ذکیہ تو خاصی سنجیدہ ہوگئی تھی۔ ہر وقت ساتھی اساتذہ کو خدا کا خوف دلاتی اور اچھے کاموں کی تلقین کرتی۔ وہ خود بھی کئی ضرورت مند طالب علموں کو اپنے گھر پر مفت پڑھاتی۔

کتنی بدل گئی تھی وہ۔ اس نے اپنی نگاہیں ذکیہ پر سے ہٹالیں اور اپنے سامنے پھیلے ہوئے رجسٹر کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اسے لگا جیسے کوئی بلی کی سی چال چل کر آیا ہو اور اس کی پشت پر ٹھہر گیا ہو۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے اپنے پیچھے رضوانہ کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ رضوانہ کے چہرے پر وہی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی جو ہمیشہ اس کی تھکان کو دور کردیتی تھی۔

''آؤ۔ آؤ بیٹھو۔'' وہ بھی مسکراتا ہوا بولا۔

رضوانہ تھوڑی دور پر رکھی ہوئی ایک کرسی کھینچ لائی اور اس کے قریب بیٹھ گئی۔

اس نے بھرپور نظروں سے رضوانہ کا جائزہ لیا۔

خاصی ڈارک Dark تھی وہ۔ لیکن چہرے کے بے حد تیکھے نقوش، چشمے کے پیچھے قندیلوں کی طرح روشن آنکھیں اور موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے دانتوں کی قطار اس کے رنگ کو پس پشت ڈال دیتے اور وہ ڈارک ہونے کے باوجود بڑی پرکشش دکھائی دیتی۔ اپنی اسی کشش کی وجہ سے وہ ایک دن اس کی آنکھوں سے ہوتے ہوئے، اس کے دل کے نہاخانوں میں بڑی خاموشی سے اتر گئی تھی۔ پھر وہ بھی رضوانہ کے وجود میں سرایت کرگیا تھا۔ اندرون جان میں چھپ کر بیٹھنے والے لوگوں میں کبھی کوئی مکالمہ نہیں ہوا۔ صرف رویہ بولتے رہے اور ان کے وجود قربت کی مدھم مدھم آنچ میں سلگتے رہے۔

''آپ کا رجسٹر ابھی مکمل نہیں ہوا کیا؟'' رضوانہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی تو نہیں۔ نہ جانے کیوں آج رجسٹر بنانے میں دل نہیں لگ رہا ہے۔''

''لائیے میں آپ کی مدد کردوں۔''

''رہنے دو۔ بن جائے گا۔ مدد کی ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ کو میری مدد کی کوئی خاص ——————

''پلیز میری بات کا غلط مطلب مت نکالو۔ میں نے یہ بات یونہی روا روی میں کہہ دی ہے۔ چلو اچھی اچھی باتیں کرو۔''

پھر اسی وقت چائے آگئی۔

چائے کے سپ لیتے ہوئے اس رضوانہ کی طرف دیکھا ——

''وہ تمہاری دوست درخشاں کہاں ہے؟''

''تھوڑی دیر پہلے تو وہ ندیم صاحب کے ساتھ فزکس لیب میں تھی۔

"Oh my god. What a daring waman sheis!"

"کیوں؟" اس میں ڈیرنگ (Daring) کی کیا بات ہے۔"

"ارے! اتنی طنزیہ مسکراہٹوں کا سامنا کرنے کے بعد بھی وہ ندیم کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے میں ذرا ہچک محسوس نہیں کرتی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ لیکن ایسا بھی کیا ہمتی ہونا کہ دامن دھبوں سے بھر جائے۔"

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ شاید وہ دونوں ہی ندیم اور درخشاں کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ ندیم اور درخشاں دونوں ہی کئی کئی بچوں کے ماں باپ تھے۔ لیکن ایک اپنے شوہر سے پریشان، دوسرا اپنی بیوی سے عاجز۔ پھر یہ تو ہونا ہی تھا لیکن اس رومانس سے کالج کی فضا گرد آلودہ ہونے لگی تھی۔ اسٹاف روم میں ہر وقت انہیں باتوں کا چرچا رہتا اور جب یہ چرچا کبھی غلاظتوں کے درمیان سے ہو کر گذرنے لگتا تو اسے بڑا جھٹکا لگتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ جیسے کالج کیمپس کی زندگی اس کے لیے دن بدن گھٹن بھری ہوتی جا رہی ہے اور کالج کا ماحول بھی بے حد مار بڈ (Marbid) ہوتا جا رہا ہے۔

ایسا نہیں تھا کے کالج کیمپس کی زندگی سے باہر کی زندگی صرف اچھی ہی رہی ہو۔ وہاں بھی خاصے داؤں پیچ تھے۔ زیادہ تر دانشوروں کی زندگی میں منافقت در آئی تھی۔ یار لوگ لنگی لگا کر ساتھیوں کو گرانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تا کہ مذاق اڑانے کا موقع مل سکے۔ اس کام میں غیبت کدہ سب سے آگے تھی۔

'غیبت کدہ'۔۔ ایک رسالے کا آفس۔ جہاں شام کو کچھ چھوٹے موٹے ادیب و شاعر آ کر بیٹھ جاتے اور شروع ہو جاتا دنیا بھر کی سازشوں کا سلسلہ۔ کسے چڑھاؤ، کسے اتارو۔ کس کی ٹانگیں کھینچو۔ کس پر کیچڑ اچھالو۔ کس کو قبضے میں کرو اور دھکا دے کر باہر نکالو۔ کچھ لوگ جن پر غلاموں والی روح غالب آ گئی تھی، اس طرح کے کاموں میں آگے آگے رہتے۔

ایک چھٹ بھیا ادیب جو تیسرے درجہ کی زبان میں چوتھے درجے کا ادب لکھا کرتا تھا، اس رسالے کا مدیر تھا۔ وہ شام کو جب اپنے آفس آ کر اپنی کرسی پر بیٹھتا تو اس کے حوالی موالی ایک سر میں اس کی تعریفوں کا سلسلہ دراز کر دیتے اور مدیر شان نیازی سے اپنی شان میں پڑھے گئے قصیدوں کو سچ سمجھ کر اپنی جھولی میں ڈال لیتا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ڈینگوں کا سلسلہ شروع ہوتا تو اس چائے پر ختم ہوتا جو اس کے درباریوں کے لیے منگائی جاتی تھی۔

وہ بھی کبھی کبھار ذائقے کی تبدیلی کے لیے "غیبت کدہ" چلا جاتا لیکن اسے تھوڑی دیر بعد گھٹن محسوس ہونے لگتی اور وہ وہاں سے بھاگ نکلتا۔

"کہاں کھو گئے؟" رضوانہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"اوہ! معاف کرنا بس کچھ یونہی سوچنے لگا تھا"

پھر اس نے لان کی طرف نظریں کیں تو دیکھا کہ زیادہ تر اساتذہ اپنا رجسٹر مکمل کر کے جا چکے ہیں۔ بس اکا دُکا رہ گئے ہیں۔ جانے والوں میں ذکیہ بھی تھی۔

"لگتا ہے کہ آپ آج اپنا رجسٹر مکمل کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔" رضوانہ اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ میں واقعی آج اپنا رجسٹر بنانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اب کل ہی بناؤں گا۔ ارے ہاں ایک بات بتاؤ کہ تم نے ششماہی امتحان کا رزلٹ بنایا یا نہیں؟''

''میں نے رزلٹ تیار کر کے لڑکوں میں تقسیم بھی کر دیا اور آپ نے؟''

''میں ابھی تک نہیں بنا سکا۔''

''ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔''

''چلئے ہم لوگ بھی چلتے ہیں۔ تقریباً سب ہی جا چکے ہیں۔ اس طرح ہم دونوں کا تنہا بیٹھنا شاید زیادہ مناسب نہ ہو۔'' وہ اپنا رجسٹر اٹھاتے ہوئے بولی۔

ابھی وہ دونوں اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ کسی طرف سے فرحت آ گیا۔

فرحت — گیارہویں درجہ کا طلب علم۔ بہت ہی وجیہ اور اچھی صحت کا مالک۔ اچھے گھرانے کا فرد۔ لیکن پڑھنے لکھنے میں خاصا کمزور۔

وہ ان دونوں کے خاصہ قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

''کہو فرحت کیسے آئے؟''

''سر ——''

''ہاں۔ ہاں۔ کہو کیا بات ہے؟''

''سر آپ نے مجھے اس بار پھر انگریزی میں فیل کر دیا۔''

''ہاں مجھے معلوم ہے۔ محنت نہیں کرو گے تو پھر ایسا تو ہوگا ہی۔'' اس بار اس کا لہجہ قدرے سخت تھا۔ اسے فرحت کی ہمت پر تعجب ہو رہا تھا۔

''سر مجھے میرے فادر گھر سے باہر نکال دیں گے۔ پلیز سر مجھ پر رحم کیجئے۔''

''فرحت اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم تو ذکیہ میڈم سے پڑھنے ان کی گھر بھی جاتے ہو۔''

فرحت چپ رہا۔

''کیوں کیا میں غلط کہہ رہا ہوں اور کتنے لڑکے ان سے پڑھنے جاتے ہیں؟''

''یہی کوئی چار پانچ لڑکے۔ مجھے تو وہ ہفتہ میں صرف تین دن ہی بلاتی ہیں۔''

''پڑھنے والوں کے لیے ہفتہ میں تین دن ہی بہت ہوتے ہیں فرحت۔'' وہ تو پیسے لئے بغیر ہی تم لوگوں کے ساتھ کتنی محنت کرتی ہیں۔''

فرحت کے چہرے پر ایک کڑوی کسیلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''سر آپ ——'' فرحت کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''ہاں ہاں کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''کیا کہوں سر۔ چھوڑیئے بھی ان باتوں کو۔''

''نہیں تم کہو نا۔ میں بھی تو جانوں کہ تمہارے پاس اپنے فیل ہونے کی کیا دلیل ہے۔''

''سر ذکیہ میڈم ہم لوگوں کے ساتھ خاک محنت کرتی تھیں۔ وہ محنت تو ہم لوگوں سے لیتی ہیں۔ انہوں نے ہم لوگوں سے پاس کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن کسی کے ہاتھ کیا لگا۔'' فرحت کے لہجے سے جھنجھلاہٹ اور تلخی عیاں تھی۔ وہ پھر بولا—

''سر ذکیہ میڈم بالکل ویسی نہیں ہیں جیسا آپ انہیں دیکھتے ہیں۔ وہ گھر پر صرف ایک عورت ہوتی ہیں اور کچھ نہیں۔ وہ ہم لوگوں کو بھی اپنا اسٹوڈنٹ نہیں سمجھتیں۔ بلکہ دوست سمجھتی ہیں۔ ایسے قریبی دوست کہ کسی سے کچھ چھپا نہ رہ جائے۔''

وہ اور رضوانہ فرحت کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اسے فرحت کے اس بولڈ رویہ پر تعجب ہوا۔ اس نے سوچا کہ ٹیلیویژن نے بچوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

''میں سمجھا نہیں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' وہ فرحت کر بڑے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

''مجھے حیرت ہے سر کہ آپ میری بات نہیں سمجھ سکے۔ میں اس سے زیادہ آپ کو سمجھا بھی نہیں سکتا کہ آپ بچے نہیں ہیں۔''

فرحت نے اپنی نگاہیں نیچی کرلیں۔ اس کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیل گئی تھی۔

فرحت کے ساتھ ساتھ رضوانہ نے بھی اپنی نظریں جھکالی تھیں۔

''فرحت کیا ذکیہ کے یہی رویے اور لڑکوں کے ساتھ بھی—'' اس نے اپنی بات پوری نہیں کی۔

''ہاں شاید ایسا ہی ہے، ہم لوگ الگ الگ وقتوں میں بلائے جاتے ہیں اور ان وقتوں میں ان کے گھر پر کوئی اور نہیں ہوتا۔''

''اوہ مائی گاڈ!'' وہ دھیرے سے بدبدایا۔

''سر آپ مجھے پاس کردیجئے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ فرحت پھر گڑگڑایا۔

''اچھا دیکھو کوئی راستہ نکالوں گا۔'' اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

چند لمحوں کے بعد فرحت چلا گیا۔

رضوانہ اب بھی آنکھیں نیچے کئے ہوئے بیٹھی تھی۔

''ذکیہ ٹھیک ہی کہتی ہے کہ لوگوں کے دل سے خدا کا ڈر نکل گیا ہے۔''

اس نے رضوانہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں وہ ٹھیک ہی کہتی یہ کہ انسان اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں ہی بہت سی باتیں کہتا ہے۔''

رضوانہ کی آواز میں سنجیدگی تھی اور آنکھوں میں سوچ کے لہر تھے۔

لان پر سے تمام اساتذہ جاچکے تھے اور چپراسی لان پر رکھی ہوئی کرسیوں اور میزوں کو سمیٹ کر اسٹاف روم میں پہنچا دیا تھا۔

وہ دونوں بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ کیمپس گیٹ تک دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ گیٹ سے باہر نکل کر دونوں اپنے اپنے راستوں پر چل دیئے کہ اس کے بعد سے ان کے راستے بالکل الگ ہوجاتے تھے۔

انجم عثمانی

شہر گریہ کا مکیں

قصبے کے بڑے بڑے دالانوں والا پورا کا پورا گھر سنسان اور اندھیارا ہے۔ گھر میں آج وہ اکیلا ہے۔ سائیں سائیں کرتی خاموشی اور اتنے بڑے گھر کے لیے ناکافی ایک چھوٹی سی لالٹین کی روشنی میں وہ سارے گھر کو ایک نگاہ میں نہیں دیکھ سکتا۔

نہ جانے کیوں اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ سارے کے سارے گھر کو یکبارگی دیکھ لے، جب کہ گھر کا ہر کونہ نہ صرف اس کا دیکھا ہوا بلکہ برتا ہوا بھی ہے... کیونکہ یہ اسی کا گھر ہے... یہ بات اور کہ وہ پچھلے کئی برسوں سے اس گھر میں مقیم نہیں ہے، مگر ان برسوں میں ان گنت بار، ہر موسم، ہر وقت میں وہ کبھی جلدی جلدی، کبھی زیادہ وقفے وقفے سے اس گھر میں آتا اور رہتا رہا ہے اور آج بھی اپنے گھر میں رہنے ہی آیا ہے کہ پیدائش سے اب تک یہی گھر اس کے لیے پناہ گاہ رہا ہے۔

وہ آج دوپہر ہی رات بھر کا سفر کر کے شہر سے اپنے آبائی قصبے کے گھر میں آیا تھا... جب وہ گھر پہنچا تو سب موجود تھے... وہ گھر میں داخل ہوا تو اسے سب کے چہروں پر عجیب سی اداسی، گھبراہٹ، افراتفری اور خوف کی سی پرچھائیاں منڈلاتی محسوس ہوئیں... قصبے کی حدود میں داخل ہوتے ہوئے بھی اسے ایسا ہی لگا تھا مگر گھر پہنچنے کی جلدی میں اس نے اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی تھی۔

حسب عادت وہ جا کر ماں سے چمٹ گیا۔ ادھیڑ ہونے کو آیا تھا مگر ماں کو دیکھتے ہی عمر بھول جاتا تھا... اسے محسوس ہوا کہ ماں کی دھڑکنوں میں بھی خوف شامل ہے:

''کیا ہوا ماں؟'' ماں کے سینے سے لگے لگے اس نے پوچھا۔

''اچھا ہوا تو آ گیا'' ماں بولی۔

''وہ کبوتر والے ماموں تھے نا...''

''ہاں، ہاں، وہ تو اب بہت ضعیف ہو چکے ہوں گے...''

''وہ آج صبح سدھار گئے، جنازہ عصر میں اٹھایا جائیگا، اچھا ہوا تو آ گیا، تیری بھی شرکت ہو جائے گی۔''

''انا للہ... اس کی زبان سے ادا ہوا۔''

''کبوتر والے ماموں اگرچہ اس کے سگے ماموں نہ تھے مگر ان سے بچپن اور لڑکپن کی نہ جانے کتنی یادیں وابستہ تھیں۔ وہ سارے محلے کے ماموں تھے۔ مرغیاں، طوطے، بطخیں، بکریاں اور بہت سے کبوتر پال رکھے تھے اس لیے کبوتر والے ماموں کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔

شادی بیاہ ماموں نے کیا نہیں تھا، رشتے دار ان کے تھے نہیں، پس سارا محلہ ان کا رشتے دار تھا... گرمیوں کی لو والی دوپہروں اور جاڑے کی چاندنی راتوں میں ادھر اُدھر گھومتے لڑکوں کو وہ ہانک ہانک کر گھر بھیجتے رہتے تھے۔ محلے کا کوئی بھی اجتماعی کام ہو ماموں آگے آگے رہتے۔ ماموں کی شخصیت میں سب سے نمایاں چیز ان کی پاٹ دار آواز تھی... میلاد بہت اچھا پڑھتے تھے مسدس تو سنتیں اور ٹپ ٹپ آنسو بہاتیں... کرشن لیلا اور رام لیلا میں بڑے اہتمام سے حصہ لیتے... بڑے شوق سے لڑکوں کو جمع کر کے پنڈال اور اسٹیج بجتا، ماموں لہک لہک کر مکالمے دہراتے۔ جو کچھ کماتے ان ہی چیزوں پر خرچ کر ڈالتے... ایک طرح سے محلے کی ہر سماجی اور تہذیبی ذمہ داری انہوں نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ سب ان کی عزت بھی کرتے، ان سے ڈرتے بھی اور ان سے محبت بھی کرتے۔

''کیا ہوا تھا ماموں کو؟'' اس کے رندھے گلے سے آواز نکلی۔

''بیٹا وہ آندھی...''

''تو کیا یہاں بھی...''

''ہاں بیٹا اب تو یہاں بھی...''

''مگر ماموں تو رام لیلا...''

''ہاں بیٹا پھر بھی... اچھا ہوا تو آ گیا۔ اب کم از کم اپنے گھر میں...''

سب کے چہرے زرد تھے...

عصر کا وقت تھا، سب ہی ماموں کے جنازے میں شرکت کے لیے جانا چاہتے تھے۔

''گھر کو اکیلا چھوڑنا ٹھیک نہیں'' ماں بولی۔

''کسی کو تو گھر میں ہونا چاہیے۔ آج کل حالات...''

''میں رہ جاتا ہوں گھر پر آپ سب ہو آیئے۔'' وہ جلدی سے بولا، اتنی جلدی سے کہ اس سے پہلے کوئی اور نہ بول پڑے۔ ایسا اس نے غیر اختیاری طور پر کیا تھا مگر کہنے کے بعد اسے لگا کہ اس نے ٹھیک کیا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ماموں کے آخری دیدار کی وجہ سے اس کے ذہن اور آنکھوں میں موجود ماموں کی تصویر بکھر کر مردے میں تبدیل ہو جائے۔

اس نے ماموں کو سالہا سال سے نہیں دیکھا تھا، جب بھی وہ شہر سے گھر آتا تو اتنی جلدی میں ہوتا کہ کہیں اور جانے کا اتفاق کم ہی ہوتا۔

''ٹھیک ہے، سفر سے تھکے ہوئے بھی آئے ہو، ہم لوگ ہو آتے ہیں۔''

سب کے جانے کے بعد اس نے گھر میں ایک طرح کا سکون محسوس کیا، ہاتھ منہ دھویا اور صحن میں پڑے پلنگ پر دراز ہو گیا۔ تھکن کی وجہ سے اس کی آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ تاریکی نے در و دیوار کو گھیرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ پلنگ سے اٹھا اور لائٹ کا سوئچ کھولا مگر روشنی نہ ہوئی۔ ابھی اتنا

اندھیرا نہ ہوا تھا کہ وہ چیزوں کو تلاش نہ کر پاتا۔ اسے معلوم تھا کہ لالٹین گھر کے کس کونے میں رکھی رہتی ہے۔ لالٹین جلا کر اس نے دالان کے در میں لگے ہک میں ٹانگ دی۔

''اب تو سب کو لوٹ آنا چاہیے تھا۔'' اس نے سوچا۔ اب اسے اکتاہٹ سی ہو رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں دروازے پر تھیں۔

تھوڑی دیر بعد لالٹین خود بخود بھبھکنے لگی:

''شاید تیل ختم ہو رہا ہوگا یا پھر اوپر ٹنگی ہونے کی وجہ سے ہوا سے لو تھرتھرا رہی ہوگی۔''

وہ اٹھا، لالٹین اتاری:

''تیل تو ٹھیک ہے۔''

اب لالٹین کو اس نے نیچے رکھ دیا اور پاس بیٹھ کر ٹمٹماتی لو کو دیکھنے لگا۔ دفعتاً اسے لگا کہ گھر کے باہر تیز آندھی چل رہی ہے، بھاری بھاری بوٹوں اور نعروں کی آوازیں دور سے آتی سنائی دے رہی ہیں۔ اس نے دروازے کی طرف کان لگا دیے مگر سناٹے کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔

اب وہ سچ مچ اکتا چکا تھا۔ وقت گزاری کے لیے اس نے عادتاً گھر میں کتاب تلاش کرنی شروع کر دی... ہاتھ میں لالٹین لٹکائے وہ کتاب تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ جہاں جہاں وہ لالٹین لے کر جاتا۔ گھر کا باقی حصہ اندھیرے میں ڈوب جاتا۔ اسے اپنے ہی گھر میں خوف کا احساس ہونے لگا جب کہ وہ بچپن سے نہ جانے کتنی بار اس گھر میں اکیلا رہ چکا تھا۔ اسے پورے گھر میں کبھی کبھی اکیلے رہنا برا نہیں لگتا تھا بلکہ ایک طرح کی طمانیت کا سا احساس ہوتا تھا، مگر آج اسے ڈر لگ رہا تھا:

''بڑے بڑے شہر کے چھوٹے سے مکان میں رہتے رہتے مجھے اتنے بڑے گھر میں تنہا رہنے کی شاید عادت نہیں رہی۔'' اس نے سوچا اور دالان میں بنی ایک الماری کے پٹ کھولنے لگا۔

وہ جانتا تھا کہ گھر میں کہیں اور کتاب ہو یا نہ ہو دادا کی الماری میں ضرور کتابیں ہوں گی۔

اس نے الماری کے پٹ کھولے تو کتابوں کے بجائے کئی عدد چوہے، کچھ خالی ڈبے اور لوہے کے کچھ پرانے کل پرزے اس پر الٹ پڑے۔ اسے لگا کہ بہت سارے مردے کفن سمیت اس پر گر پڑے ہیں، آندھی کے جھکڑ باہر سے گھر میں گھس آئے ہیں۔

زمین پر دھری لالٹین الٹ کر بھبھکنے لگی... خوف اسے جکڑ چکا تھا۔

کانپتے ہاتھوں سے گری ہوئی لالٹین کو اس نے سیدھا کیا، دونوں ہاتھوں کا بوجھ گھٹنوں پر ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا... اور لالٹین ہاتھ میں لٹکائے دروازے کی طرف ایسے بڑھنے لگا جیسے جنازے کے آگے چل رہا ہو۔

لالٹین بہت زوروں سے بھبھک رہی ہے۔ بلکہ جلنے بجھنے کے درمیان قریب المرگ کی طرح سانسیں لے رہی ہے، قصبے کے بڑے دالانوں والا گھر سنسان اور اندھیارا ہے... اور وہ تھرتھرائی لو کو بجھنے سے روکنے کی کوشش میں گھر کی دہلیز پر بیٹھا کانپ رہا ہے۔

حبیب کیفی

دھارا

"تمھیں کچھ پتہ بھی ہے کہ نیا فرمان جاری ہوا ہے۔" سگریٹ جلانے کے بعد جہانگیر نے دھواں چھوڑا اور تیلی دوب میں رگڑ دی۔

"کیا؟" دارا نے اسٹرانگ بیئر کی بوتل سے ایک لمبا گھونٹ لیا۔

"یہی کہ بھارتیہ کرن کرنے کی ضرورت ہے۔" جہانگیر نے بھی اپنی بوتل سے ایک گھونٹ بھرا۔

"کس کا بھارتیہ کرن کرنے کی ضرورت ہے ڈیئر؟" دارا نے سگریٹ کا ایک کش کھینچا۔

"ہمارا"

"ہم بھی کوئی فیکٹری یا بنک ہیں؟"

"فیکٹری اور بنک، ہم دونوں ہی ہیں!" دارا مسکرایا۔

"چہ معنی دارد؟" جہانگیر کی تیوری میں بل پڑ گئے۔

"صاف بات یہ ہے کہ بچے پیدا کرنے کے معاملے میں ہم بڑی بڑی فیکٹریوں کو بھی مات دیتے ہیں۔ رہی بات بنک کی، تو پیارے ووٹ بنک ہم ہی تو کہلاتے ہیں" وہ ہنسا۔

"کیا خوب تجزیہ کیا ہے تو نے پیارے لال!" وہ بھی ہنسا۔

"اب یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں رہی کہ فرمان کس کی جانب سے جاری ہوا ہے..." دارا نے اس دفعہ ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا۔

"بس یہ جان لینا ہی کافی ہے کہ جب جس کا جی چاہے وہ ٹانگ اٹھا کر ہم پر موت سکتا ہے!" تلخی سے کہنے کے بعد اس نے بھی اپنے ہاتھ کی ٹھنڈی بوتل کی سدھ لی۔

"میرے عزیز! ایک بات تو بتا۔"

"پوچھ پیارے لال! دو بات پوچھ۔"

"ہم کیا یہاں اس گارڈن کے کونے میں رات کے اس پہر بھارتیہ کرن کرنے آئے ہیں؟" دارا نے سگریٹ کا ایک بھرپور کش لیا۔ "یہ باتیں تو ہم کبھی بھی کر سکتے ہیں... اس قدر قیمتی بیئر اور وقت کو برباد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بات تو تمہاری واجب ہے۔" دوست سے اتفاق کرتے ہوئے جہانگیر نے کہا۔ "ایک تو سالے ہم ڈگری کے ڈسے ہوئے ٹھہرے۔ اوپر سے بے روزگاری کا کنگ کوبرا پھن پھیلائے پھنکارتا رہتا ہے۔

چاہتے ہوئے بھی ہم کوئی ایرا غیرا کام نہیں کر سکتے۔ ریزرویشن اور فرقہ پرستی کے اس دور میں کون ہمیں نوکری دے گا! پیرنٹس کے طعنے الگ سے جلے پر نمک کا کام کرتے رہتے ہیں اور پھر یہ بھارتیہ کرن اور مکھیہ دھارا!... لعنت ہے!''

''تو چلو کوئی تیری والی بات ہی کریں۔'' دارا نے اس دفعہ بیئر کی بوتل سے منہ لگا کر ایک لمبا گھونٹ بھرا۔

''اچھا بتا کہ اُرملا اور سشمتا میں زیادہ سیکسی کون لگتی ہے؟''

''یہ اچھا ہے میرے عزیز!'' بوتل اپنی گود میں ترچھی رکھ کر تل ہتھی سے ہونٹ پونچھنے کے بعد اس نے کہا۔ ''گڈ آئیڈیا! اصل میں سیکس سے زیادہ دلچسپ بات کوئی ہو ہی نہیں سکتی!''

''میں نے پوچھا کہ ان دونوں میں زیادہ سیکسی کون لگتی ہے پیارے لال؟'' اس نے اپنا سوال دہرایا۔

''سوال تمہارا، اپنی جگہ واجب ہے، میرے عزیز! لیکن میں اگر کسی تیسری کا نام لینا پسند کروں تو؟''

''اجازت ہے... لیکن تمہارے جواب میں وزن ہونا چاہیے۔''

''اتنا وزن ہے کہ کوئی فٹس سے مس نہیں کر سکتا!''

''تو پیارے لال، پھوٹو پھر۔''

''مجھے مدھوبالا سب سے زیادہ سیکسی لگتی ہے۔ مارلن منرو سے بھی زیادہ، میرے عزیز!''

''اس نے تو جب اس دار فانی سے کوچ کیا تب تم باہر نالی پر بیٹھ کر ہگتے تھے شاید!''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے میرے عزیز؟'' اس نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''مونالیزا کو کس نے دیکھا ہے؟ لیکن کتنے کروڑ لوگ اس کے متبسم انداز پر فدا ہو چکے ہیں اور میں بھی؟''

''لو، تم تو سنجیدہ ہو گئے پیارے لال! میں تو خود بھی تمہارے جواب سے متفق ہوں... کیا ادائیں تھیں۔ بے مثال مسکان اور لاجواب ہنسی۔ ڈھکی چھپی رہ کر بھی اپیل کر جاتی تھی ظالم! اور مغل اعظم کا وہ لمبے پر سے سہلانے والا سین! خدا کی پناہ! ہے کوئی دوسری ایسی شائستہ سیکس کی مثال پوری ہندوستانی فلم انڈسٹری کی ہسٹری میں...؟

''بس بس۔ اتنی تعریف ٹھیک نہیں میرے عزیز!''

''کیوں میرے بھائی؟''

''اس لیے کہ ایک سیما بھی تو ہونی چاہیے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں کہ تم مجھے سیما کی یاد دلا رہے ہو!''

''میرے خیال سے تم کافی سمجھدار ہو!'' خود دارا نے بھی اس دفعہ بیئر کی سدھ لینے کے بعد آگے کہا۔

''کیا حال ہے تمہاری سیما کا؟''

''ٹھیک ہی ہوگا۔'' جہانگیر نے بوتل میں بچی بیئر ایک ہی سانس میں غٹک ڈالی۔

''ٹھیک ہی ہوگا، چہ معنی دارد؟'' اس نے دوست کو گھورا۔

''ان دنوں وہ کمپیوٹر کورس کر رہی تھی اور... اسے ملٹی نیشنل کمپنیز کی طرف سے جاب بھی آفر ہونے لگے ہیں...''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے میرے عزیز!''

''لیکن مجھ سے وہ اب کترانے لگی ہے پیارے لال!''

''اس کی کوئی وجہ تو ہوگی۔''

''وجہ... نہیں سمجھے؟ تو سنو، کیوں کوئی دوشیزہ کسی بے روزگار کو اپنا محبوب بنانا پسند کرے گی؟''

''پھر بھی مثالیں تو ہیں ہی۔''

''ایسی مثالی محبوبائیں اب سستی اور جذباتی فلموں یا پھر قصے کہانیوں میں رہ گئی ہیں۔ حقیقت کی دنیا میں ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔'' لمحہ بھر ٹھہر کر اس نے مزید کہا۔ ''اور کیا اس دنیا میں پریکٹیکل ہونا گناہ ہے؟ کیوں کسی کو اپنی طبیعت پر جبر کرنے کے لیے مجبور کیا جائے؟ صرف محبت یا ہوائی باتوں سے تو گھر گرہستی کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ محبوباؤں کو کھلانا پلانا بھی تو ضروری ہے کہ نہیں؟... انہیں تحفے تحائف بھی تو درکار ہوتی ہے!''

دارا خاموش رہ گیا۔ ادھر جہانگیر بھی چپ ہو رہا۔ اسٹرانگ بیئر نے ان دونوں کو پہلے ہی اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اب سیما کے ذکر نے ماحول کو سنجیدہ بنا ڈالا۔ کچھ لمحے اسی طرح نکل گئے۔

''مجھے نہیں پتہ تھا کہ تان یہاں آکر ٹوٹے گی اور ماحول اس قدر بوجھل ہو جائے گا...'' آخر جہانگیر ہی پھر گویا ہوا... ''یوں ہے پیارے لال! کہ تم نے کبھی نام سیما پر غور کیا ہے؟''

''کیسے؟'' دارا نے اس کی طرف دیکھا۔

''اس طرح کہ سیما کا مذہب کیا ہوا؟'' جہانگیر اب ہلکے ہلکے مسکرا رہا تھا۔

''سیدھی سی بات ہے کہ سیما دیوی کہو، ہندو کہلائے گی۔ سیما خانم پکارو تو مسلم ہو جائے گی۔''

''اس سے آگے بڑھیں اور ذرا وسعت سے کام لیں تو ہندو مسلم کی سیماؤں کو توڑ کر یہی سیما بن جائے گی۔ سیما کوریا سیما ڈیوڈا کیا خیال ہے؟'' وہ ہنسنے لگا۔ ''یہ تو بھارتیہ کرن سے بھی آگے کی بات ہوگئی! ہے نا پیارے لال؟''

''میرے عزیز! برا نہ مانو تو میں ایک بات کہوں؟''

''کہو پیارے لال! شوق سے کہو۔''

''لیکن خاص بات کہنے سے پہلے میں کہنا یہ چاہوں گا کہ معاملہ گرم ہوا جا رہا ہے۔ کیوں نہ اب دوسرے دور کے دونوں بکروں کو ذبح کر دیا جائے؟''

''شیور شیور۔'' دوست کا اشارہ سمجھتے ہوئے اس نے پاس ہی رکھے ہوئے جھولے سے بیئر کی باقی بچی دونوں بوتلیں نکالیں اور چابی سے انہیں کھول کر ایک اسے تھما دی۔

''شکریہ میرے عزیز!'' کہہ کر اس نے مدت سے پیاسوں کی طرح بوتل کو منہ سے لگا کر ایک لمبا گھونٹ لینے کے بعد آگے کہا۔ ''اجازت دو تو میں تھوڑا نیچے اترنا چاہتا ہوں۔''

''کہاں تک؟'' جہانگیر نے بھی بیئر حلق سے نیچے اُتاری۔

''ناف کے نیچے تک!'' دارا مسکرایا۔

''اجازت ہے پیارے لال!''

''بات صرف اتنی سی ہے کہ مرد کی تو، پھر بھی کسی حد تک پہچان کی جا سکتی ہے لیکن میرے عزیز! عورت کے مذہب وغیرہ کی پہچان کیوں کر ہوگی؟''

''چھوڑ بھی پیارے لال! میں نے سوچا تھا کہ کوئی دلچسپ بات ہوگی۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔

''چل چھوڑ دیا۔ لیکن میرے عزیز! اس تلخی کا سبب اصل میں یہ ہے کہ مانگے بنا ہی ہمیں ہر کوئی صلاح دینے لگ جاتا ہے۔ مزے کی بات یہ کہ ایسی صلاح دینے والے کے ذہن میں ہی یہ صاف نہیں ہے کہ بھارتیہ کرن کہتے کسے ہیں!''

''ایسی بات مت کہو یار! تم تو جانتے ہی ہو کہ ان کی تنظیم ملک گیر پیمانے پر کام کرتی ہے... یہ لوگ ہمیں ضرب پہنچا سکتے ہیں... جان سے بھی مار سکتے ہیں!''

''کس کس کو جان سے ماریں گے میرے عزیز؟'' لمحہ بھر ٹھہر کر اس نے تلخی کے ساتھ کہا۔ ''سوچو کہ کیا ابھی ہم زندہ ہیں؟... سانس لینے کو ہی زندہ رہنا نہیں کہتے میرے عزیز! حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری یہ پوری ہندوستانی قوم ہی سوئی ہوئی ہے اور وطن پرستی کی آڑ میں ایسی ہی تنظیمیں آپس میں نفرت و تفریق پیدا کر کے اسی ہندوستان کو کمزور بنانے میں مشغول ہیں۔ ان کے سربراہوں کی حفاظت پر سرکاری خزانے سے کروڑوں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ جب کہ غریب اقلیت اور دلت کو یونہی ظلم سہنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے... عورت کو بھی اس میں شامل سمجھنا چاہیے۔''

''یعنی اس طرح اقلیت اور دلت عورت کے برابر ہوئے!''

''میں پوچھتا ہوں کہ اظہارِ خیال کی آزادی صرف شر پسندوں کے لیے ہے میرے عزیز؟''

''ضرب پہنچانے کے کئی طریقے ہیں پیارے لال۔ نقضِ امن کی دہائی دے کر اندر کر دینے کے بعد بیٹھے سڑتے رہنے۔ پھر کوئی داد ہے نہ فریاد!''

''اب میں ایک بات کہوں؟

''کہو میرے بھائی!''

''میں جانتا ہوں کہ سن کر تمہیں اچھا نہیں لگے گا۔''

اماں نے اپنے دونوں کانوں کی لو کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''تا بیٹا نا۔ ایسا نہیں کہتے جن ناراض ہو جائے گا۔'' انہوں نے اپنی بات جاری رکھی ''بیٹا قرآن میں بھی جن کا ذکر ہے۔ ان کی پہنچ تو آسمان تک ہے۔ وہ تو وہاں تک کی خبر لے آتے ہیں۔''

''اماں آپ بھی کہاں کہاں کا اڑا رہی ہیں'' میرے یہ کہنے پر اماں نے بتایا۔

''بیٹا تو قرآن پڑھ سب جان جائے گا۔ یہ جب آسمان کی سرحد پر پکڑے جاتے ہیں تو انہیں شہاب ثاقب سے مارا جاتا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کبھی کبھی رات میں آسمان سے انگارہ گرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی تو شہاب ثاقب ہے نا۔''

میری اماں مذہبی خیال کی ہیں۔ قرآن و حدیث کا مطالعہ بھی کرتی ہیں۔ اس لیے انہیں سمجھا پانا میرے لیے مشکل ہے اور قمر آرا کی وجہ سے تو جن اور اس کے کرامات پر ان کا یقین اور پختہ ہو گیا ہے۔

جیسے ہی جمعرات کا دن آتا لوگوں کے ذہن میں ایک ہی سوال ابھرتا۔

''آج پھر جن کی سواری آئے گی؟''

یہ جن بھی خوب تھا۔ اب تو لوگوں میں کافی گھل مل گیا تھا۔ لوگوں سے ان کی خیریت بھی دریافت کرتا اور انہیں تسلی بھی دیتا۔ طرح طرح کی باتیں کرتا اور مذاق مذاق میں لوگوں کے بھید کھول کر رکھ دیتا۔ ایک بار قمر آرا کے رشتے کے خالو قیام صاحب بھی گاؤں میں موجود تھے، وہ بھی سواری کا سن کر قمر آرا کو دیکھنے گئے۔ قمر آرا نے انہیں دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے کہا۔

''آیئے قیام صاحب۔ کہیئے آپ کی منی بیگم کا کیا حال ہے؟''

یہ سننا تھا کہ قیام صاحب پر گھڑوں پانی پھر گیا۔ قیام صاحب دراصل قمر آرا کی چھوٹی خالہ کے شوہر تھے اور انہوں نے پٹنہ میں منی بیگم نام کی ایک عمر دراز خاتون سے شادی بھی کر رکھی تھی۔ یہ بات گاؤں میں کم لوگوں کو معلوم تھی۔

''کیا بکتی ہو تم؟'' قیام صاحب یہ سن کر چراغ پا ہو گئے۔

''میں بکتی ہوں کہیئے تو شادی کے گواہ حلیم اور اسرائیل صاحب کو بھی حاضر کر دوں؟''

یہ سننا تھا کہ قیام صاحب وہاں سے چپکے سے کھسک لیے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر انہوں نے اور کچھ کہا تو وہ ایسے اور بھی سچ اگل دے گی۔

اس دن کے بعد سے یہ بات پورے گاؤں میں پھیل گئی کہ قمر آرا کا جن بالکل سچ سچ سب کچھ بتا دیتا ہے۔ اب بہت سے لوگ اس سے ڈرنے بھی لگے کہ کہیں ان کا پول نہ کھل جائے اور بہت سے لوگ چھپی باتوں کو جاننے کے لیے قمر آرا کی منت بھی کرنے لگے۔

قمر آرا شادی کے بعد تو ایک دو بار سونا رپٹی ہو آئی تھی لیکن اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ ایک بار جب وہ

پکڑے جاتے تو جرمانے کے علاوہ قید تو ہوتی ہی۔ اس سے پہلے اتنے کوڑے پڑتے کہ بدن ہی سوج جاتا!''

''اس کے باوجود ان ممالک میں پی جاتی ہے... جو صاحب استعداد ہیں وہ تو دیگر ممالک میں جاکر چوراسی آسنوں کا آنند لیتے ہیں!''

''اس کا مطلب یہ ہوا میرے عزیز! کہ سمرتھ کو نہیں دوش گوسائیں!''

''ایک بات تو ہے پیارے لال! اور وہ یہ کہ اس ملک کا عام شہری سیدھا سادہ اور امن پسند ہے، وہ چاہے کسی بھی مذہب یا ذات سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔''

''اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے میرے عزیز؟''

''پھر یہ فرقہ پرستی کی وبا آئی کہاں سے پیارے لال؟''

''سچ تو یہ ہے کہ کچھ لوگ اپنی حیثیت بتانے اور لیڈری چمکانے کی غرض سے لوگوں کے جذبات سے کھیلتے رہتے ہیں۔''

''پھر بھی میرا سوال اپنی جگہ ہے کہ فرقہ پرستی شروع کہاں سے ہوتی ہے۔''

''اس سوال کا ایک اور صرف ایک ہی جواب ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ ایک فرقہ جب دوسرے فرقے کی تنقید و دل آزاری کرتا ہے تو فرقہ پرستی پیدا ہوتی ہے۔''

''بابری مسجد کے بارے میں کیا کہتے ہو پیارے لال؟''

''بتاؤ کہ کیا ہم تم نماز پڑھتے ہیں؟''

''نہیں پڑھتے تو کیا، ہماری مسجدوں کو مسمار کردینا چاہیے؟''

''میرے عزیز! یہ بات تو کوئی اندھی رانڈ بھی کہہ دے گی کہ یہ ایک نہایت ہی سیاسی مسئلہ ہے جسے فرقہ پرستوں نے ہوا دے رکھی ہے۔ اصل میں منڈل کے جواب میں کمنڈل کے میدان میں آجانے کے سبب ہی اسے ہوا ملی۔ ورنہ تو لوگ بھولے ہوئے تھے۔ اس سے بھی پہلے تم سوچ سکتے ہو کہ کس نے اس کا تالا کھلوایا اور کیوں؟... اور سنو کہ یہ معاملہ تو چلتا ہی رہے گا کہ لوگوں نے یہ جان لیا ہے کہ اس مسئلے کے سہارے ہندوستان کا راج مل سکتا ہے۔ باتیں اور بھی ہیں۔ جیسے پریس کا ایک بڑا حصہ فرقہ پرستوں کی زبان میں ہی مسجد کو ڈھانچہ کہتا رہے گا۔ قطب مینار، لال قلعہ، تاج محل اور دیگر ایسی ہی عمارتوں پر سوالیہ نشان لگائے جاتے رہیں گے۔ تسلیمہ نسرین اور سلمان رشدی محض اسلام اور ہمارے نبی کی مخالفت کی بنیاد پر بڑے لکھنے والے کہلاتے رہیں گے اور مغربی پریس کے گائے ہوئے گیتوں کو ادھر بھی دہرایا جاتا رہے گا... وغیرہ وغیرہ۔ اسے تم لیکچر دینا نہ جانو تو میں اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے آگے بھی کچھ کہوں۔''

''ضرور کہو۔ گو کہ کالج کے دنوں میں لیکچر سے مجھے سخت پریشانی ہوتی تھی۔ لیکن پیارے لال! دوزخ کی اس آگ کو ذرا حلق سے نیچے اُتارتے چلو کہ ذہن و دل کو تھوڑی بہت راحت بھی ملتی رہے۔'' کہہ کو خود

اس نے بھی بوتل منہ سے لگا کر ایک لمبا گھونٹ لیا۔

''فرقہ پرستی اصل میں کتے کا سوکھا ہوا گو ہے، میرے عزیز! اسے کوئی بھی کریدے گا تو یہ بدبو مارے گا ہی۔ بلکہ جس قدر اسے کریدو گے یہ اسی تیزی کے ساتھ بدبو مارے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اسے چھیڑا ہی نہ جائے... ہونا تو یہ چاہیے کہ مساوات کی بات کی جائے'' اس بار اس نے بھی اپنی بوتل کی سیدھ لی۔

''لیکن مساوات لائیں کہاں سے پیارے لال؟''

''لانے کی نہیں، نظر دوڑانے کی ضرورت ہے... جیسے فوج اور فلم میں آج بھی ہے۔''

''فوج کی بات تو پھر بھی سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن فلموں کی مساوات کچھ نقلی لگتی ہے۔''

''کیوں نقلی لگتی ہے؟ یوسف صاحب شنکر کے کردار میں شو جی کے آگے منھا نیکتے ہیں تو کیا وہ نقلی لگتے ہیں؟ پرتھوی راج کپور جب اکبر بن کر سامنے آتے ہیں تو کیا وہ جھوٹے ہوتے ہیں؟ نوشاد، شکیل اور محمد رفیع جب من تڑپت ہری درشن، کی رچنا کرتے ہیں تو کیا وہ مسلمان نہیں رہتے؟... ہزاروں مثالیں ہیں یار مساوات کی!''

''پر غدر نے تو غدر مچا ہی دیا!''

''یہ غدر بھی غلط ہی ہے میرے عزیز!''

''اکثر ہی فلموں میں جہاں ہندو مسلمان کی بات ہوتی ہے تو ہیرو ہندو رکھا جاتا ہے اور ہیروئن مسلم۔ جب کہ حقیقی زندگی میں زیادہ تر معاملہ ٹھیک اس سے الٹا ہی ہوتا ہے!''

''چھوڑو بھی ہندو مسلمان اور فرقہ پرستی کی باتوں کو!'' ایک ہچکی لینے کے بعد اس نے بیزاری سے کہا۔ ''اصل سوال یہ ہے کہ نہ تو یہاں کوئی مسلمانوں کا ہمدرد ہے اور نہ ہی ہندوؤں کا۔ بلکہ اس شاندار اور رنگا رنگ ہندوستان کے بارے میں ہی کوئی نہیں سوچتا۔ سوچتا تو وہ مسلمانوں کی تعلیم کی بات کرتا۔ ان کی غریبی اور بے روزگاری کو دور کرنے کا کوئی پروگرام رکھتا۔ ہندوؤں میں بھی جو دلت ہیں، صدیوں کے ستائے ہوئے ہیں یا آج جن ہاتھوں کو کام نہیں ہے ان کی فکر کرتا۔ ذات پات کو مٹانے کا پروگرام بناتا...''

''تو بات یہ کھلی کہ جو غریبی، بے روزگاری اور جہالت نیز نابرابری جیسے اصل سوالوں سے آنکھ چرا کر ایسے نقلی سوال اٹھاتے ہیں وہی ملک کے دشمن ٹھہرتے ہیں پیارے لال!''

''میرے عزیز! یہ تو بہت زیادہ سرلی کرن (सरलीकरण) کر دیا تم نے!''

اس سے بھی زیادہ سرلی کرن چاہیے تو مکھیہ دھارا بہا کر دکھاؤں؟''

''رہنے دے میرے عزیز! یہ اچھی بات نہیں ہے۔ آؤ اب چلتے ہیں۔''

''چلو، پیارے لال!''

م۔ق۔خان

اَن کہی کہانی

دونوں نے رشی کے چرنوں کا اسپرس کیا اور مؤدب کھڑے ہوگئے۔ رشی نے آنکھیں کھولیں اور آنے کا مقصد پوچھا۔

''رشیوں کے رشی! میں اپنی دکھ بھری جیون کتھا سنانے آیا ہوں کہ آپ اسے لکھ دیں۔ آج کے پاٹھک میری بپتا سے سبق لیں اور آنے والے سمے کے چکرویو میں نہ پھنسیں۔ مہاراج! سمے سب سے بڑا درونا چاریہ ہے!''

رشی نے تیکھی نظروں سے دونوں کو دیکھا اور دریافت کیا—

''پہلے آپ یہ بتلائیں کہ آپ میں کون— باپ بیٹی، سسر بدھو، بھائی بہن— یا ور اور کنیا؟''

''مہاراج! آپ نے بھی ہمیں اس دیش میں نہیں پہچانا؟ سب کال کا چکر ہے! ہم دسرتھ اور کیکئی ہیں۔ جنگل کی خاک چھانتے چھانتے، ایس دشا کو پہنچ گئے ہیں کہ آپ نے پہچانا بھی نہیں۔''

''مجھے شما کریں راجن— چوک ہوگئی— پرنتو— میں تو مریادا پُرش رام کی جیون کتھا لکھنے کو بنا تھا اور آپ کلنجگی دسترھ میں۔ وہ ست جُگ کی بات تھی—!'' اور آپ نے کون سی مریادا کی رکشا کی ہے؟ اور آپ کو کس نے بن واس دی ہے؟ آپ کی اس کتھا میں کوئی راون بھی ہے؟ مجھے شما کریں میں یہ کتھا نہیں لکھ سکوں گا۔'' دسرتھ نے چاہا ان کے قدموں کو پکڑ کر کچھ اور منت سماجت کریں لیکن اب تو وہاں کوئی نہیں تھا، صرف سناٹا، ایک ہوکا عالم! راون کا نام سن کر وہ کانپ گئے تھے۔ سیتا کو تو صرف ایک راون اپہرن کر کے لے گیا تھا اور یہاں— آج— پگ پگ پر راون سے مدبھیڑ ہونے کا خطرہ تھا۔

دسرتھ وہاں سے سرہلاتے— من ہی من میں کچھ سوچتے بُدبُداتے آگے بڑھ گئے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ رشی نے بہت حد تک ٹھیک ہی کہا تھا۔ شام ہوتے ہوتے وہ ایک ندی کے تٹ پر آگئے۔ کچھ دور آگے بڑھے تو ایک کٹیا نظر آئی۔ اسی جانب چل پڑے۔ کٹیا کے پاس آکر وہ دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر کے بعد ایک آدمی پاؤں میں کاٹھ کی کھڑاؤں پہنے باہر آیا۔ اس کے سر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ داڑھی سینے پر لٹک رہی تھی۔ وہ دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں قلم پکڑے، وہ ان کو یوں دیکھنے لگا جیسے وہ دونوں کوئی ٹھوس وستو نہ ہوں بلکہ مایا جال ہوں، صرف کلپنا ساکار ہوگئی ہو۔ دسرتھ نے غور سے تو پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ دسرتھ نے کیکی کو اشارہ کیا اور دونوں نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور پھر دسرتھ نے کہا۔

''سنتوں کے سنت! میری بپتا کتھا لکھ دیں کہ اس بار گھٹنا کا چکر کچھ الٹا چل گیا ہے۔''

سنت نے چیں بہ چیں ہو کر دریافت کیا۔ ''کیا مطلب؟ کیسا الٹا چکر؟''

''مہاراج! اس بار رام اور سیتا نے دسرتھ اور کیکی کو بن واس دیا ہے'' ''ہاں؟ تب تو یہ کتھا سچ مچ دلچسپ اور روچک ہوگی۔ ٹھیک ہے میں اس کا ادھین کروں گا۔ آپ قریب میں ایک کٹیا بنا لیں۔ گاہے گاہے مجھ سے ملتے رہیں۔ جب جیسی ضرورت ہوگی میں آپ دونوں سے ایک ساتھ اور کبھی الگ الگ مل لوں گا۔ آپ کی کتھا ضرور لکھوں گا اور میں نے یہ کتھا لکھ دی تو گھر گھر آپ کی پوجا ہوگی۔ لوگ رام اور سیتا کو بھول جائیں گے۔

''سنت مہاراج، ہمیں یہاں رہنا پڑے گا؟ رام چرت مانس لکھتے سمے۔ رام اور سیتا تو آپ کے قریب نہیں تھے۔''

''میرے کلنجگی پاتر دسرتھ اور کیکئی رانی! وہ یگ گیا۔ وہ بھگتی کا یگ تھا، سادھنا کا یگ تھا اور یہ پرگتی کا یگ ہے پریوگ اور انوبھو کا یگ ہے۔''

''جیسی آگیا، مہاراج۔'' دسرتھ نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

دونوں کٹیا سے باہر آئے اور ندی کے تٹ کے ساتھ چلنے لگے۔ پونم کا چندرما اپنے پورے یوون کے ساتھ آکاش پر وہار کر رہا تھا۔ سامنے ندی کا پانی پگھلی چاندی کی طرح رواں تھا۔ مند مند پون کی چنچل انگلیاں، ندی کے پانی سے کھیلتی، اٹھکھیلیاں کرتی، کناروں کو تھپکیاں دے رہی تھیں۔

یک بہ یک ان لوگوں نے دیکھا کہ ندی کی دھارا چیرتی کوئی کوئی چیز کنارے کی جانب آرہی ہے۔ وہ سہم گئے اور اس کے بارے میں جاننے کی اتسکتا (تجسس) نے انہیں اُسی جگہ رکنے کو مجبور کر دیا۔

زندگی میں کچھ جاننے، کچھ حاصل کرنے کے لیے خطرے بھی مول لینے پڑتے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے وہ پانی سے باہر جل پری کی طرح ندی کے تٹ پر آگئی اور قریب آئی تو دسرتھ نے دیکھا کہ یہ ایک یوتی ہے۔ بھیگے کپڑوں کے پنجرے سے روپ اور یوون کا مٹھو جھانک جھانک کر بول رہا تھا۔ دسرتھ کو اپنی جانب للچائی نظروں سے دیکھتے ہوئے پا کر اس نے تیوری پر بل دے کر پوچھا ''کیا دیکھ رہے ہو؟''

اب کیکئی نے بھی دسرتھ کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ دسرتھ نے اپرادھی کی طرح نظریں جھکا لیں۔ اب وہ کیکئی کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے چیر ڈالے گی۔ دسرتھ نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا—

''ہم یہاں سنت تلسی داس سے ملنے آئے تھے، ہمیں اپنی کتھا—'' وہ درمیان میں ہی بول پڑی ''ہوں! سنت تلسی داس سے ملنے آئے تھے۔ یہ کون ہے ساتھ میں کوئی اپسرا؟ اب میں سمجھ گئی یہ کوی مہاراج، میری پروا کیے بغیر کیوں اس ویران کٹیا میں پڑے رہتے ہیں۔ مجھے روز اس اپھنتی ندی کو پار کرنا پڑتا ہے۔ میں آج ہی اس کٹیا کو جلا دیتی ہوں۔ ان کا بھی کیا دوش ہے کہ جب لوگ خود اپنی بیٹی، بہو لے کر ان کے پاس دوڑے آتے ہیں اور یہ مہاراج کب کے برہم چریہ ٹھہرے! ان کی ساری قوم کو سورا اور سندری ہی تو پریرنا کا سروت رہا ہے۔''

اتنا کہہ کر وہ دندناتی ہوئی کٹیا میں داخل ہوگئی جہاں سے کچھ دیر پہلے وہ لوگ آئے تھے۔ اس نے تلسی داس کی چٹیا پکڑی اور باہر کھینچ لائی، تلسی داس نے گڑگڑا کر کہا۔ ''مجھے اسی جگہ رہنے دو۔ گیان کے لیے دھیان اور سادھنا کی ضرورت ہے۔ کلا کی سدھی کے لیے بلیدان ضروری ہے۔''

''مہاراج! آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ رتنا گری ہوں اور آپ کی رگ رگ اور روم روم پہچانتی ہوں۔ جو کچھ کرنا ہے وہ گھر چل کر کرنا ہوگا۔''

''ارے تم بات کو سمجھتی کیوں نہیں؟ چنتن کے لیے ایکانت چاہیے۔ مجھے اسی جگہ چھوڑ دو'' تلسی داس نے ایک بار پھر کہا۔ اس نے کاغذ اور قلم اٹھا کر ندی میں پھینک دیا اور تلسی داس کو کھینچتی ہوئی ندی میں اتر گئی۔

ایک بار پھر دسرتھ اور کیکئی کے قدم جانی، انجانی راہوں پر بھٹکنے لگے۔ اس بار جنگل سے ان کا رخ گاؤں کی جانب تھا۔ ایک کسان اور اس کی پتنی کو انہوں نے لڑتے دیکھا تو رک گئے۔ دسرتھ نے بڑھ کر دریافت کیا ''آپ لوگ کون ہیں اور کس بات پر آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں؟''

مرد سے پہلے عورت ان کے سامنے آئی اور اس نے تلخ لہجے میں کہا ''آپ اپنی راہ لیں۔ ہم کون ہیں اس کی آپ کو کیا پڑی ہے؟'' مرد نے ہاتھ جوڑ کر معذرت کرتے ہوئے کہا ''بابو جی۔ اس کی باتوں پر دھیان نہ دو۔ آپ کیا، یہ تو زمیندار کے پنواری سے بھی لڑ پڑتی ہے۔ میرا نام ہوری ہے اور یہ میری دھرم پتنی دھنیا ہے۔''

دسرتھ کو یاد آیا کوئی پستک ''گئودان'' انہوں نے پڑھی تھی۔ اس زمانے میں اس کا بڑا چرچہ تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر سے ہمت یکجا کی اور دریافت کیا ''آپ گئودان'' کے ہوری ہیں یا ''بجوکا'' کے؟''

''نہیں بابو جی، بجوکا میں تو میرا چہرہ بھی بگاڑ دیا ہے۔ میں دھنپت رائے کا ہوری ہوں، دھنپت رائے، ہاں'' اس نے نہایت فخریہ انداز میں کہا۔

دسرتھ نے سوچا کیوں نہیں دھنپت رائے سے ہی مل لیا جائے۔

''بھائی، دھنپت رائے سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے؟''

''بابو جی، آپ اُسی بھومی پر ہیں۔ بس اسی سڑک کے آگے بڑھ جائیں اور سنگم پر چلے جائیں، ہاں یہ ضرور یاد رکھئے گا کہ اب لوگ انہیں پریم چند کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں۔''

دونوں پریم چند کے پاس پہنچے اور اپنی دکھ بھری کہانی سنا ڈالی۔ پریم چند نے انہیں بہت دلاسا دیا۔

''آپ کی جیون کتھا تو سچ مچ بڑی دکھد ہے۔ لیکن—''

دسرتھ نے ملتجیانہ کہا ''کیوں پریم چند جی، آپ لیکن پر کیوں رک گئے؟''

''مہاراج! بات دراصل یہ ہے کہ اب تو لوگ دسرتھ اور کیکئی یعنی کسی راجہ، رانی کا نام سن اور دیکھ کر ہی بدک جائیں گے۔ میں نے کچھ ایسے لوگوں کی جن میں راجپوتوں کی شان اور مریادا کی؟؟ کہانی لکھی تھی

لیکن آج اُسے کوئی نہیں پڑھتا۔ ہاں آپ کسان ہوتے تو شاید لوگ آپ کی کہانی دلچسپی سے سنتے۔ گھسو اور مادھو کی طرح آزاد خیال ہوتے اور کفن کے پیسے سے دارو خرید کر پی جاتے تو بھی میں اپنی کہانی کا آپ کو کردار بناتا۔ آج کے لوگوں کو ایسی ہی کہانی چاہیے، آپ نے جنگ آزادی میں، غیر ملکی یعنی بدیسی چیزوں کے بائیکاٹ میں حصہ لیا ہوتا تو میں آپ پر ایسی کہانی لکھتا کہ سب کو بھول بھال کر لوگ آپ کو یاد کرتے۔ میرے سامنے یہی مسئلہ ہے۔ آپ کے بیٹے اور بہو نے آپ کو گھر سے نکال دیا ہے، اب اس بات سے نئی پیڑھی کو کیا دلچسپی ہے—؟ اور میری کہانی اگر نئی پیڑھی کو پر بھاوت نہ کر سکی، ان کے درمیان مقبول نہیں ہوئی تو لکھنے کا کیا حاصل؟ مجھے شما کریں۔ میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ میں عوام کا خیال رکھتا ہوں۔ آپ نئی کہانی کے لیکھک ورند کے پاس چلے جائیں۔ شاید وہ آپ کو علامت یا استعارہ بنا کر پیش کریں۔

انہیں بڑی نراشا ہوئی لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ اس بار وہ ریل پر سوار ہو گئے اور ریل گاڑی نے انہیں دیس کے سب سے خوبصورت شہر میں پہنچا دیا۔ پر رونق سڑکوں پر گھومتے گھماتے وہ ایک بہت بڑے ہوٹل کے سامنے رک گئے۔ سامنے رنگ برنگی کاروں کا میلہ سا لگا تھا۔ بجلی کی رنگا رنگ روشنی سے آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں۔ کھڑکیوں سے مدھر سنگیت اور پائل کی جھنکار باہر سنائی دے رہی تھی۔ دسرتھ کے جی میں آیا کہ اندر جا کر دیکھیں کیا ہو رہا ہے؟ لیکن گیٹ پر ایک لمبا تڑنگا ساڑھے چھ فٹ کا دربان خاکی وردی میں ملبوس، ہاتھ میں بندوق سنبھالے اور گولیوں کا ہار پہنے کھڑا تھا۔

اس نے دسرتھ کو دیکھا تو سیلوٹ مارا اور راستے سے الگ ہو گیا۔ لیکن دسرتھ وہاں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ تب دربان کو ہوش آیا۔ اس نے دریافت کیا ''آپ لوگ؟''

''ہم کیا ہیں، اس کی چنتا تو بعد میں کرنا بھائی، پہلے یہ بتاؤ یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''سیٹھ جی، ایک فلم کا مہورت ہے مہورت'' دربان نے جواب دیا۔

''کیسی مہورت، کسی کی مہورت؟''

''میں نے کہا نا کہ ایک فلم کی مہورت ہو رہی ہے۔ کیا آپ نے اس فلم کی کہانی لکھی ہے؟ گانا لکھا ہے؟''

''نہیں بھائی! میں تو یہاں خود کہانی لکھوانے آیا ہوں۔''

''اچھا، فلم کا پروڈیوسر ہے؟

''نہیں''

''آپ فلم کا فائنسر ہے؟''

''انہیں ہم تو خود دُکھ کے مارے ہیں۔ والمیکی سے پریم چند تک گیا لیکن کسی نے میری پتا کی کہانی لکھنا منظور نہیں کیا۔''

''ٹھیک، مگر بغیر انٹری پاس کے آپ اندر نہیں جا سکتا''

دسرتھ نے سوچا یہ عجیب یگ ہے۔ کہاں تو اس ملک کے جانور بھی جان خطرے میں ڈال کر دوسروں کی مدد کرتے ہیں اور یہ ہے کہ بغیر پاس کے اندر نہیں جانے دیتا۔ انہوں نے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا ''تم ہمیں اندر جانے دو۔ ہم تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔''

وہ راستے سے الگ ہو گیا۔ دسرتھ اور کیکی اندر داخل ہو گئے۔

لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور پیش قدمی کر کے استقبال کیا۔ سمجھا تھا موٹا مرغا خود سے چل کر وہاں آپھنسا ہے۔ ورنہ ایسے لوگوں کو شیشے میں اتارنے میں بڑے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ کئی لوگوں نے بیئر، جن، شراب پیش کی اور آنے کا مقصد دریافت کرنے کا انتظار کرنے لگے۔

''مجھے بیٹے اور بہو نے گھر سے نکال دیا ہے۔ میں اپنی کہانی لکھوانا یا فلمانا چاہتا ہوں'' دسرتھ نے بغیر کسی تمہید کے اپنی بات کہہ دی۔

''بہت خوب! آپ کے ساتھ یہ کون ہیں؟''

''یہ میری دوسری پتنی ہیں۔ ساری بپتا انہیں سے شروع ہوئی ہے۔ میری پتنی، میرے بیٹے کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ انہوں نے اسے گھر سے نکال دیا اور مجھے بھی اس کے ساتھ آنا پڑا۔ کیسے ساتھ نہ دیتا؟ اس بار مجھے پتی دھرم نبھانا تھا۔''

ایک شخص نے بڑھ کر کہا ''آپ سلیم جاوید صاحبان کے پاس چلے جائیں'' دوسرے نے کہا ''آپ پنڈت مکھ رام شرما سے ملیں''

تیسرے نے پیش کش کی ''آپ چاہیں تو آپ کی پتنی کو کسی فلم میں چھوٹا موٹا رول فی الحال دیا جا سکتا ہے؟

اور اس طرح چھوٹے موٹے رول کرتی ہوئی کیکئی نے فلمی دنیا میں قدم جما لیا۔ اب وہ فلموں کی ہیروئن بن کر آنے لگی۔ پہلے تو شوٹنگ کے سلسلے میں کیکئی ہفتوں غائب رہنے لگی اور پھر بعد میں مہینوں۔ ایک رات دسرتھ اپنے فلیٹ میں آئے تو انہیں ایک خط میز پر پڑا ملا۔ ''میں فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں سوئٹزرلینڈ دو مہینوں کے لیے جا رہی ہوں۔ اب آپ واپس اپنے گاؤں اپنے بیٹے کے پاس چلے جائیں میں نے یہ فلیٹ دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔

اب دسرتھ چوپاٹی پر بیٹھے سمندر کی لہریں گنتے ہیں کہ شاید کوئی ہنومان ان کی کیکئی واپس دلا دے۔ لیکن... وہ یگ بہت پہلے ختم ہو چکا ہے۔

مشتاق احمد نوری

جن کی سواری

آج پھر قمر آرا پر جن کی سواری آئی ہے!

ایسا جب بھی ہوتا ہے پورے گاؤں میں بھونچال سا آجاتا ہے۔ جسے دیکھو وہ اُدھر ہی دوڑا جارہا ہے۔ ان میں بہت سے تو صرف تماش بین ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی جنہیں ان باتوں پر یقین نہیں ہوتا۔ پھر بھی وہ اپنی آنکھ سے دیکھ کر اپنی تشفی کرنا چاہتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کوئی نہ کوئی سوال لے کر جاتے ہیں اور انہیں اس وقت بے حد حیرت ہوتی ہے جب قمر آرا سوال پوچھے بغیر ان کا جواب دے دیتی ہے۔ پہلے تو ہر جمعرات کو یہ سواری آتی تھی اور لوگ بہت پریشان ہوتے تھے۔ شروع میں جن کا تیور بھی بہت اُگر ہوتا تھا۔ سامان اٹھا پٹخ کرنا، توڑ پھوڑ، لوگوں کو دھکا دینا اور گالی گلوج کرنا بھی اس کی عادت میں شامل ہوا کرتا تھا۔ لیکن دھیرے دھیرے اس کا تیور شانت ہوتا گیا اور اس کے مزاج میں شانتی آتی گئی۔

قمر آرا اکرام بابو کی بھانجی ہے۔ اس کی شادی سونار پٹی گاؤں کے محمد بابو کے بڑے لڑکے عباس سے ہوئی ہے۔ اپنے مزاج سے وہ لڑکی بڑی نیک طینت اور گھریلو فطرت کی ہے۔ لڑنا جھگڑنا اس کی فطرت سے باہر ہے۔ وہ اپنے اچھے برتاؤ کی وجہ سے گاؤں بھر میں مقبول بھی رہی ہے۔ اس کا زیادہ تر وقت اپنے عیبال میں ہی گزرا ہے۔ اس لیے وہ فلاں کی بیٹی کے بجائے فلاں کی بھانجی کے نام سے جانی جاتی ہے۔

''یہ جن کی سواری قمر آرا پر ہی کیوں آتی ہے؟''

اس سوال کا جواب تلاشنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ لے دے کر سب یہی کہہ کر خاموش ہو گئے۔

''بھئی یہ تو جن کی اپنی مرضی — وہ جسے بھی منتخب کر لے۔''

گاؤں کے زیادہ تر لوگ کم پڑھے لکھے ہیں۔ آدھی سے زیادہ آبادی تو مزدوروں کی ہے۔ کسان طبقہ کے لوگ واجبی پڑھے لکھے ہیں۔ اس لیے وہ جن کو آدمی سے بھی بڑا تصور کرتے ہیں۔ جنکے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں بھی مشہور ہیں۔ لوگ طرح طرح کے سوالات بھی دریافت کرتے ہیں جنکا انہیں خاطر خواہ جواب بھی ملتا ہے۔ اس طرح دھیرے دھیرے قمر آرا کی اہمیت لوگوں کی نگاہ میں بڑھتی چلی گئی ہے۔

ایک دن میں نے اماں سے کہا۔

''اماں ان سب فضولیات میں گاؤں والے کیوں یقین رکھتے ہیں؟''

''اس سے کیا؟''

''تو سنو، آگے کی نہیں، اس وقت ہماری تہذیب کا یہ عالم ہے کہ گندگی اور گالی جہاں سے شروع ہوتی ہے تو یہ مان لیا جاتا ہے کہ ہمارا محلہ شروع ہوگیا ہے۔ یہاں بات بات پر جہالت کے مظاہرے ہوتے رہتے ہیں۔ اکثر لوگ یہاں بیمار اور لاغر ملیں گے۔ بھوک اور افلاس کے باوجود دے بچے پہ بچہ! یہ اللہ کی دین ہے، مانا لیکن باقی باتوں میں اللہ رسول کی باتوں کا کیا ہوا؟ تعلیم اور ہنر حاصل کرنے سے کیوں گریز ہے؟ کس نے آپ کو ڈاکٹر اور انجینیر بننے سے روک رکھا ہے؟ کس نے کہا کہ آپ عسرت کی زندگی جیتے رہیں؟ کیوں آپ احساسِ کمتری میں مبتلا رہیں؟ کیوں آپ اِدھر اُدھر ادھار اور بھیک مانگتے پھرتے رہیں؟... ہے کوئی انہیں جگانے والا؟ اصل میں ہم میں کوئی لیڈر ہی نہیں ہے! بڑی حد تک یہ کام ملا مولوی کر سکتے ہیں...''

''میرے خیال سے معاملہ کافی گرم ہوگیا ہے، پیارے لال!''

''تو اسے ٹھنڈا کرتے ہیں میرے عزیز!'' کہہ کر اس نے بوتل اٹھائی اور غٹ غٹ کر بیئر گلے کے نیچے اُتار گیا۔

''یہ کچھ بات ہوئی نا!'' بیئر غٹکنے کے بعد سگریٹ جلا کر اس نے ایک گہرا کش لیا۔ دھواں اگلتے ہوئے اس نے کہا۔ ''تم ملا مولویوں کی بات کہہ رہے تھے...''

''ہاں، کہ یہ لوگ ہمیں بیدار کر سکتے ہیں۔''

''غلط کہا تم نے پیارے لال! جو خود ہی سویا ہوا ہو وہ کیا کسی کو بیدار کرے گا؟''

''میں سمجھا نہیں میرے عزیز!''

''سیدھی سی بات ہے کہ ان لوگوں کو پتہ ہی نہیں کہ دنیا کدھر جا رہی ہے۔ ورنہ یہ ضرور بتاتے کہ سائنس پڑھنے سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ خود ہمارے نبی نے علم حاصل کرنے کی تاکید کی ہے۔ طرح طرح کے ہنر سیکھ کر ہم اپنی غریبی کو دور کر سکتے ہیں...'' ٹھہر کر اس نے دوست کو گھورا۔ ''لیکن شاید اس میں ان کا کوئی قصور بھی نہیں ہے۔ کیا ملتا ہے ان لوگوں کو مولوی اور موذن بن کر؟ پانچ سو یا ہزار بارہ سو! وہ بھی وقت پر نہیں۔ اس پر بھی ستم ظریفی یہ کہ لوگ انہیں اپنا غلام ماننے لگتے ہیں... ایک چپراسی کی تنخواہ بھی جب کہ آج کی تاریخ میں تین چار ہزار ماہانہ ہوتی ہے۔''

''سنو، ہم تم تو دینِ محمدی پر چل رہے ہیں نا؟''

''ہم مسلمان ہیں... چلیں گے ہی!''

''اس طرح اسٹرانگ بیئر کو گلے اتار کر؟...'' اس نے بیئر کا ایک گھونٹ لے کر مزید کہا۔ ''سچ بتاؤ کہ ہم کیا دوزخ کی آگ کو اپنے پیٹ میں نہیں بھر رہے ہیں؟... شکر مناؤ کہ اس ملک میں ہم کھلے عام غٹک رہے ہیں۔ کوئی اسلامی ملک ہوتا تو چھپ کر پینے میں بھی روح کانپ کانپ جاتی۔ پیتے ہوئے

بیل گاڑی سے پوٹھیہ سے سونار پٹی جارہی تھی کہ راستے میں ایک جگہ بیل ایسا ہڑکا کہ اس نے آگے جانے سے ہی انکار کردیا۔ بہلوان نے دو چار دوالی جب بیل کو لگائی تو بیل کے پیٹھ پر دوالی کی مار کے نشان ابھر آئے اور وہ درد سے بلبلاتے ہوئے جوا سے کھل کر ہی باہر نکل گیا۔ لیکن گاڑی آگے نہیں بڑھی۔ بہلوان نے بیل کو پکڑا پھر گاڑی میں جوتا اور اسے ذرا چمکارتے ہوئے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اس بار بیل نے تو پوری کوشش کی، زور بھی لگایا لیکن گاڑی ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھی۔

شام کا بیلا پسر چکا تھا۔ گئودھول سے آسمان بھی گرد آلود تھا۔ شفق کی سرخی پر سیاہی غالب آتی جارہی تھی۔ نئی دلہن کی سواری تھی۔ اس طرح سڑک پیڑا پر رُکے رہنا مناسب بھی نہیں تھا۔ اس لیے اب پہلوان کے ساتھ دُولہا عباس میاں کو بھی تشویش ہونے لگی۔ ایک بار عباس میاں نے بھی اپنی سی کوشش کی اور بیل کی راس پکڑ کر بہلوان کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ یہ دونوں بیل ان کے اشارے پر ہوا سے باتیں کرنے کے لیے مشہور تھے۔ اس نے بیل کی پیٹھ سہلائی، اسے تھپتھپایا اور دھیرے سے دُم پر ہاتھ رکھا۔ بیل نے اپنے مالک کے لمس کو پاکر پورا زور لگایا۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔ بیل جوئے سے باہر تھا اور جوا، زمین پر آرہا تھا۔

عباس کی پریشانی بڑھنے لگی۔ نئی دلہن کے سامنے اپنی سبکی کا خیال بھی ستانے لگا۔ راہ چلتے کچھ لوگوں کو پکڑا اور اپنی مدد کی التجا کی۔ گاؤں کے لوگ ایسے معاملے میں بہت فراخ دل ہوتے ہیں۔ دو چار لوگ جٹ گئے اور سب نے مل کر گاڑی کے چکّا میں ہاتھ لگایا۔ بیل نے بھی پوری کوشش کی لیکن گاڑی ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھی۔

اسی دوران ایک سفید سا لمبا سا سایہ لہرا کر غائب ہوگیا۔ جس کی بھی نظر پڑی وہ بھونچکا رہ گیا۔ گاؤں کے لوگ بغیر کچھ بولے کھسک گئے۔ عباس کی نظر بھی اس سایہ پر پڑی تھی وہ بھی قدرے پریشان ہوگیا۔ اچانک اس پورے واقعے میں پہلی بار گاڑی کے اندر سے دلہن کی آواز آئی۔

''گاڑی پوٹھیہ کی جانب موڑلو۔ یہ گاڑی اب سونار پٹی نہیں جائے گی۔''

یہ قمر آرا کی آواز تو تھی لیکن لہجہ بدلا ہوا تھا۔ اس میں ایک خاص وقار، رعب اور ٹھہراؤ بھی تھا۔ اس آواز میں نہ جانے کون سا جادو تھا کہ عباس نے بہلوان کو گاڑی واپس لے جانے کا حکم دیا۔ گاڑی جب واپسی کے لیے روانہ ہوئی تو یہی بیل سے باتیں کررہا تھا۔

دلہن کو لے کر رات گئے جب گاڑی واپس آئی تو گھر کے سارے لوگ پریشان ہوگئے۔ عباس نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ جس نے بھی سنا دنگ رہ گیا۔

لے جائی گئی اور انہوں نے سارا واقعہ سن کر اس راز کو افشا کر دیا۔

''گاڑی کے اندر قمر آرا پر جن کی سواری آئی تھی اور اسی نے اپنی طاقت سے گاڑی کو جام کر دیا تھا۔ دنیا کی کوئی طاقت گاڑی کو آگے نہیں بڑھا سکتی تھی۔ آپ لوگوں نے اچھا کیا کہ اس کے حکم کی تعمیل کی ورنہ...''

اور یہ ''ورنہ'' پھیل کر خوف کے ایک بہت بڑے دائرے میں تبدیل ہو گیا۔ بس وہ دن — اور آج کا دن — جن کی سواری کے لیے قمر آرا پورے گاؤں میں مشہور ہو گئی اور لوگوں کو جمعرات کا انتظار رہنے لگا۔

ویسے گاڑی واپس آنے کے بعد گاؤں میں عورتوں کے درمیان طرح طرح کے چرچے بھی شروع ہو گئے۔ اس میں نصیبن بوا، سب سے آگے تھی۔ گفتگو کا نتیجہ اس بات پر ٹھہرا کہ قمر آرا کا چکر ضرور گاؤں کے کسی نوجوان کے ساتھ رہا ہوگا۔ اس لیے وہ اپنی سسرال نہیں جانا چاہتی اور جن کا ڈرامہ کر کے وہ کسی نہ کسی طرح گاؤں میں ہی رہنا چاہتی ہے۔ لیکن ہزار کوشش کے باوجود اس خاص لڑکے کو تلاش کرنے میں سب ناکام رہے اور یہ معاملہ ایک روز اچانک ختم ہو گیا جب ایک جمعرات کو قمر آرا کی سواری نے نصیبن بوا کو آڑے ہاتھوں لیا۔

دراصل ہوا یوں کہ جمعرات کا دن تھا۔ عصر کی نماز پڑھ کر ابھی مصلی گھر کو واپس بھی نہ ہوئے تھے کہ جن کی سواری آ گئی۔ دیگر عورتوں کے ساتھ نصیبن بوا بھی یہ تماشہ دیکھنے پہنچی۔ انہیں دیکھ کر قمر آرا نے کہا۔

''کیوں جی نصیبن — قمر آرا کا چکر کس نوجوان سے ہے؟ اری کم بخت اپنے خصم کو کھا کر بھی ہوش نہ آیا۔ اپنی بیٹی پر توجہ کیوں نہیں دیتی۔ جو ہفتہ دن کے اندر مجید کے بیٹا کے ساتھ بھاگ جائے گی۔''

یہ سن کر ایک ہنگامہ ہو گیا۔ انکا ڈنکا لوگوں کو مجید کے بیٹا کا چکر تو معلوم تھا، اب سب کی زبان پر اس بات کا چرچا ہو گیا اور لوگوں کی حیرت کی انتہا تب نہ رہی جب واقعی ایک ہفتہ بعد نصیبن کی بیٹی مجید کے بیٹے کے ساتھ بھاگ گئی۔

گاؤں کے لوگوں میں یہ بات زور پکڑ گئی کہ قمر آرا کا جن جو بھی بولتا ہے، بالکل سچ بولتا ہے۔ پھر کیا تھا دور دراز کے گاؤں کے لوگ بھی جمعرات کے انتظار میں رہنے لگے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ جمعرات گزر گیا اور سواری نہیں آئی۔ اب ہر جمعرات کے بجائے مہینے میں دو بار یا پھر حد سے حد تین بار سواری آنے لگی۔ لوگ اپنے مسائل لے کر اس کے پاس آتے اور وہ سب کو مسائل کا حل بتا دیتی۔ اس کے بتائے راستے پر چل کر بہتوں کا بھلا ہوا۔

اس جن کے بارے میں بھی طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں اور یہ سب کی سب لوگوں کے اپنے قیاس پر مبنی تھیں۔ کوئی کہتا کہ شاہ جن کی سواری آتی ہے کسی کا خیال تھا کہ کسی ملنگ کی سواری ہے۔ کوئی اسے کسی بزرگ کی روح بتاتا کوئی پریت آتما کہتا اور کوئی ان سب کو صرف ڈھونگ کہتا۔ غرض کہ جتنا منہ اتنی

باتیں۔ جن کی سواری طرح طرح کے انکشافات بھی کرتی۔ پڑوس کے سراہا گاؤں کے انوار کی بیوی نے سوال کیا۔

''مجھے بچہ کب ہوگا؟''

''جب تمہارا میاں تمہارے ساتھ سوئے گا۔'' یہ جواب سن کر موجود لوگوں میں قہقہہ بلند ہوا۔ پھر قمر آرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا میاں تم سے زیادہ رنڈی کے پاس سوتا ہے۔ اسے اپنے پاس سلا۔ اگلے سال تمہیں بیٹا ہوگا۔''

اس طرح انوار میاں کے لچھن جگ ظاہر ہوگئے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ اپنی بیوی کے پلو سے بندھ گئے۔ کچھ لوگوں نے تو یہ بھی بتایا کہ قمر آرا کے جن نے انوار کی بیوی کو ایک تعویذ بھی دیا تھا جس کے اثر سے وہ بیوی کے غلام ہوگئے تھے۔

ایک صاحب کے گھر سے ان کی بیوی کے سارے زیورات چوری ہوگئے۔ وہ بے چارے پریشان ہوکر جمعرات کا انتظار کرنے لگے۔ جیسے ہی سواری آئی، وہ دوڑے ہوئے قمر آرا کے پاس گئے۔ اس نے ان کے حواس باختہ چہرے کو دیکھتے ہی کہا۔

''کیوں پریشان ہورہے ہو۔ تم نے کوٹھی کے اندر چاول میں چھپا کر رکھا تھا۔ زیور کی پوٹلی ــــ؟''

سب حیرت زدہ کہ جن کو یہ راز کیسے معلوم ہوگیا اور اس نے بن سوال کئے ہی جواب کیسے دے دیا۔

''ہاں ہاں، چاول میں چھپا کر رکھا تھا'' اس نے جلدی سے جواب دیا۔

''تمہارے بڑے بیٹے نے پوٹلی چرائی ہے۔ ابھی اسی کے پاس ہے۔ اس کا ٹین کا بکس دیکھو، وہیں رکھی ہے پوٹلی ــــ'' پھر اس نے تاکید بھرے لہجے میں کہا۔

''اسے جوئے کی لت پڑگئی ہے۔ اسے روکو ورنہ وہ ایک دن سارا گھر بار ہی جوئے میں ہار جائے گا۔'' یہ تو سب جانتے تھے کہ ان کا بڑا بیٹا گاؤں کا سب سے بڑا جواری ہے۔ بیٹے کے گھر سے ہی زیور برآمد ہوگیا اور قمر آرا کے جن کی دھاک پورے گاؤں میں بیٹھ گئی۔

میں گاؤں میں کم رہتا تھا۔ لیکن جب بھی آتا مجھے ایک ایک واقعہ کی خبر ہوتی رہتی۔ میری اماں چونکہ اس کی بڑی معتقد تھیں اس لیے بڑے احترام سے ساری کہانیاں سناتیں اور مجھے تاکید بھی کرتیں کہ ایک بار میں بھی اس سے مل لوں۔

اس بار جب میں گاؤں پہنچا تو دو چار روز رکنے کا اتفاق ہوا اور اسی دوران جمعرات کا دن بھی آگیا۔ اس روز مغرب کی نماز کے بعد جن کی سواری آئی اور میری اماں یہ سنتے ہی جھٹ قمر آرا کے آنگن کی جانب لپک پڑیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ افسردہ واپس آئیں اور وہاں کے واقعات سناتے ہوئے بولیں۔

''چھی چھی کیسا زمانہ آ گیا ہے بیٹا۔''

''کیا ہو گیا اماں—؟''

''ارے تم رشید کو جانتے ہو نا؟''

''ہاں اماں، بہت سیدھا سادا لڑکا ہے۔''

''ارے خاک سیدھا سادا ہے۔ اس کے کرم کو تو آج قمر آرا کے جن نے کھول کر رکھ دیا۔''

''آخر ہوا کیا؟''

''ارے ہوگا کیا— اسے تو سب بہت شریف جانتے تھے۔ اس کا چکر تو علیم کی بیٹی سے ہے۔ ارے حد تو یہ ہے کہ بیٹا اس کا ایک پیٹ، وہ کم بختی کا مارا فارس گنج لے جا کر گروا چکا ہے۔''

''یہ سب جھوٹ ہے اماں— رشید ایسا کر ہی نہیں سکتا۔''

میں بچپن سے اسے جانتا تھا، وہ میرا اچھا دوست بھی ہے۔ اس لیے میں نے اپنا دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔ لیکن اماں اسے ماننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ میں نے پھر اپنی دلیل دی۔

''اماں آپ بھی کیا لغو باتوں میں الجھ رہی ہیں۔ یہ جن نہ ہوا کوئی پیر اولیاء ہو گیا۔ میں یہ کیسے مان لوں کہ وہ جو بھی بول رہا ہے وہ سچ ہی ہے۔؟''

لیکن اماں نے میری بات اَن سنی کرتے ہوئے پورے یقین سے کہا۔

''بیٹا قمر آرا، کا جن آج تک جھوٹ نہیں بولا۔ اس کا کہا اب تک تو سچ ہی نکلا ہے۔ وہ بھلا کیوں جھوٹ بولنے لگا؟ اور یہ تو سب جانتے ہی ہیں کہ رشید کا علیم کے یہاں بہت آنا جانا ہوتا تھا۔''

میرے یقین میں اب دراڑ پڑنے لگی۔ اماں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''بیٹا آج تو بھی گاؤں میں ہے اور سواری بھی آئی ہے۔ میں تو کہتی ہوں چل تو بھی چل کر اپنی آنکھوں سے سب دیکھ لے پھر میری باتوں کا یقین تجھے بھی آ جائے گا۔''

اماں کی بات سن کر میرے اندر کچھ الٹ پلٹ ہونے لگا۔ میں نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔

''نہیں اماں— میں نہیں جاؤں گا۔ اس نے کچھ ایسا ویسا کہہ دیا تو—؟''

''ارے بیٹا وہ بھلا تمہارے بارے میں کیا کہہ سکے گا۔ کون نہیں جانتا کہ پورے گاؤں میں تمہارا کوئی ثانی نہیں ہے۔ تمہارے جیسا بیٹا اور کوئی عورت جَن کر تو دیکھے۔ چاند میں داغ ہو تو ہو مگر میرا چاند تو بے داغ ہے۔ تو چل تو سہی خود اپنی آنکھوں سے سب دیکھ لے گا—''

لیکن ہزار کوشش کے باوجود میں خود کو وہاں لے جانے کے لیے تیار نہیں کر پا رہا ہوں۔ دل میں بس ایک ہی خوف ہے جو میرے پاؤں پکڑے ہوئے ہیں۔

''کہیں اس نے واقعی سب کچھ سچ سچ بتا دیا تو—''

انتظار

آنکھ کھلی تو اس کا بستر خالی تھا، اسے یاد آیا بچی تو شاید رات دادی کے ساتھ ہی سوگئی تھی— اس نے لیمپ کی ہلکی زرد روشنی میں دیوار گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی تو رات کے بارہ ہی بجے ہیں، اتنی جلد وہ سو بھی گئی اور جاگ بھی گئی— اب بھلا نیند کیسے آئے گی—؟ اپنی اُداسی اور تنہائی اُسے کھلنے لگی۔ کچھ دیر پہلے وہ کیسی خوشگوار نیند سو رہی تھی، وہ کہاں پہنچ گئی تھی، اپنے گھر میں— جو، اب اس سے کافی دور ہو چکا ہے۔ جب سے جنگ کے بگل بج گئے تھے۔ اسے اپنا مائیکہ— وہاں کے لوگ ہمیشہ کے لیے بچھڑتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ کوئی ہندوستانی بھلا کب یہ چاہے گا— کون اپنے سر کو اس کی خاطر اکھلی میں ڈالے گا— شاید وہ بھی نہیں چاہے گی کہ ایسے منتشر ماحول میں وہ اس دیس کو اپنا وطن کہے جو اس کا وطن ہوتے ہوئے اب اس کے لیے پرایا ہی نہیں، اجنبی ہی نہیں، دشمن ہوا جارہا ہے— مگر یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ان دو قریبی دیسوں میں دشمنی آخر کس بات کی ہے—؟ یہ رشتے سلجھتے سلجھتے پھر کیوں الجھ گئے— وقتی طور پر یہ سن کر وہ کیسی مسرور ہوئی تھی، اس کا خاوند بھی کتنا ہشاش بشاش تھا۔ اسی نے اسے بتایا تھا:

''سنتی ہو تہمینہ! اب ویزا اور پاسپورٹ اٹھ جائے گا، جب جی چاہے گا تم اپنے میکے گھوم آؤ گی—''

مگر یہ خواب، خواب ہی رہ گئے— آج سویرے جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو وہ کچن سے دوڑ کر لپکی، وہ اپنے ابا حضور (خسر صاحب) کے لیے ٹی پاٹ سے چائے انڈیل رہی تھی، اُسے اتنا بھی برداشت نہیں ہو سکا کہ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی، پہلے چائے تو دے لے، گھنٹی تو بجتی ہی رہے گی اور اگر کٹ بھی گئی تو پھر آجائے گی، مگر ایسے موقعوں پر پتہ نہیں کیوں وہ ایسی بے اختیار ہو جاتی ہے کہ کبھی کبھی بچوں کی سی حرکت کر جاتی ہے۔ شاید ایک بچی کی ماں بن کر بھی وہ ابھی تک بچہ ہے۔ ریسیور اس کے ہاتھ میں تھا، ممی کی نحیف آواز اس کی سماعت کو چھو رہی تھی: ''بیٹی! تمہارے ابو کی حالت بہت سیریس ہے، بیمار تو وہ برابر تھے مگر اس بار...''

ممی پھپھک پھپھک کر رو رہی تھیں اور دوسری طرف بیٹی نزدیک ہوتے ہوئے بھی، اتنی دور، اتنی مجبور تھی کہ صرف تڑپ کر رہ گئی— چائے ملنے میں جب کافی دیر ہوگئی تو سسر جی بستر سے اٹھ کر کچن میں پہنچ گئے تھے اور خود سے چائے بنانے کی کوشش کر رہے تھے— انہیں حیرت اور غصہ بھی آرہا تھا کہ ''یہ کیسی لاپرواہی آگئی ہے۔ بہو میں کہ دودھ اور چینی کا بھی کچھ خیال نہیں— اور اللہ جانے وہ کیا کیا سوچ رہے تھے کہ اُسے دیکھ کر ٹھٹھک گئے— بہو کی آنکھوں سے آنسو کی لڑیاں بن بن کر ٹوٹ رہی تھیں، جنہیں وہ اپنے دوپٹے کے پلو میں چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی— ''کیوں، کیا ہوا—؟ خیریت تو ہے—؟''

''بابا کی حالت— بہت سیریس ہے— وہ ہسپتال میں—'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بتا رہی تھی اور دوبارہ چائے بنانے میں مصروف ہو چکی تھی— وہ اس کے سر پر شفقت کے ہاتھ پھیرتا ہوا شرمسار لہجے میں اُسے

تسلی دے رہا تھا: ''کیا کرو گی بیٹی! ہر آدمی کی عمر کا ایک وقت ہوتا ہے، ہم لوگ اب پکے ہوئے آم ہیں، کب پیڑ سے گر جائیں کچھ کہنا مشکل ہے—'' پھر کچھ وقفے کے بعد ''آج میں زاہد سے تمہارے ویزا پاسپورٹ کے سلسلہ میں بات کرتا ہوں— ذرا مجھے دفتر میں یاد دلا دینا—''

''شکریہ ابا حضور!'' اس نے متشکر نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے چائے کی پیالی اُن کے ہاتھوں میں تھما دی، اس گھر میں اس کے جذبات کا لحاظ سب سے زیادہ شاید ابا حضور کو ہی ہے—

شام میں جب اُس نے ویزا کے لیے پوچھا تو انہوں نے متفکر لہجہ میں جواب دیا:

''بیٹی! ان دنوں دونوں ممالک کے رشتے پھر بگڑ گئے ہیں، ابھی وہاں جانا دانشمندی نہیں ہے— لوگ بتا رہے تھے کشمیر کو لے کر—

''بھاڑ میں جائے یہ کشمیر—'' اس نے جھنجھلا کر دل ہی دل میں سوچا ''کشمیر سبھوں کے لیے ''جنت نشاں'' ہے مگر میرے لیے تو جہنم زار ہے، جس کو لے کر دونوں ملک کے Relation برابر گڑبڑ رہتے ہیں۔ کاش! ابو نے شادی سے پہلے اس پہلو پر بھی غور کیا ہوتا—'' اِدھر کچھ دنوں سے اپنے والدین کی جدائی اُسے بہت کھل رہی تھی، خاوند بھی اکثر چڑچڑایا رہتا۔ نوکری پیشہ کے لیے تو اور بھی آفت ہے۔ وہ بھی سرکاری ملازم دونوں ملکوں کے بیچ جب عام خطوط سنسر ہوتے ہیں تو بھلا فون کا آئے دن آنا اور اس کی بیوی کا وہاں برابر جانا کیا شک وشبہات کے جال نہیں پھیلا سکتا—؟'' وہ اکثر سوچتا کبھی کبھی بیوی پر اظہار بھی کر دیتا ''دوست دشمنوں کا کیا ٹھکانہ ہے— کب کس کو کس بہانے پھنسا دے— اسے اپنے بے قصور دوست کا محض شک کی بنا پر Suspend ہو جانا اکثر یاد آجاتا، نوکری سے برطرفی اور مسلسل جرح وتکرار سے بیچارہ ابنارمل سا ہو گیا تھا، کتنے دن لگ گئے اُسے اپنی صفائی پیش کرنے میں— وہ اکثر بیوی کو سمجھاتا۔ ''تم سمجھدار ہو، ان پہلوؤں پر بھی ذرا غور کرو تہمینہ! عام عورتوں کی طرح صرف جذبات میں نہ بہو—'' وہ کبھی ان باتوں کو سمجھتی اور کبھی سمجھ کر بھی سمجھنا نہیں چاہتی— وہ اندر سے ایسی بے اختیار ہو جاتی کہ— عقلمندی کی ساری باتیں لمحے بھر کو بھول جاتی، اس کی خواہش ہوتی کاش! وہ اڑتی ہوئی مخلوق ہوتی اور جب سب لوگ سو جاتے تو وہ اڑ کر وہاں پہنچ جاتی اور سبھی اپنوں سے مل ملا کر اُڑان بھر کر پھر واپس اپنے گھر کو آجاتی۔ اُسے کہانی کی وہ پری یاد آجاتی جو سوتے ہوئے خاوند کو چھوڑ کر ہر رات راجہ اندر کی محفل میں جا کر ناچتی تھی اور صبح ہوتے ہی واپس آکر بستر میں سو جاتی مگر شہزادی کا انجام کتنا کربناک تھا۔ وہ ٹھنڈی آہیں بھر کر انجام پر غور کرتی مگر کچھ ہی دیر میں پھر پرانی ڈگر پر سوچنے لگتی:

''بابل کے گھر اور پیا کے گھر میں تو پیار اور اپنا پن کا رشتہ ہونا چاہیے تھا مگر وہ بدنصیب تو شروع سے ہی...'' اسے اپنے نکاح کا وہ مبارک دن یاد آیا جب دو دیسوں کے درمیان دولہا دلہن دونوں سجائے گئے۔ بارات آئی، ڈھول باجے بجے مگر دولہا دلہن میں ملاپ ہوا تو کہاں، بھلا ٹیلیفون کے وائر پر— لوگ باگ قہقہے لگا رہے تھے اور وہ اُداس تھی، سنجیدہ تھی، جذبات اتھل پتھل ہو رہے تھے مگر صرف الفاظ ایک دوسرے کو سنائی پڑ رہے تھے— ''قبول کیا—؟ ہاں میں نے قبول کیا—'' دونوں فریقین کے رشتے کو قبول کر لینے

کے بعد ہر طرف سے مبارکبادیاں دی جانے لگی تھیں مگر وہ اس روز بھی رو رہی تھی — اور آج بھی اس کی آنکھوں میں پچھتاوے کے آنسو ہیں — صبح کے نو بج رہے تھے۔ بٹی بستر سے اتر کر ''امی امی'' کہہ کر رونے لگی تھی۔ وہ اپنا رونا بھول کر اپنی بٹی کے آنسو پونچھنے لگی، بہلا دھلا کر اس کے منہ میں دودھ کی بوتل دے کر وہ خود بننے سنورنے لگی تھی کہ اس گھر میں کوئی اُسے اُداس دیکھنا نہیں چاہتا ہے۔ اُسے اُداس اور غم زدہ دیکھ کر پورے گھر کا مزاج درہم برہم ہوجاتا ہے۔ دراصل اس گھر میں اب اس کی حیثیت اس اہم پُرزے کے جیسی تھی جس کے ذرا دیر بیٹھ جانے سے خانہ داری کی مشین ہی گھڑگھڑانے لگتی ہے۔ کوئی دوسرا پرزہ گھر داری کی اس مشین کو اس طرح بحسن وخوبی چلا ہی نہیں پاتا — اس کے خاوند سے زیادہ اس کے گھر کے اور لوگ اس کے محتاج ہوگئے تھے۔ خاوند تو برابر باہر ہی باہر رہتا ہے، نوکری ہی ایسی جو تھی — اپنے ساتھ بھی نہیں رکھ پاتا کہ ہر وقت ٹور میں وہ بیوی کو کہاں کہاں ڈھوتا چلتا۔ شاید گھریلو ذمہ داری سے بھاگنے کا یہ بھی ایک اچھا طریقہ تھا — وہ کبھی کبھار جاتی بھی تو ہوٹل میں ایک ڈیڑھ ہفتہ رہ کر اُسے واپس اصلی گھر آنا پڑتا جہاں ساس اور سسر اس کے انتظار میں آنکھیں بچھائے ہوتے۔ اب وہ انہیں لوگوں کے پیار میں اپنا ہر غم غلط کرنا سیکھ گئی تھی مگر آج تو — آج تو — پھر وہ بے اختیار ہو رہی تھی ''ابو، میرے اچھے ابو، اپنی بٹی کا انتظار کرنا، وہ ہر باندھ کو توڑ کر تم سے ملنے ضرور آئے گی — ابو میرے پیارے ابو —'' وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہی تھی اور آنکھیں موسلا دھار بارش کا سماں پیش کر رہی تھیں — اس نے سوچا وہ اپنے خاوند کو فون کر کے بتا دے کہ ''بھائی! ایک بار تو ساتھ چل کر ابا اماں کو خوش کر دو، ہم دونوں کی جوڑی کو انہوں نے صرف تصویر میں ہی دیکھا ہے — اب تو ایک بچی کے باپ بھی ہوگئے، ایک باپ کے جذبات کو سمجھنے کی —'' پھر اُسے لگا یہ سب احمقانہ باتیں ہیں، اس کا خاوند بڑے مضبوط دل گردے کا آدمی ہے یا پھر اس کی مجبوری نے اسے پتھر دل انسان بنا دیا ہے — اُسے یاد آیا شادی کے فوراً بعد وہ کتنے پیار سے اُسے اپنی مجبوری بتاتا تھا لیکن ان دنوں تو وہ فوراً گرم ہوجاتا ہے۔ اچھی سی اچھی بات گرم توے پر گرتی ہوئی بوند کی طرح بخار بن کر اڑ جاتی ہے اور کہنے والا اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہے — اس کی ماں نے ایک بار کچھ کہا تھا تو کس قدر تلخی سے اس نے جواب دیا تھا:

''آپ لوگوں کو بچپن میں لگی ہوئی منسوب کا اگر اتنا ہی لحاظ تھا تو پھر ان تمام لوگوں کو ہی یہاں بسا لیتے یا پھر خود ہی وہاں جا بستے — یہ تو آسان نہیں تھا، آسان تو صرف شادی کر دینا ہے — دل ملے یا نہ ملے، مگر شادی ضرور ہو —'' وہ اکثر غصے کی حالت میں ایسی بہکی بہکی باتیں اپنی بیوی کو بھی بلا جھجک کہہ سناتا تھا — شاید اسی لیے اب وہ اپنا درد کسی سے بانٹتی نہیں، وہ جانتی تھی کہ یہ درد، بس اسی کا مقدر ہے۔ اس لیے جب بھی والدین کے فون آتے تو تھوڑی دیر وہ چھپ کر آنسو بہا لیتی۔ پھر نارمل ہی نہیں بالکل نارمل ہوجاتی — مگر آج اپنے ابا حضور کی سیریس بیماری کا سن کر وہ بے قابو ہو رہی تھی، اور فوراً پنکھ لگا کر اڑ جانے کو تیار تھی۔ گھر والے بھی جانے کی اجازت فوراً ہی دے چکے تھے مگر پاسپورٹ ویزا — ساتھ کون جائے — چھوٹی بچی — یہ سب انگنت بکھیڑے تھے جن کو حل کرتے کرتے بھی تقریباً بیس دن لگ ہی گئے — ساتھ

جانے کے لیے بھی خاوند کا چھوٹا بھائی تیار ہوگیا تھا— وہ اپنی بچی کے ساتھ جانے کی پوری تیاری کر چکی تھی، کبھی خوش ہوتی کبھی اُداس، کبھی موجودہ ملکی حالت کو محسوس کر کے خوف کھاتی اور کبھی نڈر ہو کر سوچتی ''جانا تو ہے ہی۔ ماں باپ سے بھی بڑی کوئی چیز ہے دنیا میں—'' اِدھر ایک مدت سے ان لوگوں کے خطوط بھی یہاں نہیں آرہے تھے، دراصل اس نے خود ہی منع کر دیا تھا اور بظاہر خود بھی ترکِ تعلق بنا رکھا تھا۔ دراصل جب سے اس کے خاوند کا دوست محض شک کی بنا پر مبتلائے بلا ہوا تھا، گھر کے تمام لوگ چوکنا ہو گئے تھے— کونے کھدرے میں جہاں جہاں اس کے مائیکے کے خطوط چھپے ہوئے تھے۔ کئی روز کی کھوج کھاج کے بعد ان تمام خطوط کو یکجا کر کے آگ دکھا دیا گیا۔ اس وقت اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی لیکن وہ سب کچھ بڑے صبر سے سہہ گئی تھی کہ اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا تھا— پیار کو دھوئیں اور سیاہی میں بدلتے دیکھ کر اس کے دل سے آہ نکلی تھی— ''کاش! وہ ان دونوں پڑوسی ملکوں کے رشتے کو خوشگوار بنا سکتی— اس نے کبھی سوچا تھا اس کے جب دو بیٹے ہوں گے تو ایک کا نام وہ ہندوستان رکھے گی اور دوسرے کا پاکستان۔ کتنی مماثلت ہے دونوں ناموں میں، مانو واقعی دونوں بھائی جو لڑ جھگڑ کر پھر ایک ہو جاتے ہوں— مگر اب تو ایسا لگتا ہے اس کی یہ حسرت— حسرت ہی رہ جائے گی—''

کل صبح اسے دہلی کے لیے روانہ ہونا ہے اور پرسوں شام میں ہی وہاں کے لیے فلائٹ کا ٹکٹ لیا جا چکا ہے۔ وہ اپنے سسر، ساس اور دیور کی بیحد ممنون و مشکور تھی جن کی انتھک کوششوں سے سب کام جلدی جلدی ہو گیا تھا— ننھی بچی کو بار بار دادی پیار سے چوم رہی تھیں اور بہو کو مستقل سمجھا رہی تھیں ''جلدی آجانا بیٹی، تمہارے بغیر تو یہ گھر— گھر ہی نہیں لگتا ہے—'' وہ ہنس کر جواب دیتی۔

''ہاں ممی! میں خود اس بات کو سمجھتی ہوں مگر اس بار پتہ نہیں کیوں میں اندر سے بہت نروس ہوں— ارشد آئیں گے تو آپ لوگ بھی کوشش کیجئے گا کہ کم از کم ایک بار وہ بابا حضور کی موجودگی میں اپنی سسرال ہو لیں— ابا کی بے حد خواہش ہے انہیں دیکھنے کی—'' اس کا جملہ مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ دیور نے ڈانٹ پلائی ''آپ پھر بچوں جیسی باتیں کرنے لگیں بھابھی! کیا آپ نہیں جانتیں—؟'' تلخ جواب سن کر اسے برا تو لگا مگر وہ تو اس کی عادی ہو چکی تھی، اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا اور اپنے خوابوں کی دنیا کو ایک بار پھر اپنے ہاتھوں سے ادھیڑ رہی تھی کہ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی— اس نے ہڑبڑا کر بے وقت آئی ہوئی گھنٹی کو لبیک کہا اور ٹیلیفون کا چونگہ ہاتھ میں سنبھالتے ہوئے ہی وہ بے بسی سے رونے لگی تھی: ''ہائے ابا حضور چل بسے— اب تو میں مرا ہوا چہرہ بھی نہ دیکھ پاؤں گی، اللہ میاں کم از کم تین دن کی زندگی تو اور دے دیے ہوتے—'' جھڑ جھڑ آنسو اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ دوسری جانب سے درد بھری آواز آرہی تھی— مرتے وقت بھی ان کی آنکھیں دروازے پر ہی لگی ہوئی تھیں— اور زبان پر تمہارا نام—'' روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں، وہ ٹیلیفون اپنی ساس کے ہاتھوں میں تھما کر خود نہایت بے صبری کے عالم میں مصلّی بچھا کر دعائے مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھا چکی تھی، اس کے کانوں میں باپ کی پیاری آواز گونج رہی تھی اور دماغ شائیں شائیں کر رہا تھا۔

سلطان سبحانی

مجسّموں کے شہروں کا منظر نامہ

ہال میں جب کافی لوگ جمع ہو گئے تو سیاح نے کہنا شروع کیا۔

''حضرات! میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ سب میرے نئے سفر کا حال جاننے کے لیے کافی بے چین ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو اپنے نئے سفر کا منظر نامہ بیان کرنے کا میں خود بھی بہت مشتاق ہوں کیونکہ یہ میری زندگی کا سب سے حیرت انگیز سفر ہے۔ اتنا حیرت انگیز کہ اگر کوئی سنگی مجسمہ بھی سنے تو ''یا مظہر العجائب'' کہہ کر گر پڑے۔ حضرات، اس سفر نامہ کو پیش کرنے سے پہلے میں یہ بات صاف کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ سیاحت نگاری کے فن سے مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں بس ایک سیاح ہوں لہٰذا اگر میرے سفر نامہ میں رپورتاژ یا روداد کی بجائے داستانی طرزِ ادا در آئے تو یہ سمجھئے کہ یہ آج کل کے سفر ناموں کے مطالعہ کے عجیب وغریب اثرات ہیں، دیس دیس کی ہواؤں کے نہیں!

ہاں تو حضرات... اب آپ اپنا اپنا دل تھام لیجئے اور سنئے کہ اس بار میں سیاحت کی غرض سے ایک ایسے دیس میں پہنچا جہاں عبادت گاہوں کی تعداد عبادت گزاروں سے بہت زیادہ تھی اور عبادت گاہوں سے زیادہ تعداد سیاست دانوں کی تھی اور چونکہ سیاست دانوں کی تعداد عبادت گاہوں سے زیادہ تھی اس لیے نئی عبادت گاہوں کی تعمیرات بھی جاری تھیں۔ میں متحیر تھا کہ عبادت اور سیاست کا تو کوئی تال میل ہے ہی نہیں، پھر یہ دریا دلی کیوں؟ میں اس مسئلہ پر کئی دنوں تک غور کرتا رہا۔ آخر میری سمجھ میں یہ نکتہ آ ہی گیا کہ نئی تعمیرات کا مقصد صرف یہ ہے کہ مخدوش عبادت گاہوں کی تعداد کسی طرح سیاست دانوں کی تعداد کے ہم پلہ ہو جائے تاکہ ہر سیاست داں اپنی حکومت بنانے کا دعوے دار ہو سکے۔ حضرات، میں نے ساری دنیا کی سیاحت کی لیکن حکومت قائم کرنے کا اتنا آسان طریقہ اور کہیں نہیں دیکھا۔ خیر... یہ تو تمہید ہے اس سفر نامہ کی۔ اب آگے سنئے کہ چند دنوں بعد اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز پہلو میرے سامنے یہ آیا کہ عبادت گاہوں اور سیاست دانوں سے زیادہ تعداد تو یہاں مجسموں کی ہے۔ میں جس طرف بھی نگاہیں اٹھا کر دیکھتا مجھے مجسمے ہی مجسمے کھڑے ہوئے نظر آئے۔ میں حیران رہ گیا اور سوچنے لگا کہ اتنے سارے مجسموں کا مصرف کیا ہے؟ کیا یادگاروں اور عقیدتوں کو قائم اور تازہ رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کی تعداد عبادت گاہوں سے بھی زیادہ ہو جائے۔ ان حالات میں پھر سیاست دانوں کا کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر مجھے سیاست دانوں سے ہمدردی ہونے لگی لہٰذا میں نے انہیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اُن کا جائزہ لیا تو مجھے تعجب ہوا کہ وہ کافی مطمئن اور بشاش تھے اور انہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ شاید وہ اپنے لیے مناسب جگہوں کا تعین بہت پہلے کر چکے ہیں۔ اس بات پر میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ چند ہی روز میں مجسمے دیکھ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ مجھے

یہ احساس رہ رہ کر ستانے لگا کہ میں سیاح نہیں بلکہ کوئی تماشائی ہوں اور کسی بہت بڑے میوزیم میں گھوم رہا ہوں۔ یوں تو میں نے روم اور یونان وغیرہ میں بھی بہت سارے مجسمے دیکھے تھے لیکن اتنے نہیں کہ انہیں دیکھ کر میں اپنا ذوقِ سیاحت بھول جاؤں۔

حضرات! تھوڑے ہی دنوں میں ان مجسموں کی بہتات کا مجھ پر نفسیاتی ردِ عمل یہ ہونے لگا کہ میں گھبرا کر کوئی ایسی جگہ ڈھونڈھنے پر مجبور ہو گیا جہاں کوئی مجسمہ نہ ہو اور جہاں میں اطمینان سے بیٹھ کر اس سرزمین کے اور دوسرے مناظر سے بھی محظوظ ہو سکوں۔ یہ سوچ کر میں صبح سویرے اپنی قیام گاہ ''گرین ہوٹل'' سے چل پڑا مگر افسوس کہ ایسا کوئی گوشہ مجھے نظر نہیں آیا۔ ہر شاہراہ اور ہر گلی کے نکڑ پر، پولس اسٹیشن، کورٹ، بس اسٹینڈ، اسکول، کالج، ریلوے اسٹیشن، یہاں تک کہ سنیما گھروں کے احاطوں میں بھی مجسمے ایستادہ نظر آئے اور شام میں جب میں نروس ہو کر اپنی قیام گاہ کی طرف واپس ہو رہا تھا تو اندھیرا ہونے کی وجہ سے یا نروس ہونے کی وجہ سے میں اپنی قیام گاہ کا راستہ بھول گیا۔ مجھے اس بات کا بہت افسوس ہوا کہ ان مجسموں کی وجہ سے میں اپنا ذوقِ سیاحت تو درکنار اپنی قیام گاہ کا راستہ بھی بھول گیا۔ نظریں اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو روڈ کے کنارے اندھیرے میں مجھے دو آدمی کھڑے ہوئے دکھائی دیئے۔ سوچا کہ اپنی قیام گاہ کا راستہ انہیں سے پوچھ لوں۔ لہٰذا میں لپک کر ان کے قریب گیا اور میں نے ان سے کہا۔

''سنئے! میں گرین ہوٹل کا راستہ بھول گیا ہوں۔ وہ کس طرف ہے؟'' جواب میں انہوں نے کچھ نہ کہا۔ میں نے دوبارہ کہا۔ ''میں آپ دونوں سے پوچھ رہا ہوں کہ گرین ہوٹل کس طرف ہے؟'' اس بار بھی وہ خاموش رہے۔ میں نے زور سے کہا۔ ''آخر آپ لوگ خاموش کیوں ہیں؟ کیا میری زبان آپ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے؟ جناب! میں آپ سے گرین ہوٹل کا راستہ پوچھ رہا ہوں۔''

لیکن اس بار بھی انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے ذرا کھسیا کر کہا۔ ''میرے ساتھ آپ لوگوں کا یہ سلوک انتہائی نامناسب ہے۔ میں ایک اجنبی سیاح ہوں، اگر مجھے راستہ بتلا دیں گے تو اس میں آپ کا کیا بگڑ جائے گا؟'' اتنے میں ایک سائیکل سوار نے قریب آ کر مجھ سے کہا۔ ''آپ کو کہاں جانا ہے، مجھ سے کہئے۔ یہ دونوں آپ سے باتیں نہیں کر سکتے۔'' میں نے کہا۔ ''کیوں؟— کیا یہ دونوں گونگے ہیں؟

اس نے کہا۔ ''گونگے نہیں ہیں بلکہ مجسمے ہیں، دراصل اندھیرے کی وجہ سے اکثر لوگوں کو مغالطہ ہو جاتا ہے۔ کل رات جب میں ادھر سے گذر رہا تھا تو ایک آدمی ان سے فردوس ناکیز کا پتہ پوچھ رہا تھا۔''

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھ پر گھڑوں پانی ڈال دیا ہو۔ سیاحت میں اتنا حیرت انگیز تجربہ مجھے کبھی نہیں ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس شہر میں آدمی اور مجسمہ کے درمیان حد فاصل ٹھیک طرح سے برقرار نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں سے فوراً رخصت ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ میں وہاں سے اپنا سامانِ سفر باندھ کر ایک دوسرے شہر میں پہنچ گیا۔ اس شہر میں قدم رکھتے ہی مجھے احساس ہوا کہ اب آئے گا سیاحت کا مزہ۔ یعنی کافی خوبصورت شہر تھا وہ۔ صاف اور کشادہ سڑکیں۔ عالی شان عمارتیں۔ ہرے بھرے باغات، بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کسی الف لیلوی شہر میں پہنچ گیا ہوں۔ اتنا خوبصورت شہر میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا

تھا لیکن حضرات، چند ہی لمحوں بعد میری حالت یوں ہوگئی جیسے کسی نے مجھے آسمان سے پھینک کر کھجور میں اٹکا دیا ہو۔ آہ! میں اپنی وہ کیفیت کس طرح بیان کروں جب میں نے یہ دیکھا کہ اس شہر میں سرے سے آدمی کا نام ونشان ہی نہیں تھا اور سب طرف مجسمے ہی مجسمے کھڑے ہوئے تھے جو شکستہ سے تھے اور ان پر گوبر وغیرہ سے گل کاریاں کی گئی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی شہر طلسمات میں پہنچ گیا ہوں اور اگر پیچھے مڑ کر دیکھوں گا تو خود بھی پتھر کا بُت بن جاؤں گا۔ لہٰذا میں اس شہر سے نکلنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ لیکن ہائے قسمت! کہ خوف و ہراس کے باعث مجھ میں ترکیب سوچنے کی صلاحیت ہی ختم ہوگئی تھی۔ میں سوچنے لگا۔ یہاں آکر سب سے پہلے میرا ذوقِ سیاحت ختم ہوا۔ پھر میں اپنی قیام گاہ کا راستہ بھول گیا۔ اس کے بعد میں آدمی اور مجسمہ کا فرق سمجھنے سے معذور ہوگیا اور اب میری ترکیب سوچنے کی صلاحیت بھی رخصت ہوگئی ہے یعنی مجھ میں سے ایک ایک اہم شے ختم ہوتی جارہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب میں سیاحت سے واپس اپنے وطن پہنچوں تو میرے پورے وجود میں صرف جوتے اور ٹوپی ہی باقی رہ جائیں۔ اس لیے میں بہت دل برداشتہ ہوا لیکن صبر کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ مجبوراً خاموش رہا اور یہ سوچ کر سنسان سڑک پر اکیلا چلتا رہا کہ شاید کہیں کوئی آدمی نظر آجائے تو اس سے پوچھوں کہ اس شہر میں ''ہاؤ ہُو'' کا عالم کیوں ہے اور یہاں کے سارے آدمی کیا ہوئے؟ اور دوسرے یہ کہ یہاں کے مجسموں کی حالت اتنی خراب کیوں ہے کہ بہت سے مجسموں کے گلے میں جوتے چپلوں کے ہار لٹک رہے ہیں۔ کیا یہاں عقیدت کا انداز نرالا ہے؟ میں اسی سوچ میں چل رہا تھا کہ اچانک میرے پاؤں ٹھٹھک کر رک گئے۔ میں نے دیکھا کہ آگے روڈ کے کنارے ایک منحنی سا آدمی کھڑا ہوا ہے۔ اسے اس طرح روڈ کے کنارے کھڑے دیکھ کر میں سوچنے لگا۔ ''یہ واقعی کوئی آدمی ہی ہے، یا کوئی مجسمہ؟'' لیکن کچھ دیر بعد اس نے جب ہاتھ ہلا کر مجھے اشارہ کیا تو میں خوشی خوشی اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا حلیہ بالکل فلسفیوں کی طرح تھا۔ لمبے لمبے بال (ہوسکتا ہے ان میں جوئیں بھی ہوں) بڑھی ہوئی داڑھی اور کھلا ہوا گریبان۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے مسرور لہجہ میں کہا۔ ''آج بہت دنوں بعد اس شہر میں کوئی داخل ہوا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس شہر کے سارے آدمی کہاں چلے گئے؟'' اس نے کہا۔ ''اس شہر کے کافی لوگ جیل میں ہیں۔ کافی لوگ جیل جانے کے ڈر سے بھاگ گئے ہیں۔ کچھ لوگ شہر کا کاروبار معطل ہونے کی وجہ سے ہجرت کر گئے ہیں اور کچھ تھوڑے سے لوگ ابھی شہر میں موجود ہیں لیکن گھروں میں چھپے ہوئے ہیں۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیوں؟'' اس نے کہا۔ ''یہ بہت لمبا قصہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مختصراً سنا دیجئے۔'' وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''دراصل یہاں سیاست بہت شباب پر تھی اور اس وجہ سے سیاست دانوں میں بڑی گرما گرمی چل رہی تھی۔ اسی گرما گرمی میں انہوں نے ایک دوسرے کے مجسموں سے چھیڑ خانی شروع کردی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں خانہ جنگی شروع ہوگئی جس میں پورے شہر کو ملوث ہونا پڑا کیونکہ مختلف عقائد اور مختلف سیاسی نظریات رکھنے والے اپنے اپنے نصب کئے ہوئے مجسموں کی بے حرمتی برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ اس وجہ سے ایک دن یہاں بہت بڑا دنگا

ہوگیا۔ جس میں کوئی بھی مجسمہ حملہ سے محفوظ نہیں رہا۔''

میں نے کہا۔ ''جب اس شہر کا سارا کاروبار ہی معطل ہوگیا ہے تو آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''کاروبار شہر کا معطل ہوا ہے، میرا نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ کیسے؟''

اس نے کہا۔ ''میرے آس پاس کے شہروں کے بہت سے کام پڑے ہوئے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔ ''کون سا کام؟ آپ کا پیشہ کیا ہے؟'' اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ''میں ایک مجسمہ ساز ہوں۔''

میں حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا اور پھر تھوڑی دیر بعد اس شہر کو بھی خیر باد کہہ کر رخصت ہوا۔

حضرات! اب آپ اس سیاحت کا سب سے اہم اور تصویر حیرت بنا دینے والا واقعہ سنئے۔ یہ ایسا واقعہ ہے کہ جب بھی مجھے یاد آتا ہے تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں۔ دراصل ہوا یہ کہ جب میں ''شہر ہاؤ ہُو'' کو خیر باد کہہ کر دوسرے شہر میں پہنچا تو پہلے ہی چوراہے پر ایک مجسمہ کو ایستادہ دیکھ کر میری چیخ نکل گئی۔ میں نقش حیرت بنا کبھی مجسمہ کو دیکھتا اور کبھی اپنے آپ کو۔ پھر میں نے دانتوں تلے انگلی بھی داب لی کہ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ حضرات میں آپ سے کیسے بیان کروں کہ اس چوراہے پر کسی اور کا نہیں بلکہ میرا مجسمہ نصب تھا اور اسے دیکھ کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ ''میرا انتقال کب ہوا؟ کمال ہے۔ یہ ایسا دیس ہے کہ آدمی کو اپنے انتقال کی بھی خبر نہیں ہو پاتی۔'' پھر مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اگر واقعی میرا انتقال ہو چکا ہے تو کب ہوا اور کس زمانہ میں ہوا؟ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ چلتے پھرتے ہوئے بہت سے لوگوں کی نظریں مجھ پر پڑ گئیں۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔ پھر چاروں طرف شور ہوگیا۔ ''مہاتما آ گئے... مہاتما نیا جنم لے کر آ گئے۔'' میں تعجب سے سوچنے لگا۔ ''ابھی تو میں اپنے انتقال پر ہی غور کر رہا تھا اور ابھی میں اچانک دوبارہ پیدا کس طرح ہوگیا؟'' یہ سوچ کر جب میں نے نگاہیں اٹھائیں تو دیکھا کہ میرے چاروں طرف عقیدت مندوں کا زبردست ہجوم ہے اور وہ مجھ پر پھولوں کی بارش کر رہے ہیں۔ میں نے ایک عقیدت مند سے کہا۔ ''آپ لوگوں کو شاید کچھ غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میں وہ نہیں ہوں جو آپ سب مجھے سمجھ رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ہم آپ کو خوب پہچانتے ہیں۔ آپ سو سال بعد دوسرا جنم لے کر آئے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تو کیا میں سو سال پہلے مر چکا تھا؟'' اس نے کہا۔ ''ہاں، اس کا ثبوت یہ مجسمہ ہے۔ آپ کے انتقال کے بعد یہ مجسمہ یہاں نصب کیا گیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے کہ میرا چہرہ مہاتما جیسا ہو۔'' اس نے ذرا ناراض ہو کر کہا۔ ''ہماری عقیدت کو ٹھیس مت لگائیے۔ ہم جانتے ہیں کہ مہاتما اتفاق سے پیدا نہیں ہوتے اور اب آپ خاموش رہئے۔ ہمیں اپنا فرض ادا کرنے دیجئے۔'' تو حضرات، وہ مجھ پر پھولوں کی بارش کرتے ہوئے اور نعرے لگاتے ہوئے ایک بہت بڑے پنڈال میں لے گئے جہاں کافی دنوں تک میں عقیدت مندوں کے سمندر میں ڈوبا رہا اور مجھے ان لوگوں سے چھٹکارا اس وقت ملا جب ایک بہت پہنچے ہوئے بزرگ نے میرے بارے میں یہ اعلان کر دیا کہ ''یہ کوئی ڈھونگی مہاتما ہے۔ اس میں کوئی روحانی طاقت نہیں ہے۔'' تو سب نے کھسیا کر مجھے بہت دور تک دوڑایا اور اس طرح میں یہاں واپس آیا۔

عارف ایوبی

هبوط

تینوں نے مل کر طے کیا کہ جیسے بھی ممکن ہو اس سرخ آندھی کے منبع کا پتہ لگا کر مناسب تدارک کیا جائے جس کی وجہ سے اس شہر کے بے گناہ عوام بے دریغ مارے جا رہے تھے۔ اس لیے تینوں اٹھے اور بہت تیزی سے باہر نکل گئے تاکہ جلد از جلد اس خطہ کو بلائے ناگہانی سے نجات دلائی جا سکے۔

کشتیوں میں بیٹھتے ہی انہوں نے اپنی بیلٹیں کس لی تھیں جن کشتیوں میں یہ سفر کر رہے تھے وہ بہت ہلکی تھیں اور بہ آسانی ہر طرف موڑی جا سکتی تھیں نیز ان کی شکل کچھ ایسی تھی کہ اگر الٹ بھی جائیں تو ایک لمحہ میں از خود سیدھی ہو جائیں۔ تینوں بہت تیزی کے ساتھ چپو چلا رہے تھے۔ ان کی کشتیاں ایک ساتھ تیر رہی تھیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سمندر کی تیز لہریں ایک دوسرے کو دور کر دیتیں لیکن وہ پھر ایک دوسری کے قریب آ جاتے۔ دھوپ تیز نہیں ہوئی تھی سفر کرتے ہوئے زیادہ وقت بھی نہیں گزرا تھا کہ سمندر میں طوفان اٹھنے لگا اور خوفناک گرج سنائی دینے لگی ایسا محسوس ہونے لگا جیسے سمندر میں ہزاروں بم ایک ساتھ پھٹ رہے ہوں۔ یوں تو سمندر میں طوفان آتے ہی رہتے ہیں لیکن اس طوفان کی خوفناک گڑگڑاہٹ ناقابل فراموش تھی۔ اژالیا نے چیختے ہوئے کہا۔ ''یقیناً کوئی آتش فشاں پھٹا ہے جس کا لاوا سمندر کی تہہ میں بہہ رہا ہے۔ لیکن اس وقت یہ لوگ سخت متعجب ہوئے جب اس گڑگڑاہٹ میں ڈکارتے چنگھاڑنے کی آوازیں شامل ہو گئیں۔ چوں کہ خوش بخت سمندر کی سیاحی کا عادی تھا اور اس مہم میں اپنے دونوں ساتھیوں کا راہبر تھا، اس لیے صورت حال کو دیکھتے ہی چیخا'' جلدی کرو... جلدی کرو... دریائی گھوڑوں کی فوج آ رہی ہے۔ اگر ہم ان کے نرغے میں آ گئے تو کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکے گا۔

تینوں نے اپنی کشتیوں کا رخ ساحل کی طرف موڑ دیا اور تیزی سے چپو چلانے لگے۔ لیکن موجیں اتنی تیز و تند تھیں کہ کشتیاں ربر کے کھلونے کی طرح پانی کے اوپر اچھلنے لگیں۔

خوش بخت نے دوبارہ چیخ کر اپنے دونوں ساتھیوں کو پیچھے کی طرف متوجہ کیا، جہاں ہزاروں دریائی گھوڑے بہت تیزی کے ساتھ ان سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ اژالیا اپنی کشتی ساحل تک لانے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن شائق اور خوش بخت ساحل سے کچھ دور ہی تھے کہ دریائی گھوڑے ان کے قریب آ گئے، شاید دونوں ہی کی کشتی پر ایک سخت ٹکر ماری جس کی وجہ سے دونوں ہی کشتیاں کچھ دیر کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گئیں، لیکن اگلے ہی لمحے شائق کی کشتی اژالیا سے کچھ فاصلے پر آ کر گری۔ شائق گرتے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ اژالیا بہت تیزی کے ساتھ شائق کے پاس پہنچ کر اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ شائق کو ہوش آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ہوش میں آتے ہی اژالیا نے اس سے پوچھا ''شائق...! خوش بخت

کہاں ہے؟'' شائق نے کہا'' کنارے پہنچنے سے پہلے ہی طوفانی موجوں نے میری کشتی کو کنارے پر اُچھال دیا تھا۔ لیکن شاید خوش بخت کی کشتی پر کسی دریائی گھوڑے نے ٹکر ماری تھی، اس سے زیادہ میں نہیں دیکھ سکا تھا۔

اژالیا پر پریشان ہوتا ہوا بولا، ''چلو اُسے تلاش کرتے ہیں۔''

دونوں ساحل پر چلتے چلتے کافی دور نکل آئے، آخر انہیں خوش بخت کی جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی کشتی دکھائی دی۔ جس میں خوش بخت بے ہوش پڑا تھا۔ خوش بخت کے مل جانے سے دونوں کافی خوش تھے... لیکن ان کی خوشی لمحاتی ثابت ہوئی۔ کیونکہ خوش بخت کی کشتی اچھل کر جس جھاڑی میں جاگری تھی اس کے چاروں طرف تقریباً تین فٹ چوڑا اور اتنا ہی گہرا دلدل تھا۔ اس میں پیر رکھتے ہی پھنس جانے کا خطرہ تھا۔ اس لیے دونوں دوڑتے ہوئے اپنی کشتیوں سے لمبی رسی لائے اور اس میں پھندا ڈال کر خوش بخت کی کشتی کی طرف اُچھال دیا تاکہ اس کا کنڈا رسی کی گرفت میں آجائے... پھندا کشتی کے کنڈے میں پھنس گیا۔ دونوں نے خوش بخت کی کشتی اپنی طرف کھینچنا شروع کی۔ کشتی کے کنڈے میں پھنس گیا۔ دونوں نے خوش بخت کی کشتی اپنی طرف کھینچنا شروع کی۔ کشتی جھاڑیوں سے نکل کر دلدل پر پھسلنے لگی۔ دونوں کے پیر ٹخنوں تک دلدل میں پھنس چکے تھے۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی جاندار چیز ان کی ٹانگوں پر رینگ رہی ہے۔ پھر ان کی رانوں پر سوئیاں جیسی چبھنے لگیں۔ لیکن وہ اپنی تکلیف سے بے پروا اپنے رفیق کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کافی تگ و دو کے بعد خوش بخت کی کشتی دلدل کے کنارے آگئی تو اژالیا نے اس کی بیڑیں کھولیں۔ اس کے بعد دونوں اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ اسی دوران جب شائق کی نظر اژالیا کے ٹانگوں پر پڑی تو وہاں بہت سی جونکیں چپکی ہوئی تھیں۔ اسی کے ساتھ اُسے اپنی ٹانگوں کا خیال آیا خود اس کی بھی ٹانگوں کا یہی حال تھا۔ دونوں خوش بخت کو چھوڑ کر اپنی ٹانگوں سے جونکیں چھڑانے لگے جوان کا خون پی پی کر موٹی ہوتی جا رہی تھیں۔ اس دوران شائق خود کلامی کے انداز میں بڑبڑانے لگا تھا۔ یہ ابتدا ہے ابھی پتہ نہیں اس بحرِ بیکراں میں کتنے دن سفر کرنا پڑے۔ جب کہ سفر کا آغاز اس عزم کے ساتھ کیا تھا کہ سرخ آندھی کے منبع کی طرف کسی ڈیلٹا پر پہنچ کر پڑاؤ ڈالیں گے... لیکن پڑاؤ سے پہلے ہی خوش بخت کا یہ حال ہے اور ہم دونوں کے خون کی خاصی مقدار یہ جونکیں پی گئی ہیں.....''

اس سے پہلے کہ اژالیا کچھ اور کہتا، خوش بخت کو ہوش آگیا۔ سب نے مل کر اپنی اپنی کشتیاں ٹھیک کیں۔ غذائی اشیا جو پانی میں بھیگ گئی تھیں انہیں سکھانے کے لیے دھوپ میں پھیلایا اور کچھ وقفہ آرام کے بعد نئے جوش کے ساتھ اپنے سفر پر روانہ ہوگئے۔ یہ لوگ تین دن تک مسلسل سفر کرتے رہے اگرچہ دریائی گھوڑوں کا خوف ابھی بھی ہر وقت لاحق رہتا تھا... چوتھے دن ان لوگوں کو کسی شہر کے نشانات نظر آئے۔ اس لیے طے ہوا کہ پڑاؤ یہیں ڈالا جائے۔ یہاں معلوم ہوا کہ سمندر کے اس حصے کا جوار بھاٹا دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ نیز چاندنی راتوں میں جب دریائی گھوڑے اپنی خوراک کی تلاش میں نکلتے ہیں تب زرد چاند اپنی شعاؤں کے ذریعے ان کی راہ نمائی کرتا ہے اور ان شعاؤں کی وجہ سے پیدا ہونے والا جوار بھاٹا اور بھی زیادہ قابلِ ذکر ہو جاتا ہے۔

اس بستی سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر قدیم تہذیب وتمدن کا ایک قبیلہ آباد تھا۔ شائق قدیم تہذیب سے اپنی دلچسپی کی وجہ سے قبائلی بستی میں جانے کی اپنی خواہش کو دبا نہیں سکا اگرچہ خوش بخت اور اژالیا دونوں نے ہی اُسے منع کیا، وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے، لیکن شائق نہیں مانا اور چل دیا۔

تاریکی دبے پاؤں چلی آرہی تھی۔ شائق اپنے دھن میں مست چلا جارہا تھا کہ یکا یک اپنی طرف بڑھتے ہوئے کچھ سائے اُسے نظر آئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ سائے ایک دائرے کی شکل میں اس طرح پھیل گئے جیسے بہت سے شکاری ایک شکار کو گھیر لیتے ہیں۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھ پاتا کچھ مضبوط بازوؤں کی گرفت میں آکر بے بس ہو چکا تھا۔ اب شائق کو یہ احساس ہوا کہ یہ سائے نہیں، بلکہ بالکل برہنہ عورتیں ہیں۔ انتہائی طاقت ور اور بالکل بے خوف، جن کے چہروں اور جسم پر مختلف رنگ کے گل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ سب نے مل کر شائق کی تلاشی لی... لیکن جب اس کے پاس کوئی قیمتی شے برآمد نہیں ہوئی تو ایک عورت نے اس کے بالائی جسم کا لباس اتار لیا اور دوسری عورت نے اس کے سر پر بندھا ہوا کھڑا اتار کر اپنے سر پر رکھ لیا، جسے وہ دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لیے اپنے سر پہ باندھے رہتا تھا۔ باقی عورتوں کے ہاتھ جب کچھ نہ آیا تو انہوں نے اس کے سر پر تھوک دیا اور بھاگ گئیں۔ اس حادثے سے شائق اتنا گھبرا گیا تھا کہ قبائلی آبادی تک جانے کا ارادہ ترک کر کے واپس لوٹ آیا۔ شائق کو نیم برہنہ اور پریشان دیکھ کر اژالیا نے پوچھا ''کیا بات ہے؟ تم اتنا گھبرائے ہوئے کیوں ہو اور تمہارا لباس کیا ہوا؟''

شائق کے جواب دینے سے پہلے ہی خوش بخت نے کہا ''میں اسی لیے منع کر رہا تھا، اس قبیلے کا یہ رواج ہے کہ جب مسافر کے پاس سے کوئی قیمتی چیز برآمد نہیں ہوتی ہے تو اس کا لباس اتار لیتے ہیں اور اس کے سر پر تھوک کر اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اژالیا نے کہا۔ ''خیر جو کچھ بھی ہونا تھا ہوا۔ اب رات کافی ہو چکی ہے۔ اس لیے آرام کرو۔ صبح پھر سے سفر کرنا ہے۔''

دریائی گھوڑے کی ٹکر نے خوش بخت کی کشتی کو کافی کمزور کر دیا تھا۔ جو کسی طرح یہاں تک تو آگئی تھی۔ لیکن آگے چلنے کے قابل نہ تھی۔ چوں کہ کشتیاں صرف ایک آدمی کا ہی بار برداشت کر سکتی تھیں اور ایک کشتی کم ہو گئی تھی، جس کی مرمت کا بھی یہاں کوئی بندوبست نہ تھا۔ اس لیے جلوڈ قبیلے کے دو نوجوان کشتی بان کرائے پر طے کیے اور یہاں کے دستور کے مطابق پوری رقم پیشگی ادا کر دی اور اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔

ابھی زیادہ دور نہیں چلے تھے، شائق نے اپنے بالائی جسم کا لباس نکالا اور پہننے کا ارادہ کیا۔ پھر کچھ سوچ کر اپنی جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکال کر سگریٹ سلگائی اور لباس زانوؤں پر رکھ لیا۔ شائق نے سگریٹ کا ایک ہی کش لیا تھا کہ کشتی بانوں نے اس کے بائیں ہاتھ میں لائٹر اور زانوں پر رکھا ہوا لباس دیکھ لیا اور دیکھتے دونوں چیموں کو کرائے میں شامل کر لیا۔ خوش بخت نے انہیں سمجھایا ''جو کرایہ طے ہوا تھا وہ تمہیں مل بھی گیا اور اس میں یہ چیزیں شامل نہ تھیں۔ دونوں نے کشتیاں روک دیں اور کہا ''اب ہم لوگ آگے نہیں جائیں گے، واپس چلتے ہیں کوئی دوسرا ڈھونڈ لو۔''

چوں کہ سرخ آندھی کے منبع کی تلاش میں تاخیر نہیں کی جا سکتی تھی، اس لیے خوش بخت نے کہا

''دونوں چیزیں انہیں دے دو'' ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ ہمارے شہر کے پتہ نہیں کتنے افراد سرخ آندھی کی نذر ہو چکے ہیں اور مزید ہو رہے ہوں۔ ہمیں جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچنا ہے۔''

کشتی بانوں نے کرائے کی ہی طرح دونوں چیزیں بھی پیشگی وصول کر لیں۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور یہ کشتی بان رات میں سفر نہیں کرتے تھے، اس لیے سبھی کشتیاں قریب کے ویران جزیرے کی ساحل کی طرف لے آئے۔ تقریباً آدھی رات کے وقت ایک کشتی بان گھبرایا ہوا کہیں سے آیا اور بولا ''ہمارے ایک ساتھی کو مگر مچھ پکڑ لے گیا۔ اگرچہ یہ لوگ اس کے ساتھی کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے، پھر بھی اس کی تسلی اور انسانی ہمدردی کی وجہ سے اٹھے اور اس جگہ تک گئے جہاں وہ دونوں سوئے تھے۔

صبح اٹھ کر تینوں اسی جگہ دوبارہ گئے جہاں گذشتہ رات وہ دونوں کشتی بان سوئے تھے، اس راستے کو دوبارہ دیکھا جدھر سے کشتی بان کے مطابق مگر مچھ آیا تھا اور اس کے ساتھی کو کھینچ لے گیا تھا۔

خوش بخت کافی تجربہ کار تھا، اس نے کہا۔ ''کشتی بان کو مگر مچھ نہیں لے گیا، بلکہ اس کو اسی نے مار ڈالا ہے۔ کیوں کہ یہاں سے سمندر تک، زمین پر مگر مچھ کے رینگنے کے نشانات نہیں ہیں، اس کے برعکس آدمی کے پیروں کے نشانات ہیں۔ جو یہاں سے سمندر تک گئے ہیں، اور واپس آئے ہیں۔ ان لوگوں کے کافی دباؤ ڈالنے کی وجہ سے کشتی بان نے راز اگل دیا۔ گذشتہ رات دونوں میں اس بات پر جھگڑا ہوا تھا کہ سگریٹ لائٹر کون لے گا۔ قاتل مقتول کو لباس تو دینا چاہتا تھا لیکن لائٹر دینے پر تیار نہ تھا۔ آدھی رات کے وقت جب مقتول سو گیا تو قاتل نے مقتول کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا، اور لاش سمندر میں پھینک دی۔ اس واقعہ کو سنانے میں کشتی بان کو کوئی خوف یا جھجک نہیں محسوس ہوئی بلکہ اپنی میلی لنگوٹی سے لائٹر نکال کر اپنے میلے کچیلے دانت نکالتے ہوئے اُسے دیکھنے لگا تھا۔ خوش بخت اس کی بے حسی برداشت نہیں کر سکا تھا۔ اس نے ایک گھونسہ اس کے منہ پر مار دیا، لیکن کشتی بان نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی، وہ بدستور اپنی شیطانی، ہنستی ہنستا رہا۔

ایک دن آرام کے بعد یہ اپنے اگلے سفر پر روانہ ہوئے، کشتی بان اَب اکیلا تھا۔ ہوا مخالف چل رہی تھی۔ اس لیے اسے تنہا کشتی چلانے میں دقت ہو رہی تھی۔

آج ہی یہ لوگ اس آبادی میں پہنچے تھے۔ ابھی رات کا پہلا پہر شروع ہوا تھا کہ یہاں کے باشندے ایک غار کے پاس جمع ہونے لگے تھے۔ پہلے پہر کے اختتام تک تقریباً دو سو مرد عورت اور بچے جمع ہو گئے۔ یہ سب غار کے سامنے ایک دائرے کی شکل میں سر جھکائے کھڑے تھے۔ سبھی قبائلی اپنی ستر ایک لنگوٹی سے چھپائے ہوئے تھے۔ باقی جسم برہنہ تھا۔ ان سبھی نے اپنے ہاتھوں میں بڑی بڑی مشعلیں اٹھا رکھی تھیں، دائرے کے بیچ میں دس مرد جن کے سروں پر رنگین پر بندھے ہوئے تھے اور گلے میں مختلف جانوروں کی ہڈیوں اور پتھروں کے ہار پہنے ہوئے تھے۔ کسی وظیفے کا ورد کر رہے تھے۔ غار کے دہانے پر ایک کافی بڑے برتن میں دودھ رکھا ہوا تھا، پاس ہی بانس کی باریک تیلیوں سے بنی ہوئی تین ٹوکریوں میں بڑے بڑے مینڈک رکھے ہوئے تھے۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ غار سے ایک بہت بڑا اجگر برآمد ہوا، اجگر کو دیکھتے ہی قبائلیوں نے رقص کرنا شروع کر دیا۔ اَجگر سامنے رکھا ہوا دودھ پینے لگا۔ اس کے بعد غار سے ایک

دوسرا اجگر برآمد ہوا۔ لیکن تب تک دودھ کا برتن خالی ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے نوکریوں میں رکھے ہوئے مینڈکوں کو نگلنا شروع کر دیا۔ اس قبیلے کی روایت تھی کہ جس عورت کے بچے پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہوں یا اس کے بچہ نہیں ہوتا ہو تو وہ ایک مخصوص طریقے سے قربانی دیتی تھی، آج ایسی ہی ایک عورت قربانی دینے آئی تھی جس کے اب تک تین بچے مر چکے تھے اور چوتھے بچے کی پیدائش میں ابھی تین ماہ باقی تھے۔

قربانی دینے کا طریقہ یہ تھا کہ عورت کچھ مخصوص زاویوں سے رقص کرتی ہوئی گھٹنوں کے بل اجگر کے سامنے بیٹھ جاتی، اس وقت مجمع بالکل خاموش ہو جاتا صرف وظیفہ پڑھنے والے اپنے کلمات کا ورد کرتے رہتے۔ عورت کی دونوں چھاتیوں پر لوہے کے خول چڑھے ہوتے۔ لیکن خود کو اجگر کے سامنے اس طرح پیش کرتی، کہ جیسے وہ اسے دودھ پیش کر رہی ہے۔ اب اگر اجگر لوہے کے خول پر ڈسنے کی کوشش کرتا تو یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ قربانی قبول ہو گئی اور اب اس کے بچے حیات سے رہیں گے اور اگر جسم کے کسی دوسرے حصے میں ڈس لیتا تو اس عورت کو گنہگار تسلیم کیا جاتا اور اس کی موت کو گناہوں کا کفارہ سمجھ لیا جاتا۔

آج جو عورت قربانی دے رہی تھی وہ بتدریج بڑھتے ہوئے دوسری طرف کھڑے اپنے شوہر کے اُس مخصوص اشارے کا انتظار کر رہی تھی، جس پر وہ رقص شروع کرے۔ اس کا شوہر کچھ اتنا مطمئن تھا جیسے کوئی خاص بات ہی نہ ہو، اس نے ایک نظر اپنی بیوی پر ڈالی، جیسے قصائی جانور کو ذبح کرنے سے پہلے دیکھا کرتے ہیں، پھر چھڑی سے رقص شروع کرنے کا اشارہ دے دیا۔ عورت نے مسکراتے ہوئے رقص کرنا شروع کیا اور ایک مخصوص زاویہ بناتے ہوئے اجگر کے سامنے داہنے گھٹنے کے بل بیٹھ گئی۔ اجگر تقریباً ڈیڑھ فٹ اونچا اٹھا اس کی آنکھیں سُرخ انگارے جیسی ہو رہی تھیں اور زبان تیزی سے لپلپا رہی تھی۔ چاروں طرف موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اجگر نے اپنا سر تھوڑا سا پیچھے کیا پھر تیزی سے عورت کے ماتھے پر ڈس لیا اور فوراً غار میں واپس چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسرا اجگر بھی واپس چلا گیا...

ماحول میں ایک چیخ گونجی... لیکن اس کے آگے کا منظر ان لوگوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس لیے تینوں اپنی قیام گاہ واپس لوٹ آئے۔ کسی طرح باقی رات گذاری، صبح ہوتے ہی پہلے کشتی بان کو رخصت کیا۔ اس کے بعد دو نئے کشتی بان طے کئے اور اُن کے ساتھ عازمِ سفر ہوئے۔

کئی دن مسلسل خراب موسم اور بحری طوفان میں جدّ و جہد کرتے ہوئے ایک دوسری آبادی میں پہنچے۔ اس آبادی کے عوام کے کئی طبقے تھے لیکن دو خاص تھے اور ان کی مخصوص شناخت تھی۔ ایک طبقہ زرد لباس پہنتا تھا۔ دوسرا طبقہ اپنے ماتھے پر سرخ پٹی باندھے رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے دونوں ہی طبقے بہ آسانی پہچانے جاتے تھے۔ لیکن دوسرے طبقوں کی شناخت مشکل تھی۔ تینوں کافی تھکے ہوئے تھے۔ اس لیے سبھی اپنے اپنے بستر لگانے لگے، لیکن خوش بخت نے جیسے ہی بستر کھولا۔ اس میں پہلے سے بیٹھے ہوئے ایک زرد سانپ نے اُسے ڈس لیا۔ سانپ کا زہر سریع الاثر تھا، اسے نکالا نہیں جا سکتا تھا... خوش بخت کا پورا جسم نیلا پڑ چکا تھا... اژالیا اور شائق کے چہرے فق تھے..... اور سرخ آندھی کا قہر جاری تھا۔

اقبال انصاری

بھرے ہاتھ

چندر پال جی نے لفافہ کھولا اور انٹرویو پینل پر نظر ڈالی۔ پینل اس طرح تھا—

۱- شری چندر پال — آر سی چیئرمین
۲- شری اندر جیت — اے۔آر۔سی ممبر
۳- شری کرن سنگھ — اے۔آر۔سی ممبر
۴- شری گوری شنکر — اے۔آر۔سی ممبر

چندر پال جی نے لیٹر میز پر رکھ دیا۔ اُن کے پتلے پتلے ہونٹ بھینچ گئے تھے اور پیشانی کے وسط میں عمودی شکنیں اُبھر آئی تھیں۔

اُن تینوں یعنی اندر جیت، کرن سنگھ اور گوری شنکر سے اُن کی نگتی تھی۔ کسی معاملے میں ان تینوں نے کبھی چندر پال جی کو زک پہنچائی تھی۔ اس وقت چندر پال جی بھی اے۔سی تھے۔ مگر پھر اُن کا پروموشن کمشنر کی حیثیت سے ہوگیا، اور انہوں نے کسر کاٹنی شروع کردی— اُن تینوں کو اتنا تنگ کیا کہ انہوں نے اپنے تبادلے چنڈی گڑھ کروا لیے اور اس طرح سے چندر پال جی کی براہِ راست ماتحتی سے نکل گئے۔

وہ تینوں چنڈی گڑھ میں خوش تھے۔ کام ہلکا تھا، آمدنی وزنی۔

ادھر مرکز میں چندر پال جی خوش تھے کہ اُن کی مخالفت کرنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ ان کے ماتحتوں کو علم تھا کہ اندر جیت، کرن سنگھ اور گوری شنکر نے اپنے تبادلے چندر پال جی کی وجہ سے ہی کروائے تھے— اس لیے کوئی بھی چندر پال جی سے نہ الجھتا تھا، نہ ان کی حکم عدولی کرتا تھا۔ اب جو آدمی مرکز میں بیٹھا ہے اسے کیا ایسی موت پڑی ہے کہ وہ اپنے باس سے پنگا لے اور اپنے لیے مصیبت کھڑی کرے؟ چندر پال جی کی امیج ایک ''ذہین آفیسر'' سے زیادہ ایک ''شاطر آفیسر'' کی تھی— اور ایک ''شاطر آفیسر'' سے زیادہ ایک ''اذیت پسند'' اور ایک ''کینہ پرور'' آفیسر کی تھی۔ ان کے تمام ماتحتوں پر دو باتیں اچھی طرح واضح تھیں— ایک یہ کہ چندر پال جی معاف کرنا نہیں جانتے تھے، دوسرے یہ کہ اُنکے تعلقات ''اوپر تک'' نہیں بلکہ ''بہت اوپر تک'' تھے۔ اس لیے ان کا کوئی ماتحت ان کا راستہ کاٹنے کی بابت سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

بہرحال پینل پر نگاہ ڈالتے ہی چندر پال جی الجھن میں پڑ گئے تھے— آخر یہ تینوں ہی کیوں؟ پینل چونکہ مرکز کی متعلقہ منسٹری سے آیا تھا اس لیے— چندر پال جی نہ اس پر کوئی عملی سوالیہ نشان لگا سکتے تھے، نہ احتجاج کر سکتے تھے— پینل کو نہ ماننے یا مسترد کرنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ وہ اس کے مجاز نہیں تھے۔

لیکن انہیں چونکنا اور پھر سوچنا تو پڑا ہی— انٹرویو پینل میں اے سی رینک کے آفیسر مرکز سے ہی کسی

متعلقہ شعبے سے، یا کسی دوسرے محکمے سے یا کسی بھی اسٹیٹ سے لیے جاسکتے تھے۔ آخر اندر جیت، کرن سنگھ اور گوری شنکر ہی کیوں؟ اچانک چندر پال جی کو یاد آیا کہ جب ان تینوں نے ٹرانسفر کے لیے اپلائی کیا تھا تو تیسرے ہی دن اُن کے ٹرانسفر آرڈر آ گئے تھے — تینوں کو اُن کا مانگا ہوا اسٹیشن یعنی چنڈی گڑھ مل گیا تھا۔ عام طریقے سے اتنی جلدی مانگے ہوئے اسٹیشن پر ٹرانسفر ہوتے نہیں ہیں۔ لیکن اُس وقت چندر پال جی نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی، بلکہ انہیں خوشی ہوئی تھی کہ اتنی جلدی اُن تینوں کے تبادلے ہو گئے تھے۔ حالانکہ وہ سخت گیر تھے، لیکن مخالفت و مخاصمت کے ماحول میں کام کرنا انہیں دل سے پسند نہیں تھا — پھر انہیں یہ بھی یاد آ گیا کہ جب اُن تینوں کے تبادلے ہوئے تھے اس وقت بھی بگ باس (Big-Boss) یہی صاحب تھے جو آج کل تھے۔ بگ باس کئی برسوں سے بگ باس تھے — اور اُن کا بس چلتا تو چندر پال جی کو کب کا کسی نہ کسی ٹھکانے لگا چکے ہوتے۔ لیکن چندر پال جی ایک تو بے حد ذہین اور بیدار مغز آفیسر تھے، دوسرے یہ کہ ان کے Connections (تعلقات) بگ باس سے بھی اوپر کے لوگوں سے تھے۔

ان بگ باس نے ہی یہ انٹرویو پینل تشکیل دیا تھا جسے چندر پال جی چیلنج نہیں کر سکتے تھے۔

چندر پال جی کو یہ بھی علم تھا کہ بگ باس اُس وقت تک کسی کام میں دلچسپی نہیں لیتے تھے جب تک اُس میں اُن کا اپنا کوئی مفاد نہ ہو۔ چندر پال جی کے بیدار ذہن نے انہیں بتایا کہ یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا کہ انٹرویو پینل میں اُن ہی تین افسروں کے نام ہیں جن سے اُن کی لگتی ہے اور جنہوں نے ان کی وجہ سے ہی مرکز سے اپنے تبادلے کروا لیے تھے۔

''کیا امیدواروں میں کوئی کینڈیڈیٹ بگ باس کا بھی ہے؟''

ذہن میں سوال اٹھنے کی دیر تھی کہ جواب بھی مل گیا — اس کے علاوہ اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی! اگر ایسا نہ ہوتا تو انٹرویو پینل تشکیل دینے سے قبل بگ باس نے ان سے مشورہ کیا ہوتا۔ آخر وہ محکمے کے سربراہ تھے۔ این۔ آر۔ ڈی۔ سی۔ میں فیلڈ آفیسر کی ایک پوسٹ خالی ہوئی تھی جو جنرل Category کے کینڈیڈیٹ سے بھری جانی تھی — صرف وہی امیدوار اپلائی کر سکتے تھے جن کے پاس کم از کم 75 فی صد مارکس کے ساتھ جیالوجی میں ایم ایس سی کی ڈگری ہو اور جس نے ایکالوجی (Ecology) میں مہارت حاصل کی ہو۔

شرائط سخت تھیں اس لیے صرف پانچ درخواستیں موصول ہوئی تھیں۔

ان پانچوں درخواستوں کو چندر پال جی نے اپنی میز پر منگوا لیا۔

تیسری درخواست نے ان کے یقین پر مہر لگا دی —

کینڈیڈیٹ کا نام تھا من پھول سنگھ —

والد کا نام شہر سنگھ —

پتہ — ۹۔ راجا رام روڈ۔ سیکٹر ۱۷ چنڈی گڑھ۔

۹۔ راجہ رام روڈ بگ باس کی نجی کوٹھی تھی اور بگ باس کا نام تھا شہر سنگھ۔

تو بگ باس کے صاحبزادے بھی ایک کینڈیڈیٹ ہیں!''

سب کچھ چندر پال جی کی سمجھ میں آ گیا۔

من پھول سنگھ کی ایم ایس سی کی مارکس شیٹ پر نظر پڑتے ہی چندر پال جی کے ہوش اُڑ گئے۔ ایکالوجی کے پیپر میں اُس کے اکیانوے فی صد مارکس تھے اور مجموعی فی صد تھی نواسی۔

کسی بھی دوسرے کینڈیڈیٹ نے اسی فی صد تک مارکس حاصل نہیں کیے تھے — پچہتر اور اسی کے درمیان تھے۔ چندر پال جی نے درخواستیں رکھ دیں — اُن کے چہرے سے فکرمندی جھلکنے لگی تھی۔

بگ باس کی وجہ سے چندر پال جی کا اب تک کم از کم بیس لاکھ کا نقصان ہو چکا تھا۔ وہ ہر اُس معاملے میں دخل اندازی کرتے تھے جس میں —— چندر پال جی کی بریڈ پر مکھن لگنے کا امکان ہوتا تھا۔

''دیکھا جائے گا'' چندر پال جی نے دل ہی دل میں کہا۔

انٹرویو کا دن آ گیا۔

چنڈی گڑھ سے تینوں اے سیز آ گئے۔

''کیا پالیسی اختیار کرنی ہے انٹرویو میں؟'' چندر پال جی نے اُن تینوں کو مخاطب کیا۔

''میرے خیال میں کوئی نئی پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت ہی نہیں سر۔'' گوری شنکر نے کہا ''پانچوں کینڈیڈیٹ اپنے سبجیکٹ میں — ماسٹر ہیں — ڈسٹنکشن مارکس (امتیازی نمبر) لے کر ایم ایس سی کیا ہے — تو سبجیکٹ کے بارے میں ان سے سوال کرنا بے کار ہوگا۔ وہاں تو وہ مار کھائیں گے نہیں۔''

''میں گوری شنکر کی بات سے Agree کرتا ہوں'' کرن سنگھ نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا'' چنانچہ Past میں جو طریقہ اختیار کیا جاتا رہا ہے وہی اس بار بھی اختیار کیا جائے۔ ہر کینڈیڈیٹ سے کچھ جنرل سوالات اور پھر اس کے اپنے علاقے کے بارے میں سوالات کئے جائیں۔''

''اندر جیت، تمہاری بھی یہی رائے ہے؟'' چندر پال جی نے کوتاہ گردن اندر جیت کو مخاطب کیا۔

''یس سر، میرے خیال میں یہی Safest (محفوظ ترین) طریقہ ہے'' — اندر جیت نے کہا۔

''تو ٹھیک ہے —'' چندر پال جی ڈھیلے ڈھالے لہجے میں بولے ''ہم یہی طریقہ اپنائیں گے۔''

انٹرویو شروع ہوا۔

چندر پال جی کو چوتھے کینڈیڈیٹ کا خاص طریقے سے انتظار تھا — من پھول سنگھ — بگ باس کا بیٹا۔

اوسط جسم، اوسط قد، گندمی رنگت، بھولا سا چہرہ، کشادہ پیشانی، آنکھوں میں ذہانت کی چمک، جسم پر سفید قمیض اور سفید پتلون — چندر پال جی نے من پھول سنگھ پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور اسے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اندر جیت نے سوالات کا سلسلہ شروع کیا — ''نام؟''

''سر، من پھول سنگھ۔''

گوری شنکر — ''کیا کر رہے ہو آج کل؟''
''خالی ہوں سر — پچھلے سال ہی رزلٹ آیا ہے۔''
اندر جیت — ''خالی وقت کیسے گزارتے ہو؟''
''جی، پڑھتا رہتا ہوں''
کرن سنگھ — ''یہ تم نے اپنا پتہ چنڈی گڑھ کا لکھا ہے — چنڈی گڑھ میں ہی رہتے ہو۔''
''جی سر — بس پانچ سال کاندھاری میں رہا ہوں۔''
گوری شنکر — ''کتنے دنوں سے رہ رہے ہو چنڈی گڑھ میں؟''
''سر میں پیدا ہی چنڈی گڑھ میں ہوا تھا۔''
اندر جیت — ''چنڈی گڑھ سے دہلی کتنی دور ہے؟''
''بائی ٹرین 244 کلومیٹر، بائی روڈ 249 کلومیٹر سر۔''
کرن سنگھ — ''چنڈی گڑھ کا ایریا کتنا ہے؟''
''سر ایک سو چودہ اسکوائر کلومیٹر۔''
گوری شنکر — ''آج کل چنڈی گڑھ کی آبادی کتنی ہے؟''
''تو لاکھ، سر۔''
کرن سنگھ — ''چنڈی گڑھ سے شملہ کتنی دور ہے؟''
''جی ایک سو ستر ہ کلومیٹر۔''
اندر جیت — ''چنڈی گڑھ کے نزدیک پنچکولہ ہے —''
''جی سر —''
اندر جیت — ''پنچکولہ کس اسٹیٹ میں ہے؟''
''ہریانہ میں، سر۔''
کرن سنگھ — ''چنڈی گڑھ سے کتنے فاصلے پر ہے پنچکولہ؟ اور یہ ہے کیا — ضلع یا تحصیل؟''
''پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر سر — ''اور یہ ڈسٹرکٹ کالکا کی تحصیل ہے۔''
گوری شنکر — پنچکولہ سے جب شملہ کی طرف چلتے ہیں تو راستے میں ایک جگہ آتی ہے، پنجور — مشہور جگہ ہے — گارڈن ہے — دیکھا ہے تم نے؟''
''جی سر۔''
گوری شنکر — ''کچھ بتاؤ گے پنجور گارڈن کے بارے میں؟''
''شیور سر — یہ جگہ سر بہت پرانی بتائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پانڈو یہاں اکثر آتے تھے۔ اُس زمانے میں اس کا نام پنچ پورا تھا — لیکن یہ گارڈن جس شکل میں آج ہے اسے مغل بادشاہ اورنگ زیب کے ایک لیفٹیننٹ فدائی خان نے سیونٹھ سینچری (سترہویں صدی) میں ڈیزائن کیا تھا۔ گارڈن کی خاص بات

سر یہ ہے کہ اس میں نیچے کو جاتے ہوئے سات لمبے چوڑے چبوترے ہیں۔ کل 93 سیڑھیاں اتر کر ہم سب سے نیچے والے چبوترے پر پہنچ سکتے ہیں۔

کرن سنگھ — ''تم چنڈی گڑھ میں رہتے ہو — تو چنڈی گڑھ کا روز گاڈن بھی دیکھا ہوگا تم نے؟''

''جی سر — دیکھا ہے۔''

کرن سنگھ — ''کتنی طرح کے پھول ہیں روز گارڈن میں؟''

''صرف ایک طرح کے — گلاب۔''

چندر پال جی نے پہلا سوال کیا — ''کتنی طرح کے گلاب چنڈی گڑھ کے روز گارڈن میں ہیں؟''

''سر، صحیح تعداد تو معلوم نہیں، لیکن لگ بھگ سو طرح کے گلاب تو ہیں وہاں۔''

''کم از کم دس طرح کے گلابوں کے نام بتاؤ جو روز گارڈن میں ہیں۔''

''دہلی پرنسس، آئس برگ، سی پرل، جونرا، کیوبک، کوئن الزبتھ، ریڈ ماسٹر پیس، امریکن ہوم، کس آف فر، سدھارتھ —''

گوری شنکر — ''انڈیا میں کل کتنے ہائی ویز (قومی شاہراہیں) ہیں؟''

''سر 65''

گوری شنکر — ''ان میں سے کتنے ہائی ویز چنڈی گڑھ کو ٹچ کرتے ہیں؟''

''سر، دو — ہائی وے نمبر 21 اور ہائی وے نمبر 22 ہائی وے نمبر 21 چنڈی گڑھ سے بلاس پور، منڈی اور کلو ہوتا ہوا منالی جاتا ہے، اور ہائی وے نمبر 22 انبالہ سے چنڈی گڑھ کالکا، سولن اور شملہ ہوتا ہوا رام پور جاتا ہے۔''

گوری شنکر نے اندر جیت اور کرن سنگھ کی طرف اور پھر ان تینوں نے چندر پال جی کی طرف دیکھا۔ چندر پال جی نے مسکرا کر من پھول سنگھ کی طرف دیکھا اور بولے ''تھینک یو۔''

انہیں یقین ہو گیا تھا کہ من پھول سنگھ کو وہ تمام سوالات پہلے سے بتا دیئے گئے تھے جو اندر جیت، کرن سنگھ اور گوری شنکر نے اُن سے پوچھے تھے — اور من پھول سنگھ ان سوالوں کے جواب رٹ کر آیا تھا۔

سارے انٹرویو میں وہ ایک مشین کی طرح بولتا رہا تھا۔

پانچواں کینڈیڈیٹ سودیش ٹھاکر شملہ سے آیا تھا۔

اندر جیت نے سوالات کا سلسلہ شروع کیا — ''ہمیشہ سے شملہ میں رہے ہو؟''

''جی سر''

اندر جیت — ''شملہ کو برٹش انڈیا میں کیا پوزیشن حاصل تھی؟''

''شملہ برٹش انڈیا کی سمر کیپٹل ہوا کرتا تھا، سر''

کرن سنگھ — ''شملہ ہماچل پردیش کی راجدھانی ہے — یہ ہماچل پردیش Constitute کب ہوا۔ (تشکیل کب ہوئی)؟

''۱۹۶۶ میں سر—''

کرن سنگھ— ''اس سے پہلے اس کی کیا پوزیشن تھی؟''

''اس سے پہلے سر یہ پنجاب کا ایک حصہ تھا۔''

کرن سنگھ— ''پنجاب کتنی بار ٹوٹا ہے؟''

''دو بار سر—''

کرن سنگھ— ''کب کب؟''

''پہلی بار ۱۹۴۷ء میں سر، جب پنجاب کا ایک حصہ ٹوٹ کر پاکستان میں چلا گیا تھا اور دوسری بار ۱۹۶۶ء میں سر، جب اس کا ایک حصہ ہماچل پردیش بنا دیا گیا، دوسرا ہریانہ اور تیسرا حصہ وہ رہ گیا جسے ہم آج پنجاب کے نام سے جانتے ہیں۔''

اندر جیت— ''ہماچل کا کل رقبہ کتنا ہے؟''

''۵۵۶۷۳ اسکوائر کلومیٹر، سر۔''

اندر جیت— ''شملہ کی سطح سمندر سے اونچائی کیا ہے؟''

''۲۱۳۰ میٹر سر—''

کرن سنگھ— ''فٹ میں بتاؤ''

''سات ہزار ایک سو فٹ سر—''

کرن سنگھ— ''یہ پہاڑ کی اونچائی جس آلے سے ناپی جاتی ہے اس کا کیا نام ہے؟''

''شش..... شاید بیرومیٹر سر، آئی ایم ناٹ شیور۔''

گوری شنکر— ''شملہ سے منالی کتنی دور ہے؟''

''۲۷۰ کلومیٹر، سر''

گوری شنکر— ''شملہ کس ہائی وے سے دیش کے دوسرے حصوں سے Connected ہے؟''

''ہائی وے نمبر ۲۲ سے، سر''

گوری شنکر— شملہ کی آبادی آج کتنی ہے؟

سوری سر— نو آئیڈیا، سر''

گوری شنکر— ''چلو ہماچل پردیش کی ہی آبادی کے بارے میں بتاؤ''

''پچاسی لاکھ چودہ ہزار، سر''

اندر جیت— ''شملہ سمجھوتے کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

''سوری سر، نو آئیڈیا۔''

اندر جیت— ''کمال ہے— ایک بھارتیہ اور شملہ سمجھوتے کے بارے میں علم نہیں— خیر— ۱۹۴۶ میں کیبنٹ مشن کی ایک بہت اہم میٹنگ شملہ میں ہوئی تھی جس میں مشن نے جناح صاحب کی

پاکستان کی ڈیمانڈ کو Reject (مسترد) کر دیا تھا۔ کن بنیادوں پر وہ ڈیمانڈ Reject کی گئی تھی؟"

"سوری سر — میں — میں نے ہسٹری نہیں پڑھی ہے۔"

تینوں اے سیز نے چندر پال جی کی طرف دیکھا۔

"تھینک یو مسٹر سودیش ٹھاکر" چندر پال جی نے کہا — اور سودیش ٹھاکر "تھینک یو" کہہ کر چلا گیا۔

چاروں ممبر اپنی اپنی مارکنگ شیٹ تیار کرنے لگے۔

پہلے تین امیدواروں کے نمبر کم تھے۔

چوتھے کنڈیڈیٹ من پھول سنگھ کو اندر جیت نے بیس میں سے اٹھارہ، کرن سنگھ نے سترہ، گوری شنکر نے اُنیس اور چندر پال جی نے دس نمبر دیئے تھے۔ اس طرح انٹرویو میں اُسے اسی میں چونسٹھ نمبر حاصل ہوئے تھے۔ پانچویں کینڈیڈیٹ سودیش ٹھاکر کو اندر جیت نے بیس میں آٹھ، کرن سنگھ نے سات، گوری شنکر نے نو اور چندر پال جی نے سولہ نمبر دیئے تھے۔ اس طرح اسی میں اس نے چالیس نمبر پائے تھے۔ ادھر ایم ایس سی کے مارکس کی بنیاد پر بھی من پھول سنگھ کے مارکس سودیش ٹھاکر سے زیادہ تھے۔ اس طرح دو کینڈیڈیٹ کا جو پینل بنا اس میں نمبر ایک پر من پھول سنگھ اور نمبر دو پر سودیش ٹھاکر تھا — یعنی تقرر من پھول سنگھ کا ہی ہونا تھا۔ اگر کسی وجہ سے من پھول سنگھ جوائن نہ کرتا یا کسی وجہ سے ملازمت چھوڑ کر چلا جاتا — تبھی سودیش ٹھاکر کا تقرر ہو سکتا تھا۔

چندر پال جی بڑے الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ شام کو چھ بجے جب اپنی سرکاری کوٹھی پر پہنچے تو ڈرائنگ روم میں سودیش ٹھاکر کو اپنا منتظر پایا۔

اس سے پہلے کہ سودیش ٹھاکر کچھ کہتا چندر پال جی نے کہا "سوری ینگ مین — مگر تم نے بھی کمال کیا — کیبنٹ مشن تو چلو ہسٹری کا ناپک تھا، مگر شملہ سمجھوتہ! اب اگر کوئی پڑھا لکھا ہندوستانی وہ بھی شملہ کا رہنے والا، شملہ سمجھوتے کے بارے میں نہیں جانتا تو پھر اس کے لیے کوئی معافی نہیں ہو سکتی۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد پاکستان کے ذوالفقار علی بھٹو اور اپنی اندرا گاندھی کے مابین یہ سمجھوتہ ہوا تھا۔"

سودیش ٹھاکر بولا "سر، اگر آپ یہ سوال بھی پہلے سے بتا دیتے تو میں اس کی تیاری کر کے بھی آجاتا۔"

"اب مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ حرام زادہ اندر جیت یہ سوال کر بیٹھے گا۔ جو سوال میں Expect کر رہا تھا وہ میں نے تمہیں بتا دیئے تھے — بہر حال تمہارا اپوائنٹ منٹ نہیں ہو سکا — آئی ایم سوری، میں اور زیادہ مدد نہیں کر سکا — ٹھیرو، میں تمہارے پیسے واپس کرتا ہوں" کہہ کر چندر پال جی اندر چلے گئے۔

سودیش ٹھاکر سوچنے لگا کہ کمشنر چندر پال بہر حال کیرکٹر کے آدمی تو ہیں۔ انہوں نے پچاس ہزار روپے یہ کہہ کر لیے تھے کہ اگر اس کا اپوائنٹ منٹ نہ ہو سکا تو وہ یہ روپے واپس کر دیں گے اور..."

چندر پال جی سو سو روپے کے نوٹوں کی پانچ گڈیاں لیے ہوئے اندر سے آئے اور انہیں سودیش ٹھاکر

کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

چندر پال جی کو اس بات کا ملال تو تھا ہی کہ پچاس ہزار روپے آکر چلے گئے تھے، مگر اس سے زیادہ ملال انہیں اس بات کا تھا کہ بگ باس نے ایک بار پھر انہیں پھٹکنی دے دی تھی۔

''بگ باس'' دانت بھینچ کر انہوں نے دل ہی دل میں کہا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔

تقریباً پانچ منٹ بعد انہوں نے اس طرح چونک کر آنکھیں کھولیں جیسے ان کی سوچ میں کوئی چیز چبھ گئی ہو—

دوسرے دن صبح ٹھیک ساڑھے نو بجے وہ دفتر پہنچ گئے۔ حسب معمول سارا اسٹاف موجود تھا۔ انہوں نے اپنے او۔ ایس سے انٹرویو کی فائل منگوائی— اور اسے کھول کر کچھ کاغذات کا گہری نظر سے جائزہ لینے لگے۔ پھر فائل میں سے ایک کاغذ نکال کر انہوں نے اپنے بریف کیس میں رکھا، فائل کو اپنی میز کی دراز میں رکھ کر دراز مقفل کی اور بریف کیس لے کر دفتر سے باہر آ گئے۔

پچیس منٹ بعد انہوں نے مارکٹ سے اس کاغذ کی فوٹو کاپی کروائی جو انہوں نے فائل سے نکالا تھا۔ اسے لے کر اپنی کوٹھی پر آئے۔ بریف کیس سے اپنا سرکاری لیٹر ہیڈ نکالا اور کاندھاری یونی ورسٹی کے رجسٹرار کو چٹھی لکھنی شروع کی—

''جناب علی— منسلک مارکس شیٹ کی فوٹو کاپی اس گذارش کے ساتھ بھیجی جا رہی ہے کہ برائے مہربانی یہ تصدیق کریں کہ کیا یہ مارکس شیٹ آپ کی یونی ورسٹی سے جاری کی گئی ہے اور اگر کی گئی ہے تو کیا اس کے سارے اندراجات صحیح ہیں— شکریہ''

چٹھی کے ساتھ انہوں نے مارکس شیٹ کی فوٹو کاپی منسلک کی، بریف کیس سے سرکاری لفافہ اور سرکاری ٹکٹ نکالے۔ چٹھی اور مارکس شیٹ کو لفافے میں رکھا، لفافہ بند کیا، ٹکٹ چسپاں کئے، کالونی کے ڈاک خانے جا کر خود چٹھی کی رجسٹری کرائی اور اپنے دفتر چلے گئے۔

دفتر آ کر انہوں نے مارکس شیٹ فائل میں رکھ دی اور او۔ ایس کو بلا کر فائل اس کے حوالے کی اور من پھول سنگھ کا تقرر نامہ تیار کرنے کا حکم دیا۔

ایک گھنٹے کے بعد انہوں نے تقرر نامے پر دستخط کر دیئے اور اسی وقت تقرر نامہ رجسٹرڈ ڈاک سے من پھول سنگھ کو بھجوا دیا۔

چوتھے دن من پھول سنگھ نے جوائن کر لیا۔

اکیسویں دن کاندھاری یونی ورسٹی کے رجسٹرار کا رجسٹرڈ کانفی ڈنشل لیٹر شام کو ساڑھے پانچ بجے چندر پال جی کو اپنی میز پر رکھا ملا۔ دن بھر وہ ڈسٹرکٹ ہارتھ ویسٹ کے پی ڈبلیو ڈی کے ہیڈ کوارٹر میں ایک ضروری میٹنگ میں بزی رہے تھے اور شام کو ساڑھے پانچ بجے آفس پہنچے تھے۔

انہوں نے لفافہ چاک کیا۔

کاندھاری یونی ورسٹی کے رجسٹرار نے لکھا تھا— ''جناب عالی— من پھول سنگھ نام کے کسی بھی

شخص نے ہماری یونی ورسٹی سے کبھی بھی جیالوجی میں ایم ایس سی نہیں کیا ہے۔ جس مارکس شیٹ کی کاپی آپ نے بھیجی ہے، اور جو اس خط کے ساتھ آپ کو واپس کی جارہی ہے، وہ ہمارے یہاں سے کبھی جاری نہیں ہوئی ہے — اور قطعی طور پر جعلی ہے — نیک خواہشات کے ساتھ —

دستخط

رجسٹرار کاندھاری یونیورسٹی

''وہ مارا!'' چندر پال جی نے بغیر آواز کئے ہوئے نعرہ لگایا۔ ان کا شک صحیح نکلا تھا۔ من پھول سنگھ کے نواسی فی صد مارکس نے انہیں شک میں مبتلا کر دیا تھا۔ انہوں نے یونی ورسٹی سے تصدیق کرائی اور اصلیت سامنے آگئی۔

جمعہ کا دن تھا۔ چندر پال جی نے گھڑی دیکھی۔ چھ بج چکے تھے۔ سارا اسٹاف جاچکا تھا، صرف ان کا چپراسی ابھی کمرے کے باہر اپنے اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ چندر پال جی رجسٹرار کا خط اپنے بریف کیس میں رکھا اور کھڑے ہو گئے —

''بگ باس —'' انہوں نے دل ہی دل میں کہا ''اب میں دیکھوں گا اس باسٹرڈ کو — بہت خون پیا ہے اس نے میرا — خود کو لومڑی کی اولاد سمجھتا ہے — اب دیکھوں گا کہ کتنی بڑی لومڑی کی اولاد ہے یہ حرامی۔''

آدھے گھنٹے کے بعد وہ اپنی کوٹھی پہنچ گئے۔ لباس تبدیل کیا۔ پتنی کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی، آدھے گھنٹے گپ شپ کی، پھر اپنی خواب گاہ میں چلے گئے۔ آرام سے پلاننگ کرنا چاہتے تھے۔ ایک بڑا ڈرامائی پنچ دے کر وہ یہ راز افشا کرنا چاہتے تھے کہ بگ باس کے صاحبزادے کی ایم ایس سی کی مارکس شیٹ جعلی ہے اور اس جعلی مارکس شیٹ کی بنا پر انہوں نے این۔ آر۔ ڈی۔ سی میں ملازمت حاصل کی ہے — صاحب زادے جیل جائیں گے، اور اپوزیشن کے لوگ وہ تہلکہ مچائیں گے کہ سبھی کے لیے جواب دینا مشکل ہو جائے گا اور بگ باس کے نیچے سے کرسی تو فوراً ہی کھینچ لی جائے گی — ہر طرف تھو کے جائیں گے، بدنامی کا ایسا تگڑا بونس ملے گا کہ زندگی بھر پبلک لائف میں دوبارہ نہیں آپائیں گے —

چندر پال جی نے طے کیا کہ سوموار کو آفس میں ہی پریس کانفرنس بلا کر یہ راز فاش کریں تاکہ اچھی تگڑی شہرت ہو۔

بڑی طمانیت کے ساتھ انہوں نے رات کا کھانا کھایا۔ پورا دن بہت مصروفیت میں گزرا تھا، بہت تھک گئے تھے۔ اس لیے ٹی وی بھی نہیں دیکھا، اور بڑی طمانیت لیکن سوموار کے انتظار کے ساتھ سو گئے۔ ساری رات خواب میں انہوں نے بگ باس کو اپنے قدموں میں پڑے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر روتے اور منت سماجت کرتے دیکھا۔ ساری رات وہ بگ باس کو ٹھوکریں مارتے رہے اور قہقہے لگاتے رہے۔

حسب معمول صبح چھ بجے ان کی آنکھ کھلی۔

ہاتھ بڑھا کر انہوں نے اخبار اٹھایا۔

پہلی سرخی اس طرح تھی—

محکمہ سڑک کے بگ باس نے اپنے بیٹے کو خود گرفتار کرادیا۔

بیٹے نے ایم ایس سی کی جعلی مارکس شیٹ کی بنا پر این۔ آر۔ ڈی۔ سی میں ملازمت حاصل کی تھی۔ بگ باس کے اس فعل کی ہر طرف ستائش ہورہی ہے۔ پرائم باس نے ستائش اور سپاس گزاری کے اظہار میں بگ باس کو بڑی، یعنی ''اے'' رینک کی کرسی کا آفر دیا۔

چندر پال نے پوری خبر پڑھے بغیر اخبار رکھ دیا۔ وہ یہ نہیں سوچ رہے تھے کہ بگ باس کتنی بڑی لومڑی کی اولاد ہے بلکہ یہ سوچ رہے تھے کہ ان کے اپنے آفس میں وہ کالی بھیڑ کون ہے جس نے کل ان کی عدم موجودگی میں کاندھاری یونی ورسٹی کے رجسٹرار کا کانفی ڈنشل لیٹر کھول کر خبر بگ باس کو لیک کردی اور لفافہ بند کرکے ان کی (چندر پال جی کی) میز پر رکھ دیا۔ ظاہر تھا کہ بگ باس نے اپنا کوئی جاسوس ان کے سر پہ بٹھا رکھا تھا جس کے بارے میں انہیں کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔

انہوں نے ریموٹ کنٹرول اٹھایا اور لیٹے لیٹے ہی ٹی وی آن کردیا اور اٹھ کر بیٹھ گئے—

بگ باس کی گذشتہ رات کی ریکارڈ پریس کانفرنس ٹیلی کاسٹ ہورہی تھی— بگ باس اپنے آفس میں اپنی کرسی پر بیٹھے تھے اور ہمیشہ کی طرح ان کا چہرہ پُرسکون تھا اور اس پر بڑی اپنائیت بھری مسکراہٹ تھی۔ ان کے سامنے کرسیوں پر اخبارات کے نامہ نگار بیٹھے تھے— بگ باس کسی نامہ نگار کے سوال کے جواب میں کہہ رہے تھے— ''میں تو پندرہ برس سے یہاں ہوں— من پھول ہمیشہ چنڈی گڑھ میں رہا، اسے یہاں کبھی اچھا نہیں لگا۔ اس کی ایجوکیشن چنڈی گڑھ میں ہی چلتی رہی۔ وہیں سے اس نے سی بی ایس ای بورڈ سے سینئر سیکنڈری کیا، پھر اپنے ماما کے پاس کاندھاری چلا گیا کیونکہ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ وہاں وہ بی ایس سی کررہا ہے۔ پھر یہ خبر ملی کہ ایم ایس سی کررہا ہے۔ پچھلے سال وہ کاندھاری سے واپس آگیا، کیونکہ اس کے ماما کا سورگ واس ہوگیا تھا۔ مامی پہلے ہی گزر چکی تھیں یہ تو مجھے اب پتہ چلا کہ کاندھاری میں وہ ایم ایس سی نہیں کررہا تھا بلکہ آوارہ گردی کررہا تھا۔''

''پھر آپ کو پتہ کیسے چلا کہ اس کی ایم۔ ایس۔ سی۔ کی مارکس شیٹ بوگس ہے؟'' ایک نامہ نگار نے سوال کیا۔

''پندرہ دن پہلے مجھے کسی نے فون پر بتایا کہ میرے بیٹے نے ایم۔ ایس۔ سی۔ کی جعلی مارکس شیٹ دکھا کر این۔ آر۔ ڈی۔ سی۔ میں نوکری لے لی ہے۔ میں نے چپ چاپ پتہ لگایا— معلوم ہوا کہ اس نے واقعی کہیں سے جعلی مارکس شیٹ حاصل کرکے نوکری حاصل کی ہے۔ میں نے اس کی رپورٹ کردی اور اسے گرفتار کروادیا۔''

ایک نامہ نگار نے کہا ''سر آپ نے جو یہ مثال قائم کی ہے...''

''میں نے کوئی مثال قائم نہیں کی ہے میرے بھائی'' بگ باس اس کی بات کاٹ کر بولے۔ ''میں نے وہی کیا ہے جو ایک ایماندار پبلک سرونٹ کو کرنا چاہیے— میرا سارا جیون، اور چرتر آپ کے سامنے

ہے۔ میں نے بھرشٹا چار کو کبھی سہن نہیں کیا ہے— اگر میرا بیٹا بھی بھرشٹا چاری ہے تو وہ بھرشٹا چاری پہلے ہے، میرا بیٹا بعد میں— جیسے ہی مجھے پتہ چلا میں نے اسے قانون کے حوالے کر دیا— میں اپنا کام کر چکا، اب قانون اپنا کام کرے گا۔"

"باسٹرڈ" کہہ کر چندر پال جی نے ٹی۔ وی آف کر دیا۔

"یہ حرامی کبھی نہ کبھی اس بات کسر کاٹے گا ضرور کہ میں نے اس کے بیٹے کی مارکس شیٹ کی انکوائری کرائی" انہوں نے سوچا— "اونہہ— دیکھا جائے گا۔" سر جھٹک کر چندر پال جی کھڑے ہو گئے۔

تیسرے دن منسٹری سے من پھول سنگھ کی برخواستگی کے احکامات آ گئے— اور چندر پال جی کے لیے ہدایت آ گئی کہ تقرری کے پینل کے دوسرے کینڈیڈیٹ کو تقرر دے دیا جائے۔ احکامات براہ راست بگ باس کے دستخط سے آئے تھے۔

چندر پال جی کا سارا پلان ان کے آفس کے کسی غدار کی وجہ سے فیل ہو گیا تھا۔ اب تو انہیں صرف اتنے پر ہی اکتفا کرنا پڑ رہا تھا کہ بگ باس کا بیٹا گرفتار ہو گیا ہے اور عدالت سے اسے سزا بہر حال ہو کے رہے گی۔

انہوں نے اسی دن سودیش ٹھاکر کو شملہ فون کیا۔

تین دن اور گزر گئے۔

من پھول سنگھ اسی رات کو ضمانت پر حوالات سے باہر آ گیا تھا جس رات کو وہ گرفتار ہوا تھا۔ پولس اس آدمی کو تلاش کر رہی تھی جو بقول من پھول جعلی ڈگریوں اور جعلی مارکس شیٹ کا دھندا کرتا تھا اور جس سے من پھول سنگھ نے ایم ایس کی جعلی مارکس شیٹ خریدی تھی— وہ انڈر گراؤنڈ ہو گیا تھا۔

بگ باس نے شکریے اور انکسار کے ساتھ "اے" رینک کی کرسی قبول کر لی تھی، اور اس پر بیٹھ چکے تھے۔

ان کے احترام اور وقار میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔

سب کچھ چندر پال جی کی نگاہوں میں تھا۔

"خیر— پھر کبھی سہی بگ باسٹرڈ—" انہوں نے زیر لب کہا۔ "کبھی نہ کبھی تو میرا کوئی داؤں چلے گا— تمہیں برباد کر دینا اب میری زندگی کا مشن ہے۔"

انہوں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے چھ بج رہے تھے۔

دفتر سے نکل کر وہ کوٹھی پہنچے۔ سودیش ٹھاکر ان کے ڈرائنگ روم میں ان کا منتظر تھا۔ وہ جا کر اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔ سودیش نے انہیں نمستے کیا اور اپنے بیگ میں سے سو سو روپے کے نوٹوں کی پانچ گڈیاں نکال کر چندر پال جی کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

چندر پال جی پچاس ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو گئے اور اندر جانے لگے— اسی وقت اینٹی کرپشن کی پوری ٹیم ان کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور انہیں بھرے ہاتھوں گرفتار کر لیا۔

فزکس، کیمسٹری، الجبرا...

(اپنی بیٹی صحیفہ کے نام)

'**نہیں انجلی**۔ یہاں نہیں۔ یہاں میں پڑھ رہا ہوں، نا۔ یہاں سے جاؤ'

'لیکن کیوں پاپا؟'

'بس۔ میں نے کہہ دیا نا۔ جاؤ۔ کبھی کبھی سن بھی لیا کرو۔'

'پاپا۔ مجھے یہاں اچھا لگ رہا ہے۔'

'نہیں۔ میں نے کہہ دیا تھا۔ میں کچھ ضروری کام کر رہا ہوں۔ سنا نہیں تم نے۔

'پاSS پاSS' آواز میں ہلکی سی خفگی تھی۔ تمہارے پاس اچھا لگتا ہے مجھے۔'

ہمت جٹاتا ہوں۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اُس کے قریب آتا ہوں۔ بن ماں کی بچی۔ دل میں بہت سارا پیار اُمڈتا ہے۔ اندر کے غصے کو اُس کے معصوم چہرے پر ہولے، سے رکھ دیتا ہوں۔ جیسے 'دیا سلائی' کے ننھے سے شعلے پر موم کو— پتہ نہیں کتنا پگھلا ہوں؟ یا شاید پگھل گیا ہوں۔ اس کے سر پر آہستہ آہستہ انگلیاں پھیرتا ہوں۔

'میں تمہارے سامنے پڑھتی ہوں تو اس طرح ناراض کیوں ہوتے ہو؟'

انجلی 'ہنپا' ہے— 'جاؤ نہیں بولتی۔'

'اچھا۔ ناراض نہیں ہوتا۔' میں ہنس دیتا ہوں۔

'ہنپا' انجلی خوش ہو کر بچوں کی طرح مجھ پر بچھنا چاہتی ہے۔ میں پیچھے ہٹتا ہوں۔ اُس کے ہاتھوں کو، نہیں۔ اُس کے جسم کو خود سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔

'نہیں۔ نہیں انجلی۔ ٹھیک ہے... بچپنا نہیں۔ اب بڑی ہو رہی ہو تم... سمجھ گئی... بڑی ہو رہی ہو۔'

''ہونہہ۔ پپا کے سامنے بڑے، بچے ہی رہتے ہیں۔'

'لیکن تم...' وہ بچی ہو کہتے کہتے ٹھہر جاتا ہوں۔ انجلی حیرانی سے میرا منہ تکتی ہے۔

'تم کیا پاپا...'

مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ 'تم نہیں سمجھوگی، انجلی۔

انجلی منہ بچکاتی ہے۔ 'میں اب بڑی ہوگئی ہوں۔ میں اب سب سمجھتی ہوں پاپا۔ ہاں، کبھی کبھی تم سمجھ میں نہیں آتے پاپا۔ لو، میں تمہارے پاس سے جا رہی ہوں۔ لیکن سنو، اکیلے کمرے میں مجھے ڈر لگتا ہے۔ اب میں تمہارے پاس ہی سویا کروں گی، پاپا۔ تمہارے ہی کمرے میں۔'

'میرے کمرے میں؟'

'کیوں، سب بچے سوتے ہیں۔'

'نہیں۔ میں نے اس لیے پوچھا کہ میں رات بھر لائٹ جلا کر کچھ نہ کچھ آفس کا کام کرتا رہتا ہوں۔'

'مجھے لائٹ ڈسٹرب نہیں کرے گی پاپا۔' انجلی مسکرائی ہے۔ 'کل سے یہیں سو جاؤں؟'

'نہیں۔ بس۔ کہہ دیا نا۔ اب تم بڑی ہو رہی ہو۔ اس سے زیادہ سوال نہیں۔'

انجلی کے معصوم چہرے پر سوالوں کی سلوٹیں بکھر جاتی ہیں۔ میں جاتے جاتے اس کے الفاظ میں دُکھ محسوس کر لیتا ہوں۔

'کوئی بات نہیں پاپا'

انجلی اپنے کمرے میں واپس لوٹ گئی ہے۔ اس کی سلوٹوں بھری سوالیہ آنکھیں اب بھی کمرے میں موجود ہیں۔ یہ آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔

'انجلی کو کیوں بھیج دیا؟

میز پر آفس کی کچھ بیحد ضروری فائلیں بکھری پڑی ہیں۔ لیکن ابھی، اس لمحے مجھے ان فائیلوں کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

'انجلی کیوں گئی؟ میں نے اُسے اپنے کمرے میں کیوں بھیج دیا۔؟

پتہ نہیں، لیکن شاید یہ میرے اندر کا سناٹا ہے، جو مجھ سے لڑ رہا ہے۔ کیا ہو جاتا ہے تمہیں۔ کیا ہو جاتا ہے تمہیں۔ اچھے خاصے آدمی سے اچانک 'لڑکی' کے باپ کیوں بن جاتے ہو۔ بن جاتے ہو، چلو کوئی بات نہیں۔ لیکن اپنی ہی لڑکی سے ڈرنے کیوں لگتے ہو—

ایک بزدل آدمی جرح کرتا ہے۔ 'نہیں۔ جھوٹ ہے۔ ڈروں گا کیوں؟'

سناٹا ہنستا ہے۔ 'دیکھو اپنے آپ کو غور سے دیکھو۔ تم ڈر گئے تھے۔ کیونکہ — 'اندر کا سناٹا ایک انتہائی فحش سا جملہ اچھالتا ہے۔ تم اسے عموماً ایسے لباسوں میں نہیں دیکھ پاتے۔ ہے نا sss یار، وہ کانونٹ میں پڑھتی ہے۔' سناٹا قہقہہ لگاتا ہے۔ کانونٹ یا نئے زمانہ کی لڑکیاں اب آنچل یا اوڑھنی کا استعمال نہیں کرتیں۔ وہ اپنے بدن پر کپڑوں کا بہت زیادہ بوجھ ڈالنا نہیں چاہتیں۔ تو کیا ہوا۔ وہ تمہاری بیٹی ہے۔'

'بس ڈر جاتا ہوں۔'

'لیکن کیوں؟'

لمبی لمبی سانس لیتا ہوں۔ کہہ نہیں سکتا۔

'بیٹی میں لڑکی تو نہیں دیکھنے لگتے؟'

اندر کا سناٹا دیر تک ہنستا رہتا ہے۔

(۲)

اس دن مسز ڈھلن سے یہی تو پوچھا تھا میں نے—

'بیٹیوں میں لڑکیوں کا جسم کیوں آجاتا ہے'

'کیا؟' مسز ڈھلن زور سے چونکی تھیں— لڑکیوں کا جسم— ہنستے ہنستے چائے کے کپ پر ان کے ہاتھ تھرتھرائے تھے— 'آپ شادی کرلو، آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں—'

'بٹی میں لڑکی کا جسم۔ میں نے بہت معمولی بات کہی ہے، مسز ڈھلن۔ یہ لڑکیاں کیوں اگ آتی ہیں بٹی میں— لڑکیاں۔ پرائی لڑکیاں۔ پرائی لڑکیوں کے جسم پر، مدھومکھی کے چھتوں کی طرح، گرتی ہوئی پرائی آنکھیں— یہ بیٹیاں بس بیٹیاں کیوں نہیں ہوتیں— بغیر جسم والی— نہیں، سنو مسز ڈھلن! قصور آپ کا نہیں۔ یقیناً آپ میری بات نہیں سمجھ سکتیں— لیکن بیٹیوں میں یہ لڑکیوں والا جسم نہیں آنا چاہیے ہے، نا؟'

☆☆

شاید سب کچھ اچانک بدلا تھا اچانک۔

ہاں، شاید سب کچھ اچانک ہی بدل جاتا ہے۔ گھر میں خوشیوں کا ایک روشندان تھا میرے پاس۔ سنہری کرنیں آیا کرتی تھیں۔ یہ سنہری کرنیں مسکراتیں تو گھر جگمگ، جگمگ کرنے لگتا—

وہ انجلی کی ماں تھی— روشن دان سے جھن جھن جھانکنے والی روشنی کی کرن—

'تمہیں پتہ ہے، پہلی بار اسکیٹنگ کرنے والوں کو برف کیسی لگتی ہے؟'

'نہیں'

'چکنی اور خوبصورت۔'

یہ اس کے لیے میرا کمپلی منٹ تھا—

وہ زور سے ہنسی تھی— ''کیا یہ تمہاری پہلی اسکیٹنگ ہے۔'

'اگر ہاں کہوں تو؟'

'یقین کرلوں گی۔'

''تو پھر یقین کرو۔ اس سے پہلے کبھی برف پر چلنے کا خیال ہی نہیں آیا۔'

'برف پر—' اس کے موتیوں جیسے دانت ہنس رہے تھے— اُف کتنے شفاف اور قرینے سے رکھے ہوئے———

'کیا یہ سارے ہیرے میرے ہیں؟' میں نے اس کے ہونٹوں کا بوسہ لیا۔

ہاں' وہ پھر دلکش انداز میں ہنسی تھی— 'اُس کے لیے جو پہلی بار اسکیٹنگ سیکھ رہا ہے—'

☆☆

پھر یہ اسکیٹنگ جیسے زندگی کا ایک حصہ بن گئی۔ گھر میں خوشیوں والا روشندان کھل گیا—

وہ مسکراتی تھی—

'اب کہیں اسکیٹنگ کرنے جاتے ہو یا نہیں؟'

'تم سے ہی فرصت نہیں ملتی—'

'اب کرو گے بھی نہیں۔ اس لیے کہ تمہیں اسکیٹنگ سے روکنے والی آ رہی ہے—'

☆☆

یہ انجلی تھی، جس کے بارے میں شروع سے ہی اس کا خیال تھا۔ بچی ہوگی۔

'کیوں؛

'زیادہ تر بچیاں اپنے لیے سردیاں پسند کرتی ہیں۔ میں خود سردی کے موسم میں پیدا ہوئی تھی۔ سنو۔ اگر بنی ہوئی اور بنی نے تمہاری طرح اسکیٹنگ کرنی چاہی تو—؟'

میرا چہرہ ایک لمحے کو فق ہو گیا تھا۔

وہ زور سے ہنسی— بس ہو گئی نا چھٹی۔ تم مردوں میں ہر وقت ایک چور مرد کیوں رہتا ہے۔ بیٹا ہو تو تاڑ پر چڑھا دو۔ دس گناہ معاف۔ کچھ بھی پہن لے۔ دس دس محبوباؤں کے ساتھ گھومتا رہے۔ مگر بیٹیاں۔'

وہ میرے چہرے پر جھک گئی تھی—

'ساری— میں کھیل کر رہی تھی—' اس کی مخروطی، جلتی انگلیاں میرے برف جیسے چہرے پر موم کے شعلوں کی طرح اپنی آنچ دے رہی تھیں— میں جانتی ہوں، تم ایسے نہیں ہو— تم اپنی بنی سے بھی ویسی ہی محبت کرو گے، جیسے— ہے نا— بنی اگر میری طرح ہوئی تو—'

میں نے پھونک مار کر شعلہ بجھا دیا تھا—

'بنی تمہاری طرح نہیں ہونا چاہیے'

'کیوں؛

میں شاید خاموش رہ گیا تھا۔ بنی اگر بڑی ہوئی تو—؟ وہی خاموشی سے ڈس جانے والا کمپلکس— یہ بدن کچھ جانا پہچانا سا ہے— یہ چہرہ کچھ—

(۳)

شاید اسی لیے انجلی کی پیدائش پر میں زور سے ڈرا تھا۔ نومولود بچوں کا چہرہ اتنا زیادہ ماں یا باپ سے نہیں ملتا۔ لیکن انجلی میں اُس کی ماں مسکرا رہی تھی— انجلی کو نہارتے ہوئے میں اچانک زور سے چیخا تھا۔

'نیکر— نیکر کہاں ہے؟''

'شی— جاگ جائے گی؟' اس کے چہرے پر خفگی تھی۔ زور سے چلائے کیوں۔ وہ ہنسی— 'شوشو ہو گئی تھی اس لیے۔ دیکھو۔ وہاں میز پر نیکر پڑا ہے۔ بدل دو نا پلیز—'

پتہ نہیں۔ لیکن شاید بہت کچھ بدلنے کی ابتدا ہو چلی تھی———

میں نے میز سے نیکر اٹھا لیا۔

مگر میرے ہاتھ کیوں کانپ رہے تھے۔

'سنو، تم بدل دو۔'

'یوں؟ اِتا سا کام بھی تم لوگوں سے نہیں ہوتا۔ تم مردوں سے۔ بس بیوی ہی نو مہینے تک پاگل بنی رہے۔ تمہارا بچہ ہے۔ تم کیوں نہیں نیکر بدل سکتے — سنو —'

وہ انجلی کا نیکر بدل رہی تھی۔ میں کہیں اور دیکھ رہا تھا۔

'سنو۔ انجلی کے آجانے سے میرے بھی کام بڑھ جائیں گے۔ تم بزی رہتے ہو۔ لیکن سنو، انجلی کو صبح صبح تم ہی نہایا کرو گے۔ ٹھیک ہے نا؟

'نہیں۔'

سردیوں کے موسم میں جیسے دانت بجتے ہیں۔ اندر کنوئیں سے کوئی صدا اوپر تک آتے آتے تھم گئی تھی۔

'کیسے باپ ہو، اپنے بچے کو گود میں تو لو؟'

اس نے انجلی کو اچانک اٹھا کر میری گود میں ڈال دیا تھا۔ وہ ہنس رہی تھی۔

'کیسا عجیب سا لگ رہا ہے۔ ہے نا؟ جیسے میں ننھی سی ہو کر تمہارے ہاتھوں میں سمٹ گئی ہوں — مجھے زور کا کرنٹ لگا تھا —

☆☆

انجلی کے ایک سال کے ہونے تک یہ سب سلسلے چلتے رہے۔ یہ لڑکیاں صفائی کے معاملے میں پیدائش سے ہی بڑی sensitive ہوتی ہیں۔ انجلی زیادہ اُسی وقت روتی تھی، جب اُس نے شوشو کر دیا ہو۔ کبھی کبھی وہ کچن میں مصروف ہوتی تو وہیں سے ڈانٹ لگاتی۔

'نیکر بدل دو۔'

شاید وہ پہلا واقعہ تھا۔ نہیں حادثہ — نہیں، واقعہ کہنا ہی بہتر ہوگا — وہ شاید شاپنگ کے لیے گئی تھی اور انجلی زور زور سے روئے جا رہی تھی۔ مجھ میں ایک باپ جاگ پڑا تھا۔

لیکن کیسی ہمت کی کمی تھی مجھ میں؟

اور کیوں؟

پیشاب سے چپ چپاتے پلیے سے میں نے اُسے اٹھا تو لیا — مگر، میرے ہاتھ پیشاب میں سنے نیکر اُتارتے ہوئے ہوئے کانپ رہے تھے — اُس کے ننھے ننھے سے پاؤں میں دوبارہ صاف ستھری نیکر پہنانے تک میں نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کی طرف دیکھنا گوارہ نہیں کیا تھا۔ لیکن کیوں؟

ایک سہمے سہمے سے باپ کو آخر اتنا سمجھانا کیوں پڑتا ہے؟

بچی ہنس پڑی تھی۔ اب میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ ہولے سے 'منّے' سے ہاتھوں کو چھوا — پاؤں میں چاندی کے کڑے تھے — وہ آسمان سے اترا ہوا فرشتہ لگ رہی تھی۔

بیساختہ اُسے میں نے گود میں اٹھا لیا۔ پیشانی پر چمی لی۔

'میری بیٹی۔ میری انجلی'

وہ شاید پہلے ہی آچکی تھی، لیکن چھپ کر یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ اُس نے زور سے تالیاں بجائیں——

'گڈ آج سے تم باپ بن گئے۔ اب میری ضرورت نہیں رہی۔'

'ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟'

'کیونکہ تم میں ایک باپ آگیا ہے؟ وہ ہنس رہی تھی—— 'سنو' اس باپ کو بزدل نہیں ہونا چاہیے—— سنو، میں اس باپ کو بزدل نہیں بنا سکتی——'

وہ دوڑ کر آئی۔ اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے——

'دیکھو—— انجلی ہنس رہی ہے۔ ہنس رہی ہے نا——؟'

(۴)

شاید اس نے صحیح کہا تھا۔

مجھ میں ایک باپ جاگ گیا تھا اور شاید اسی لیے وہ ہمیشہ کے لیے سونے چلی گئی—— اُس رات کی نیند اتنی گہری تھی کہ وہ کبھی نہیں جاگی—— انجلی میری گود میں تھی—— اور میں آسمان کے کنارے تلاش کر رہا تھا۔ اس کنارے سے اُس کنارے تک پھیلا ہوا آسمان—— ایک لمبی زندگی اور معصوم سی، مٹھی بھر ہاتھوں میں سما جانے والی انجلی۔

انجلی بڑی ہو رہی تھی۔ باپ ڈر رہا تھا—— باپ دوست بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن، لڑکی یا عورت کے بدن سے جڑی ہوئی کچھ ایسی 'خفیہ' کہانیاں بھی تھیں، جو اچانک پُراسرار راتوں کی طرح جاگ جاتی ہیں۔ کبھی کبھی سہمی راتیں مجھ میں ڈر پیدا کر دیتیں—— خاص کر سرما جیسے موسم میں۔ ایک ہی لحاف میں—— انجلی کے بدن سے لپٹے ہوئے ہاتھ اچانک، خرگوش سے سانپ جیسے بھیانک ہو جاتے——

میں لیمپ روشن کر دیتا۔ کمرے کو اپنی لمبی لمبی اور گہری گہری سانسیں سونپ دیتا ہوں۔

یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ انجلی بیٹی ہے۔ بیٹی ہے۔ دو اکیم دو۔ دو دونی چار—— انجلی بیٹی ہے—— بیٹی ہے—— بیٹی ہے—— دو اکیم دو۔ دو دونی چار—— انجلی بیٹی ہے—— بیٹی ہے—— بیٹی ہے—— میں اپنی سانسوں سے الجھنے کی کوشش کر رہا ہوں——

انجلی میری بیٹی ہے۔ میری جانو—— یار، یہ بیٹیوں میں، اچانک لڑکی جیسا بدن کیوں آجاتا ہے——؟

شاید اپنے آپ کو مضبوط کر رہا ہوں۔ مسکراتا ہوں۔ انجلی کی پیشانی کا بوسہ لیتا ہوں—— پاکیزگی سے بھرا بوسہ—— لحاف اوڑھاتا ہوں۔ ٹھنڈک بڑھ گئی ہے—— لیمپ بجھاتا ہوں۔

لیکن انجلی کے لحاف میں گھسنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

کیوں؟

لحاف کے اندر سے انجلی کا بدن ہنس رہا ہے— میں ٹھٹھر رہا ہوں۔ باہر ٹھنڈک بڑھ گئی ہے— نیند نہیں آرہی ہے— سگار، ایش ٹرے، اندھیرے میں یہ ہاتھ میں سب کچھ تلاش کر لیتے ہیں۔ ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا ہوں— سگار کا دھواں اور لحاف کے اندر ہلتی ڈلتی ہوئی انجلی—

شاید یہ اُسی فیصلے کی گھڑی تھی———

نہیں انجلی، اب تمہیں بستر الگ کرنے ہوں گے— سمجھ رہی ہو نا— اب بڑی ہو رہی ہو تم— اور— پڑھائی بھی تو کرنی ہے تمہیں—

☆☆

'انجلی کی کیا عمر ہوگئی ہوگی اب؟'

یہ مسز ڈھلن تھیں— فائل پر جھکی ہوئی نگاہیں———

'چہ— چودہ—' کہتے کہتے ٹھہر گیا ہوں—

'مائی گاڈ— مسز ڈھلن کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی ہے۔ ''۱۴ کی ہوگئی انجلی— اب آپ کی ذمہ داریاں بڑھ جائیں گی سر۔ گھر میں اور کون کون ہے— میرا مطلب، عورت—

'پہلے ایک آیا تھی—'

'تھی—؟'

'ہٹا دیا—'

'کیوں'

'وہ انجلی سے زیادہ مجھ میں دلچسپی لیتی تھی۔'

'اوہ نو—' فائل سے اوپر اٹھی ہوئی نگاہیں— انجلی کو اس عمر میں عورت کی ضرورت ہے سر۔'

'عورت کی ہے؟'

'Obviously — عورت کی سر—' مسز ڈھلن ہنستی ہیں۔ میں کیسے سمجھاؤں آپ کو— آپ—'

ایک خوفزدہ باپ اپنی منہ لگی اسسٹنٹ کے سامنے چپ ہے— پریشان سا—

'کیا بات ہے مسز ڈھلن'

'آپ کی زبان میں سمجھاؤں سر، وہ ہنستی ہے۔ اس عمر میں ایک خوبصورت حادثہ لڑکی کا انتظار کر رہا ہوتا ہے— خوبصورت، نہیں سمجھ میں آنے والا اور دماغ کی رگیں چٹخانے والا— کیونکہ لڑکی جوان ہو رہی ہوتی ہے—

'جوان—' سناٹے میں میزائل چھوٹی۔

'یس سر'

مسز ڈھلن نے فائل بند کر دی۔ 'بہتر ہے آپ اس آیا کو پھر بلا لیں—'

'مسز ڈھلن۔ میں آہستہ سے چیختا ہوں۔ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں—

'پی— پی ریڈ۔ اس عمر میں لڑکیوں کو—'

مسز ڈھلن آگے بڑھ جاتی ہیں—

مجھے کچھ نظر نہیں آرہا ہے— کمرے کا رنگ اچانک سرخ ہوگیا ہے— لال لال— کھڑکیوں پر چڑھے ہوئے شیشے— دیواریں— اور زمین— سب لال لال— سرخ سرخ— میری آنکھوں کے آگے— اندھیرا ابھی— میں سر تھامنے کی کوشش کرتا ہوں—

'انجلی'

یہ بینیوں میں لڑکیاں کیوں آجاتی ہیں—

☆☆

'اس دن میں، دفتر سے گھر جلد لوٹ آیا تھا۔ دروازے پر داخل ہوتے ہی زور سے چیخا—

انجلی!

مگر کوئی نہیں۔ دروازے کے پٹ کھلے تھے— سیڑھیاں خاموش تھیں— اندھیرے میں، اسکرین پر الفریڈ ہچکاک کی کوئی فلم شروع ہوگئی تھی— سسپینس اور تحیر سے بھری ہوئی فلم—

انجلی—

باپ الگ الگ دروازے پر دستک دیتا ہے— چلاتا ہے— انجلی— وہ 'بڑی سی انجلی' کو اچانک دریافت کرلینا چاہتا ہے۔ مگر اس اچانک دریافت کے بعد— سرخ سناٹے، جیسے ذہن کو چیونٹیوں کی طرح کاٹے جارہے ہیں— انجلی— یہاں بھی نہیں— اس کمرے میں بھی نہیں۔ کہاں گئی۔ بیک گراؤنڈ سے تیز میوزک— دروازہ کھلا ہے۔ انجلی نہیں ہے۔ کہاں گئی ہوگی— کہیں گئی ہوگی یار— بینیاں اچانک جوان ہوجاتی ہیں۔ کشمکش بھرے لمحے میں خود کو دی جانے والی تسلیاں— کہیں گئی ہوگی۔ مگر۔ اس طرح۔ گھر کو کھلا چھوڑ کر— اور— وہی— سرخ انقلاب—

ذہن میں چکر آرہے ہیں—

بالکنی پر آگیا ہوں— یہ سانسیں دھونکنی کی طرح کیوں چل رہی ہیں— تیز تیز— شاید مجھے کچھ ہورہا ہے۔ نظروں کے آگے یہ کیسا سرخ انقلاب مجھے پریشان کیے جارہا ہے—

ایک بار پھر زور سے چلاتا ہوں— انجلی!

سرخ منظر ایک ایک کرکے 'لیزر' کرنوں کی طرح انجلی کے بدن میں داخل ہوتے چلے جارہے ہیں— سامنے اسکرین پر انجلی کا بدن روشن ہے— اور لیزر کرنیں— سرخ لیزر کرنیں—

مجھے شاور کی ضرورت ہے— اس بدن کو ہٹاؤ— انجلی کے بدن کو ہٹاؤ—

میں دونوں ہاتھوں سے سر تھامتا ہوں۔ باتھ روم کی طرف تیزی سے بھاگتا ہوں— دروازہ کھولتا ہوں اور—

باتھ روم کے دروازہ کے کھلتے ہی ہینگر پر لپٹے ہوئے سانپ جیسے زور سے اچھل کر مجھے ڈس لیتے ہیں۔ میں چیخنا چاہتا ہوں مگر چیخ جیسے اندر گھٹ کر رہ گئی ہے — میرا جسم تھر تھر کانپ رہا ہے۔ باتھ روم کی ہر ایک شے میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ سرخ ٹائلس۔ ان کے درمیان اسی کلر سے میچ کرتا باتھ ٹب — ہلکا ہلکا کھلا ہوا شاور — شاور کے چھید سے ٹپکتے ہوئے قطرہ قطرہ پانی کی بوندیں — اور اُدھر شاور کے داہنی طرف بے ڈھنگے پن سے ہینگر کی سرخ 'روٗ' میں 'کھوسی' گئی انجلی کی برا اور پینٹی —

شاور کے چھید سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی ہیں — ٹپ — ٹپ —

میری آنکھیں سہم گئی ہے —

بدن لرز رہا ہوں —

گلہ سوکھ گیا ہے —

جسم کے اندر بھونچال آ گیا ہے —

ریزہ ریزہ کانپ رہا ہے —

کیمرہ باتھ روم میں نہ اب کہیں Pan ہو رہا ہے نہ ٹلٹ اَپ، نہ ہی ٹلٹ ڈاؤن — وہ جیسے اُسی منظر پر Freeze ہو گیا ہے — انجلی کے کپڑے اور —

شاور کے چھید سے ٹپکتی ہوئی پانی کی بوند —

انجلی!

جیسے بجلی کا کرنٹ لگتا ہے۔

میرے منہ سے ایک زور کی چیخ نکلتی ہے — تھر تھر کانپتا ہوا کمرے میں آتا ہوں — بستر پر رکھا ہوا کمبل اٹھاتا ہوں — نہیں، مجھے ایک شکار کرنا ہے — باتھ روم میں سانپ آ گیا ہے — یہ کمبل نہیں ہے، شکاری کا پھندہ ہے —

پھر وہی باتھ روم — سرخ ٹائلس — اور میرا شکار ہے — آنکھیں خوفزدہ ہو کر دوسری طرف کرتا ہوں۔ کمبل ایک جھٹکے سے انجلی کے اندر پہنے جانے والے لباس پر پھینکتا ہوں — پکڑ لیا چور — ہاتھ لرز رہا ہے۔ بدن میں خون کی گردش بڑھ گئی ہے۔ پاؤں کانپ رہے ہیں — ہاتھ میں چوہے دانی ہے اور اندر حرکت کرتا ہوا چوہا — او پکڑ لیا — انجلی کا کمرہ ہے — اس کا وارڈ روب — آنکھ بند کر کے کمبل کھولتا ہوں — اور یہ گیا چوہا — کمبل وہیں پھینک باتھ روم کی طرف دوڑتا ہوں۔ شاور چلاتا ہوں — آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔ پانی کی تیز بوند سر پر پڑتی ہے۔ ایک ذرا سا خیالوں کی برہنہ گپھاؤں سے باہر نکلا ہوں —

یہ مجھے کیا ہو گیا تھا —

میں انجلی کی آواز سن رہا ہوں — پاپا — پاپا —

انجلی آ گئی ہے —

پانی میں ارتعاش پیدا ہوا ہے — میں اپنے جسم کو نارمل ٹمپریچر پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں —

پاپا— پاپا—
انجلی بیٹی ہے— بیٹی— میری پیاری بیٹی— دوا کیم دو۔ دو دونی چار— بیٹی ہے— بیٹی ہے—

☆☆

'چیخ کیوں رہے تھے؟'

'تم گئی کہاں تھی؟'

'جاؤں گی کہاں۔ مینو سے نوٹس مانگنے گئی تھی۔'

'مینو؟'

'ہاں۔ وہ پڑوس والے شرما انکل کی بیٹی۔ لیکن تم چیخ کیوں رہے تھے— پتہ ہے۔ دروازہ کھلا رہ گیا تھا، اس لیے ساری پاپا۔ مجھے خیال نہیں رہا—

کوئی بات نہیں'

میں مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ انجلی بیٹی ہے۔ دو دونی چار— دوا کیم دو—

'ایسے کیا دیکھ رہے ہو پاپا'

'کچھ نہیں'

'نہیں۔ کچھ تو ہے۔'

'دیکھ رہا ہوں کہ اب میری بٹیا بڑی ہوگئی ہے۔'

'تو؟ اب میری شادی کرو گے؟' انجلی مسکرا رہی ہے۔ یہ ایک دم سے باپ کیوں بن جاتے ہو۔ اولڈ فیشنڈ۔' آگے بڑھ کر اس نے میرے گلے میں پیار سے اپنی بانہیں ڈال دی ہیں۔ 'تم ایک دوست ہو پاپا۔ میرے لیے— پاپا سے زیادہ دوست۔'

'ہاں بٹیا' میں تمہارا دوست ہی ہوں۔'

انجلی کے ماتھے پر Kiss کرتا ہوں— 'دوست ہوں۔ لیکن تمہیں اچانک اتنا بڑا نہیں ہو جانا چاہیے تھا—'

مسز ڈھلن کے لفظ چاروں طرف سے مجھے گھیر رہے ہیں— ایک خاص طرح کا ساؤنڈ ایکفٹ EChO— انجلی کو دیکھ کر میں مسکرانا چاہتا ہوں مگر وہی—

— ہر زور ظلم کی ٹکر میں انصاف ہمارا نعرہ ہے۔

سرخ سرخ انقلاب—

مسز ڈھلن کے بجتے ہوئے لفظ— ''اس عمر میں ایک خوبصورت حادثہ لڑکی کا انتظار کر رہا ہوتا ہے— خوبصورت اور نہیں سمجھ میں آنے والا— پھر دھماکہ ہوتا ہے— پیریڈ— تیز دھماکہ— جیسے ایک ملک نے دوسرے پر بمباری شروع کر دی ہو— دھائیں دھائیں—

معمول میں آنے تک انجلی سے ایک اٹ پٹا سا سوال کر دیتا ہوں—

'تم ٹھیک تو ہو بیٹی۔ میرا مطلب یہ رات میں؟'

'رات میں—'

'ر—ا—ت—' رات میرے ہونٹوں پر آ کر طلسم ہوش ربا کی پتھر بنانے والی ساحرہ بن گئی ہے— ہاں، رات میں— ٹھیک ہو، نا— میرا مطلب ہے—'

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے رات وات میں کچھ نہیں ہوتا ہے۔ دیکھو۔ میں بالکل فٹ ہوں۔'

انجلی میرے سامنے تن گئی ہے۔

میں مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں— اندھیرے میں، آسمان پر چمکتے ایک پیارے سے تارے کو 'ہولے' سے چھو لیتا ہوں— نہیں— میں بالکل ٹھیک ہوں اور صحتمند—

(۵)

کیا میں پرورٹیڈ ہوں؟

نہیں۔ مجھے یقین ہے، میں پرورٹیڈ نہیں ہوں۔ میں گندے ذہن کا آدمی نہیں ہوں۔ ویسا آدمی، جیسا ہمارے ماحول میں عام طور پر ۴۰ کے بعد کے مرد ہو جاتے ہیں— انہیں کہیں بھی دیکھ لیجئے۔ بس اسٹاپ سے کلب اور اپنے خوبصورت دفتر کے 'رعب دار' کمرے میں اپنی حسین سکریٹری کو ڈکٹیشن دیتے ہوئے— وہ اس بات پر دل کھول کر ہنستے ہیں کہ بغیر کرسیوں والے باس کے کمرے میں، باس کے 'بیٹھ جاؤ' کہنے پر نئی نئی آئی ہوئی سکریٹری نے ادھر اُدھر کرسیاں تلاش کرنے کے بعد پوچھا تھا۔ کہاں بیٹھوں سر، یہاں تو کرسیاں ہی نہیں ہیں—'

وہ بہت کچھ گھر سے ساتھ لے کر آتے ہیں— پرانی بیوی کا اداس بستر— اس کے ڈھلتے جسم کی 'سدا بہار' جوانی اور پہلے جن پتھ Kiss کے نان وتج لطیفے— وہ جانتا تھا، یہ سب اندر کا فرسٹریشن ہے اور کچھ نہیں— ان ڈھلتی ہوئی عمر کی پائیدان پر کھڑے مردوں کے لیے جوانی کا اشتہار، بن جانے کی روایت کوئی نہیں ہے— جسم سونے لگتا ہے تو ہونٹ بولنے لگتے ہیں اور آنکھیں زہریلی ہونے لگتی ہیں—

لیکن—

انجلی کی ماں کے مرنے کے بعد سے لے کر اب تک، اور اس کے لیے کسی Psychiatrist یا Sexologist کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کبھی بھی گندی ذہنیت کا قائل کبھی نہیں رہا— ڈھلان پر کی ڈھلان باتیں، نان وتج لطیفے— میں ان لطائف میں انجلی کی ماں کا مذاق نہیں اڑا سکتا تھا— عورت میرے لیے دیوی یا تقدس کی مورتی نہ سہی، لیکن لائق احترام شے ضرور رہی، اس لیے مجھے ہمیشہ خود پر ناز رہا— میں ان ڈھلتی عمر کے بوڑھوں میں سے نہیں ہوں— اندر کچھ باہر کچھ—

لیکن یہ سب اچانک—

یہ میرے لیے عمر کا نیا موڑ ہے۔ یار، یہ بیٹیوں میں ایک دم اچانک سے لڑکیاں کیوں آجاتی ہیں—

''چلیے۔ مان لیا میں پرورٹیڈ نہیں تھا۔ پھر انجلی کے انڈرگارمنٹس کو دیکھ کر ڈر کیوں گیا تھا— حواس باختہ— میری چیخ کیوں نکل گئی تھی—

بیٹی مقدس شے ہے تو اس کے کپڑے بھی مقدس ہوئے— پھر— میں ڈر کیوں گیا تھا؟ چوہے کو جال میں چھپانے جیسا، کمبل ڈالنے کا واقعہ کیوں پیش آیا— شاید، انسانی سائیکی ابھی بھی اپنے اندر کا 'بہت کچھ' سراغ لگا پانے میں ناکام ہے—

مگر— سرخ انقلاب اور

انجلی بڑی ہو رہی ہے—

'کتنے کی— چودہ— چودہ کی ہوگئی، نا انجلی—' مسز ڈھلن میری آنکھوں میں جھانک رہی ہیں— اُن کہ آنکھوں میں شرارت ہے۔

'آپ کو— آپ کو ہشیار رہنا چاہیے سر۔'

'کیوں؟'

'لیں' کہہ دیا نا' یہ عمر ہی ایسی ہے۔'

'یعنی، ۱۴— ۱۴ کی عمر—'

'سب سے سنسنی خیز، لڑکیوں کے لیے سب سے سنسنی خیز عمر یہی ہوتی ہے— اس عمر میں لڑکیاں Love letter بھیجنا شروع کر دیتی ہیں—

'لو— لیٹر—' میری سانس رک رہی ہے— انجلی کا چہرہ ایک پل کو، آنکھوں کے آگے دوڑ جاتا ہے۔ یہ معصوم سی بچی— آنکھوں کے پردے پر چھوٹے چھوٹے انجلی کے ہاتھ ہیں— نہیں، یہ ہاتھ محبت بھرے خط نہیں لکھ سکتے—'

'کیا سوچ رہے ہیں سر؟ مسز ڈھلن مسکراتی ہیں۔ لیکن آپ کے لیے۔ آپ کے لیے کیا غلط ہے سر— آپ تو اس معاملے میں بہت لبرل ہیں— یعنی— مجھے لگتا ہے، آپ اس معاملے میں بھی انجلی سے شیئر کریں گے— کیوں سر— زمانہ بدل رہا ہے۔ بس انجلی کو پھسلنا نہیں چاہیے— سمجھ رہے ہیں نا سر۔ بس اسی جگہ تھوڑا سا ہشیار رہنے کی ضرورت ہے—'

لیکن کیوں ضرورت ہے مجھے؟ بڑے ہوتے ہی ہم اپنا زمانہ کیوں بھول جاتے ہیں۔ انجلی کی جگہ لڑکا ہوتا تو؟ تب تو چلا چلا کر اس کی پہلی پہلی محبت کی خوشی میں فائیو اسٹار میں ڈنر دیتا— لوگ پوچھتے معاملہ کیا ہے؟ تو چلا کر کہتا— میرے بیٹے کو پہلی بار کسی سے محبت ہوئی ہے— میرے— بیٹے کو—

انجلی کی محبت پر پارٹی کیوں نہیں دے سکتا—؟

نہیں۔ انجلی لڑکی ہے۔ انجلی کو محبت نہیں کرنا چاہیے۔ لڑکیوں کے معاملے الگ ہوتے ہیں۔ مسز ڈھلن بتاتی ہیں۔ جب ان کی بیٹی سات سال کی ہوئی تھی اور مسٹر ڈھلن بہت پیار کرنے والی اپنی بیٹی کو

باتھ روم سے نہلا کر ناول باندھ کر باہر لائے تھے تو ان کی ممی نے اسے سمجھایا تھا۔

Not, not again. اب بیٹی کو تم ہی نہلایا کرو۔

'لیکن کیوں ممی۔ وہ باپ ہے۔'

'باپ ہے تو کیا ہوا۔ ہے تو مرد'

مرد—؟ باپ کو مرد نہیں ہونا چاہیے— بیٹی۔ سگی بیٹی— باپ کتنی کتنی باتوں سے محروم ہو جاتا ہے یا کر دیا جاتا ہے۔

مسز ڈھلن نے پوچھا تھا—

'آپ۔ آپ کیا کرتے ہیں سر۔'

'میں انجلی کو سات آٹھ سال کی عمر تک خود ہی—'

مسز ڈھلن نے قہقہہ لگایا تھا— وہی— آپ نے کہا تھا، نا سر، یہ بیٹیوں میں لڑکیاں کیوں آجاتی ہیں۔ ماں غسل دیتی ہے تو بیٹیوں میں لڑکیاں نہیں آتیں۔ بیٹیوں میں بیٹیاں ہی رہتی ہیں—'

مسز ڈھلن نے کتنی آسانی سے یہ سچ اگل دیا تھا— اور حقیقت تھی کہ انجلی کے پھیلتے جسم کے ساتھ ہی تقدس کے رشتے نے قدم قدم پر اپنی limitations کی دیوار اٹھانی شروع کر دی تھی— یہ جوان ہوتی لڑکیوں کا جسم اچانک لاؤڈ اسپیکر کی طرح چیخنے کیوں لگتا ہے—!

اور یہ چیخ میرے اندر اتر رہی تھی۔ ایک کمزور باپ کی آتما میں— کیا انجلی کسی کو لیٹر لکھ سکتی ہے۔

'نہیں۔'

'کیوں؟'

'بس نہیں لکھ سکتی'

'کیوں نہیں لکھ سکتی؟'

'اس لیے کہ میری بیٹی ہے۔'

لیکن اس نے اگر لکھنا شروع کر دیا تو؟ کالج ہے— سارا دن اکیلے رہتی ہے— اس نے کبھی اس بارے میں پوچھا نہیں۔ وہ اپنی تنہائیاں کس کے ساتھ شیئر کرتی ہے— سارا دن کس طرح اپنا دل بہلاتی ہے— کالج میں کیا کرتی ہے— کالج سے کتنے بجے گھر واپس آتی ہے—

سوچ کی رفتار رک نہیں پا رہی تھی—

اور اس دن گھر میں داخل ہوتے ہی ایک بار پھر وہ تازیبا واقعہ رونما ہو گیا تھا۔

(۲)

وہ اپنے کمرے میں تھی۔ وارڈ روب کے، ہینگر میں لپٹے کپڑے اس کے بستر پر پھیلے تھے۔ مجھے سامنے دیکھ کر وہ ڈر گئی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو اچانک پیچھے کر لیا تھا— چھپا کر— مسز ڈھلن کے لفظ

میرے اندر چیخ رہے تھے—

'کیا— کیا بات ہے پاپا—'

وہ چونکنا تھی۔ اس کی نظریں مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھیں۔ 'یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟'

'کچھ نہیں۔'

'کچھ نہیں کچھ— لاؤ دکھاؤ۔'

'نہیں پاپا—'

'دکھاؤ—'

'میں نے کہہ دیا نا، کچھ نہیں ہے پاپا۔'

'پھر چھپا کیوں رہی ہو۔'

بس ایسے ہی۔

'لاؤ دکھاؤ، میں غصے کا مظاہرہ کرتا ہوں۔ وہ بستر سے چھلانگ لگاتی ہے— یقیناً لو لیٹر— اشارہ سے دکھانے کو کہتا ہوں۔ وہ پیچھے دیوار کی طرف، میری طرف منہ کیے ہٹتی ہے—

'نو— نو پاپا— کچھ نہیں ہے۔ آپ جاؤ—'

'نہیں— لاؤ—'

اور— اب دیوار ہے۔ وہ پیچھے نہیں جا سکتی۔ وہ دیوار کے پار نہیں ہوسکتی۔ میں چیختا ہوں اور وہ چور خط میرے سامنے کھول دیتی ہے— انجلی کی آنکھیں بند ہیں۔ بدن تھر تھر کانپ رہا ہے۔ کھلے ہوئے ہاتھوں پر اس کی 'برا' اچانک سانپ کے پھن کی طرح میرے سامنے تن جاتی ہے—

'نہانے جا رہی تھی—'

'کیا—؟'

وہ اچھلی— باپ کے سامنے جوان ہوتی عمر کے چغلی کھانے کا احساس اچھا نہیں لگا تھا۔ انجلی نے برا کو پھر سے مٹھیوں میں جکڑ لیا تھا اور باتھ روم بھاگ گئی تھی—

☆☆

میں سرتاپا لرز رہا تھا۔

اس کی کھلی مٹھی میں جگنو نہیں تھے، تارے نہیں تھے، محبت بھرے خط نہیں تھے— دھماکہ تھا— اشتعال تھا۔ سن سنی خیزی تھی— وہ شے تھی، جس کے احساس سے ذہن بدن کے خطوط ناپنے لگتا ہے—

انجلی کی کھلی مٹھیاں— انجلی کی بند آنکھیں— پھر انجلی کا اچھل کر بھاگنا—

یہ۔ یہ کیا ہوگیا— کیا سمجھا ہوگا انجلی نے— کتنا Guilt محسوس کیا ہوگا— اس کا ذہن تناؤ کا شکار ہے۔ رگیں پھٹ رہی ہیں——

میزائلیں مسلسل چھوٹ رہی ہیں—

بدن۔ بارش۔ شاور — اور کھلی ہوئی ہتھیلیاں اور کھلی ہتھیلیوں کا چور —
مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ اپنے آپ کو شانت کرنے کے لیے مجھے کچھ کرنا ہوگا —
لیکن کیا کرنا ہوگا۔
انجلی۔ بدن۔ بارش۔ شاور اور کھلی ہتھیلیوں کا چور — مجھے کچھ کرنا ہوگا —
واتسائن اور انجلی
انجلی اور وانسیائن —
مجھے کچھ کرنا ہوگا —
ٹہلتا ہوں۔ تیز تیز سانسوں کو دل کے کبوتر خانے میں جکڑنے کی کوشش کرتا ہوں — سانسوں کی لہروں کو سمجھاتا ہوں۔ اتنا تیز مت بہو —
کیوں —
مت بہو اتنا تیز —
انجلی بیٹی ہے۔ دو ایکم دو۔ دو دونی — انجلی بیٹی ہے — ٹہلتے ہوئے انجلی کی میز تک آگیا ہوں — کتنی گندی ہو رہی ہے یہ میز۔ کتابیں بکھری پڑی ہیں — یہ آنکھیں ان کتابوں پر جمانے کی کوشش کرتا ہوں —
فزکس۔ کیمسٹری۔ الجبرا —
موٹی موٹی کتاب کے پنے میرے ہاتھوں کا لمس جذب کرتے ہیں۔ کتنی مدت ہوگئی۔ انجلی کو ساتھ پڑھانے بھی نہیں بیٹھا۔ کبھی پوچھا بھی نہیں۔ دسویں پاس کرنے کے بعد کیا لیا — سائنس یا آرٹس۔ بس کالج اور ٹیوشن کے پیسے دیتا ہوں — اور یہ کتابیں۔ فزکس۔ کیمسٹری۔ الجبرا — میز کتنی گندی ہو رہی ہے۔ روشنائی بھی گر گئی ہے۔ میز صاف کر رہا ہوں۔ فزکس، کیمسٹری — الجبرا —
انجلی کی کھلی ہتھیلیاں اور بند آنکھیں ذہن کی Retina پر Freeze ہو جاتی ہیں۔ انڈر گارمنٹس۔ پینٹی، برا، اور — فزکس۔ کیمسٹری —
پینٹی برا —
فزکس، کیمسٹری —
کتابوں کو قرینے سے سجا رہا ہوں —
یہ انجلی کی کتابیں ہیں۔ اور وہ — انجلی کے انڈر گارمنٹس۔
فزکس، کیمسٹری، الجبرا —
پینٹی اور برا —
میں وہیں کرسی پر بیٹھ گیا ہوں۔ ان میں پرفرق کیا ہے۔ کتابوں میں اور کپڑوں میں۔ دونوں انجلی کے ہیں —

انجلی میری بیٹی ہے—

کتابیں میز پر سجا سکتا ہوں تو بیٹی کے انڈر گارمنٹس چھوتے ہوئے بدن میں زلزلہ کیوں آجاتا ہے—

مقدس باپ کے ذہن میں کہیں کوئی ایک چور دروازہ بھی ہوتا ہے کیا—؟

اس چور دروازے سے ہو کر بیٹی لڑکی کیوں بن کیوں نہیں جاتی ہے—

فزکس— کیمسٹری—

کیمرہ پین ہوتا ہے۔ سرخ ٹائلس۔ باتھ روم— باتھ روم کی دیواریں۔ سرخ بیسن۔ باتھ ٹب—

ایک بار پھر شاور کے پاس ہی ہینگر سے جھولتے انجلی کے انڈر گارمنٹس— پینٹی اور برا—

فزکس، کیمسٹری— الجبرا—

مڈشاٹ کلوز میں، میں ہوں۔ میں نے ہاتھ بڑھا دیا ہے اور یہ کیا میرے ہاتھوں سے سانپ کے پھن غائب ہو گئے ہیں— کلوم میں میرا ہنستا ہوا چہرہ— ڈیزالو—

انجلی کپڑے بدل کر کمرے میں آجاتی ہے— سجی ہوئی میز کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکراتی ہے—

I am proud of you my Papa تم نے میری میز صاف کر دی۔

'کیوں؟'

'نہیں'

'نہیں کیوں—'

میری سہیلوں کے پاپا ایسا نہیں کر سکتے۔

'کیوں نہیں کر سکتے۔'

'بس نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ وہ میرے پاپا نہیں ہیں۔

وہ اُچھل کر اپنی بانہیں میرے گلے پہ حمائل کرتی ہے۔I love you Papa

'فزکس، کیمسٹری— الجبرا—'

میں مسکراتا ہوا اس کو اپنی بانہوں میں لیتا ہوں۔

انجلی میری بیٹی، تم اپنی ماں سے کتنی ملنے لگی ہو۔'

'ماں سے؟' وہ ہنستی ہے۔ مسکراتی ہے۔ اسی لیے پیار ہو رہا ہے۔ مجھ میں ماں آگئی ہے۔ انجلی پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہے... وقت نے یہ منظر یہیں فریز کر دیا ہے—

نورالحسنین

پچھلے پہر کی خوشبو

فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اس نے اچانک پلٹ کر دیکھا۔ گاڑیوں کا ریلا کسی طوفان کی مانند چلا آرہا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ سامنے دیکھتا، کوئی خاتون اس سے بری طرح ٹکرا گئی۔ وہ گھبرا گیا۔ اور جلدی جلدی معافیاں مانگنے لگا۔ لیکن وہ خاتون بنا کسی احتجاج یا غصے کے آگے بڑھ گئی۔

''عجیب بے حسی کا عالم ہے...!'' دوڑتی بھیڑ میں سے کسی نے کہا تھا۔

''ہاں!'' بے اختیار اس کی زبان سے نکلا، اس نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن اس کا مخاطب کوئی بھی نہ تھا۔ وہ جھینپ کر رہ گیا اور پھر جلدی جلدی قدم اٹھانے لگا۔ اس کے لیے اس طرح کے واقعات کوئی نئی بات نہ تھے۔ لیکن وہ ہر بار اپنے آپ میں شرمندہ ہوجاتا تھا۔ اپنے موروثی دیہات سے نکلے ہوئے اسے ایک عرصہ ہوگیا تھا۔ لیکن آج بھی شہر میں اسے عجیب سی بے چینی ہوتی تھی۔ وہ اب بھی بھاگتی گاڑیوں اور دوڑتی بھیڑ سے بے حد گھبراتا تھا۔ وہ اکثر سوچتا پتہ نہیں یہاں کے لوگ کیسے اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا تھا۔

آج صبح جب وہ گھر سے باہر نکل رہا تھا تو اس کی بیوی نے زور دے کر کہا تھا ''سنو جی...! شام کو دفتر سے آتے آتے شمو کی ماں کو دیکھنے اسپتال ضرور جانا۔ بیچاری چار دن سے سرکاری اسپتال میں تڑپ رہی ہے۔ نہ موت ہی آتی ہے اور نا ہی عیادت کے لیے لوگ...!''

اس نے بیوی کو غصیلی نظروں سے دیکھا تو وہ سٹپٹا گئی اور پھر اپنا رخ بدلتے ہوئے بولی۔ ''میں کیا جانوں یہ باتیں۔ وہی شمو کہہ رہا تھا...!''

''بے حس اولاد...!'' اس نے اپنے دل میں سوچا، بھلا کوئی اپنی ماں کے بارے میں ایسی باتیں سوچتا ہے؟ وہ دل ہی دل میں اسے گالیاں بکتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا... چھی چھی... شہری تہذیب نے سب کچھ چھین لیا۔ مگر پھر بھی دو وقت کی روٹی کا چکر شہر چھوڑنے نہیں دیتا۔

کل اگر اسے کچھ ہوگیا تو؟ یہ بے حسی اس کے ساتھ بھی ہوسکتی ہے۔ یہاں تو موت اور عیادت کرنے والے بھی وقت پر نہیں پہنچتے۔ ایسی بے حس جگہ سے نکل جانا ہی بہتر ہے۔ وہ اس شہر میں قطعی نہیں رہے گا، بلکہ جیسے ہی اس کا ریٹائرمنٹ ہوجائے گا، وہ واپس اپنے دیہات لوٹ جائے گا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس کے قدم چپ چاپ فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔

خیالات کا سلسلہ اسی طرح جاری تھا۔

اور خیالوں کے آگے پیچھے گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ مسجد کے میناروں پر پرندے لوٹ رہے تھے اور موذن اذان دے رہا تھا۔

وہ سوچنے لگا، بچپن میں تو اس کی کوئی نماز ناغہ نہ ہوتی تھی۔ موسم کی ہر شدت اس کے جذبہ عقیدت کے آگے ماند پڑ جاتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس کا دیہات گھوم گیا اور پھر اس نے اپنے آپ کو دیہات کی چھوٹی سی مسجد کی سیڑھیوں پر بیسیوں بار چڑھتے اترتے دیکھا۔ کس قدر مزہ آتا تھا۔ اس وقت عبادت میں...!

لیکن آج...؟ آج بھی گھر کے قریب کی مسجد سے اذان کی آوازیں کانوں سے ٹکراتی ہیں اور مولویوں کی جماعتیں صبح شام دروازے پر دستک دیتی ہیں۔ لیکن قدم اس طرف اٹھتے ہی نہیں۔

''یہ بے حسی نہیں تو کیا ہے؟'' آواز پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے نظریں اوپر اٹھائیں۔ راہ گیر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

''اندھیر ہے صاحب اندھیر ہے...!''

''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں...!''

''دلشاد صاحب...! زمانے کی یہ ساری خرابیاں محض دین سے بیزاری کا نتیجہ ہیں۔ بچپن میں اگر بچوں کو اچھی طرح مذہبی تعلیم مل جائے تو وہ ساری زندگی برائیوں سے دور رہتے ہیں...!''

''لیکن کیا کریں صاحب۔ نصاب سے مذہبی تعلیم ہی خارج ہوگئی...!''

''ہاں... اب سنتے رہئے جھوٹ، اور کھاتے رہئے دھوکے...!''

وہ ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور چاہتا تھا کہ ان کی باتیں دل لگا کر سنے، لیکن منزل نے اس کا رستہ بدل دیا۔ واقعی بچوں کو مذہبی تعلیم بے حد ضروری ہے۔ خدا کا شکر ہے اس کے بچے اچھی طرح دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وہ خود جو دلچسپی لیتا ہے۔ اس کی خاطر وہ ان پر گھنٹوں اپنا وقت ضائع کرتا ہے۔ اس کی تو بڑی خواہش ہے کہ اس کے بچے وہ اعلیٰ معیار پائیں جنہیں دیکھ کر ساری قوم فخر کر سکے۔ لیکن یہ بات اتنی آسان نہیں ہے۔ اس کی خاطر پوری توجہ چاہیے۔ ضرورت پڑے تو بچوں کی پٹائی بھی کرنی پڑتی ہے۔ وہ اس معاملے میں بھی کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ آج ہی صبح کی بات ہے منا جب نماز کا اعلان کر کے مسجد کے بجائے دوستوں میں نکل گیا تھا تو اس نے اس کی کس قدر پٹائی کی تھی۔ اگر وہ اس وقت انجان بن جاتا تو منا جھوٹ اور بہانے بنانے میں طاق ہو جاتا۔

''بابو جی...! دو دن سے بھوکا ہوں۔ اللہ کے نام پر کچھ دلا دو...!''

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک دس بارہ برس کا لڑکا مسکین صورت بنائے کھڑا تھا۔ اس نے اپنی جیب کا جائزہ لیا اور ایک روپیہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ دوسرے ہی لمحہ وہ لڑکا بھاگ کھڑا ہوا۔ روپیہ اس کی مٹھی میں

بند تھا اور وہ بے تحاشہ دوڑ رہا تھا۔ اسے عجیب سا اطمینان محسوس ہوا اور اس نے اپنے تصور میں اس لڑکے کو ایک روپیہ کے عوض ہمہ اقسام کے لذیذ کھانوں سے اپنے پیٹ کی آگ بجھاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور چال میں اپنے آپ ہی عجیب سی رعونت پیدا ہوگئی۔ اس نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا تو اسے محسوس ہوا جیسے اس کے اندر آباد قد آور حاتم طائی کا قد ایک دم گھٹ گیا ہے اور وہ سارے آسمان میں پھیل گیا ہے۔ وہ شان بے نیازی سے آگے بڑھا۔

''بابو جی...! دو دن کا بھوکا ہوں۔ اللہ کے نام پر کچھ دلا دو...!''

آواز پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی اور اس نے دیکھا وہی لڑکا کسی اور راہ گیر کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے اسے بے حد غصہ آیا۔ اس نے اسے گھور کر دیکھا۔ لیکن لڑکے نے اسے کوئی اہمیت نہ دی۔

''بھائی صاحب... بھائی صاحب... ایک منٹ...!''

اس نے پلٹ کر دیکھا اس کا مخاطب تیر کی طرح اس کے سامنے آکر ترازو ہوگیا۔ ''مسافر ہوں... کسی نے میری جیب کاٹ لی۔ اگر آپ کچھ مدد کریں تو میں اپنے گاؤں لوٹ جاؤں گا...!''

اس نے شکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر بولا، ''چلو میرے ساتھ! بس اسٹیشن چلتے ہیں۔ میں تمہیں پیسے دینے کے بجائے ٹکٹ خرید کر سوار کر دیتا ہوں...!''

وہ شخص بڑبڑاتا ہوا تیزی سے آگے نکل گیا اور اسے ہنسی آگئی۔ گاڑیاں اب بھی اس کے آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا۔ آخر فریب، جھوٹ اور بے ایمانی کی تربیت کون کرتا ہوگا؟ لیکن اسے دور دور تک کوئی ایسا مدرسہ نظر نہ آیا۔

جونہی اس نے گھر میں پہلا قدم رکھا۔ بیوی کے فکر مند چہرے نے سوال کیا، ''گئے تھے آپ اسپتال؟''

اس اچانک سوال کے لیے وہ تیار نہ تھا۔ پریشانی اس کے چہرے پر تاریک رات کی طرح پھیل گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور پھر نہایت پُراعتماد لہجے میں جواب دیا، ''واقعی شمو کی ماں بہت بیمار ہے۔ وہ ٹھیک ہی کہتا تھا کہ یہاں عیادت کے لیے بھی کسی کے پاس وقت نہیں ہے...!''

اس کی بیوی نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا... بیچاری شمو کی ماں...

وہ کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ لیکن اسے عجیب سی ندامت ہو رہی تھی۔ صبح منے کے منہ پر مارے ہوئے سارے ہی چانٹے پلٹ کر اس پر برس رہے تھے۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

''سنو جی...! ہمارے محلے میں تبلیغی جماعت آئی ہوئی ہے۔ اجتماع ہے آج۔ شاید وہی لوگ ہوں گے...!'' بیوی کی سرگوشی اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے بیزاری سے بیوی کی طرف دیکھا اور پھر کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے منے کو حکم دیا، ''بیٹے...! ان سے کہہ دو بابا گھر پر نہیں ہیں...''

اور منا چپ چاپ دروازے کی طرف دوڑ پڑا۔

ابواللیث جاوید

تیسری سمت کا سفر

آسمان کا خوفناک روپ لحظہ بہ لحظہ بھیانک ہوتا جارہا تھا۔

ہواؤں کا زور اور بادلوں کی گھن گرج اس کی ہمت کے لیے ایک چیلنج بنتی جارہی تھی۔ اس کے کانوں میں مقدس الفاظ گونج رہے تھے۔ جس میں سفر کا حکم تھا اور اس سفر کی صعوبتوں سے آگاہی بھی۔ اس نے اپنی منتشر ہمت یکجا کی اور آسمان کی طرف بڑی معصومیت سے دیکھا اور سفر پر روانہ ہوگیا۔ کیونکہ اسے ایسا ہی کرنا تھا۔

منزل بہ منزل قدم بڑھتے ہی رہے۔ حتی کہ سورج غروب ہونے لگا۔ سامنے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سورج سمندر کے اتھاہ پانیوں میں غوطہ لگا رہا ہو۔ وہ اس منظر سے تھوڑی دیر محظوظ ہوتا رہا کہ دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ ابھی تھوڑا ہی وقت گذرا تھا کہ اسے دور سے کچھ لوگ آتے ہوئے نظر آئے۔ چہروں کے نقوش رفتہ رفتہ نمایاں ہوتے جارہے تھے۔ سب کے چہرے نہایت کریہہ اور آنکھیں شعلہ بار تھیں۔ وہ ایسی مخلوق کو دیکھ کر ذرا سہما لیکن فوراً ہی اس نے خود پہ قابو پالیا اور سوچا... اپنی بات ان کے سامنے رکھوں گا۔ باقی وہی مالک ہے۔ اس نے خود کو اس وحشی مخلوق کے سامنے بے خوف ہوکر کھڑا ہونے کے قابل محسوس کیا۔ تمام کے تمام ڈراؤنے چہروں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے گھبرایا لیکن فوراً ہی اس نے اپنی بات ان کے سامنے رکھ دی۔ وہ اس کی بات سن کر سخت متحیر ہوئے لیکن بالکل خاموش رہے۔ سب کے سب ساکت و جامد کھڑے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ وہ ابھی تک انہیں کے حصار میں تھا۔ ایک جان لیوا خاموشی سے وہ گھبرا گیا۔ اب اندھیرا بتدریج بڑھتا جارہا تھا۔ تمام وحشی چہرے لٹکے ہوئے تھے۔ اس نے اندھیرے میں اپنے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ خاموشی بدستور قائم تھی۔ اس نے ماحول کے بوجھل پن سے اکتا کر قدم آگے بڑھانا چاہا مگر اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ اسے راستہ نظر نہیں آیا۔ اس نے اپنی بات ان کے سامنے رکھ کر ایک عجیب سا سکون محسوس کیا تھا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ اس نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کردیا ہو گو کہ اس کی بات ابھی کسی نے مانی نہیں تھی مگر خاموشی کے سینہ میں ایک ہیجان برپا تھا۔ سب ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں گفتگو کررہے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر قبل ان کی آنکھیں جو شعلہ بار تھیں اب مدھم پڑنے لگی تھیں۔ تمام فضا پھر بھی خاموشیوں کی دبیز چادر میں لپٹی رہی۔

اس نے اپنی بات کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ پاکر اس گھٹن بھرے ماحول سے نکل جانے میں ہی

عافیت سمجھی اور اس نے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے راستوں پر اپنے قدموں کے نشانات بنانا شروع کر دیئے۔ اس طرح صدیاں گزر گئیں۔ اندھیرے تھے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ وہ دل کی شمع جلائے اندھیرے میں بڑے اطمینان سے آگے بڑھتا رہا، بڑھتا رہا، بڑھتا رہا... اور جب صبح ہوئی تو سامنے کے لق و دق میدان میں دھوپ کی چادریں تنی ہوئی تھیں اور ایک پوری دھوپ کے سائبانوں میں پناہ گزیں تھی۔ سبھی کے چہرے جھلسے ہوئے اور بدن پر نیلے داغ پڑ چکے تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ ہالے پڑ گئے تھے اور رخساروں کا رنگ بھی سیاہ ہو گیا تھا۔ سبھی کی آنکھیں بے نور ہو رہی تھیں اور تشنگی کی شدت سے سب کی زبانیں باہر لٹک رہی تھیں۔

وہ یہ منظر دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

اسے دیکھتے ہی بہت سارے لوگ اس کی طرف لپکے اور بہت ساری امداد طلب نگاہیں اس کی طرف بیک وقت اٹھ گئیں۔ اس نے اشاروں سے ان کے احوال دریافت کئے اور سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا... ''ہمیں اس دھوپ کے عذاب سے بچاؤ۔''

وہ خاموش رہا۔

تھوڑے توقف کے بعد اس نے اپنی بات ان کے سامنے رکھ دی۔

سارے چہرے بشاش ہونے لگے۔ اس نے دھوپ سے حفاظت کے لیے کچھ کرنا چاہا اور سب سے مخاطب ہوا... ''ایسا ہے کہ میرے پاس جو کچھ سامان ہے میں اسے دھوپ سے بچاؤ کے لیے استعمال کروں گا مگر مجھے تمہارے ہاتھ چاہئیں...''

''ہاتھ...''

'ہاں' ہاتھ... آسمان کی طرف اٹھے ہوئے ہاتھ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھ گئے۔

سارا میدان ہاتھ کی فصل سے بھر گیا اور دھوپ کی تنی چادر ڈھیلی پڑتی گئی۔ لوگوں نے کچھ عجیب سی راحت محسوس کی۔ اب ہر طرف اطمینان اور سکون کا ماحول قائم ہو گیا تھا اور تب وہ تیسری سمت کو روانہ ہو گیا۔ دشوار گزار راہوں سے گزرتا ہوا وہ ایک پہاڑی علاقہ میں پہنچ گیا جہاں چاروں طرف پہاڑیوں کا سلسلہ تھا اور خاردار جھاڑیوں کا گھنا جنگل۔ وہ ابھی اپنی اکھڑی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ کچھ لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ ان کے چہرے مضمحل اور آنکھوں میں اداسیوں کے گہرے سائے لہرا رہے تھے۔ وہ سب ہی کچھ بول رہے تھے مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ ان کے اشاروں کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

یہ علاقہ دور تک پھیلے ہوئے پہاڑی میدانوں پر مشتمل تھا جہاں دو مختلف سمتوں سے آنے والی پہاڑیاں ملتی تھیں۔ یہ تمام لوگ اسی میدان میں صدیوں سے آباد تھے مگر پہاڑیوں کی دوسری جانب سے

آنے والی وحشی قوموں کے فسادات سے بڑی بری طرح پریشان تھے۔ گذشتہ کئی کئی نسلیں اپنی تمام تر طاقتیں انہیں وحشیوں سے مقابلہ کرنے میں صرف کر چکی تھیں۔ ان کی تمام تر ترقیاں ان کے فسادات کی نذر ہوتی چلی جارہی تھیں۔ فسادات ... فسادات... اور صرف فسادات۔ ان کی زندگی میں صرف فسادات کی ہی دہشت باقی رہ گئی تھی۔ وہ پیدا ہوتے اور فسادات کی نذر ہو جاتے۔

وہ تھوڑی دیر کے لیے گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے پہاڑیوں کی دوسری جانب سے آنے والے وحشیوں کے فسادات سے اس آبادی کو بچانے کی تراکیب پر غور کیا۔ آخر میں اس نے ساری آبادی کو اکٹھا کیا اور دونوں پہاڑیوں کے درمیان کے راستہ کو بند کرنے کی ٹھانی... چادریں تیار کی گئیں اور رات دن کام کر کے ان چادروں کو موڑ کر پہاڑیوں کے درمیانی راستہ کے بیچ میں کھڑا کر دیا گیا۔ آہنی چادروں کے درمیان پگھلے ہوئے تانبہ کو ڈال کر اسے مزید مستحکم کر دیا گیا۔ یہ آہنی دیوار ہوئی کہ پہاڑ کا ہی ایک حصہ معلوم ہونے لگی۔ پہاڑیوں کی دوسری جانب سے آنے والے وحشی اس دیوار سے اپنے سر ٹکراتے رہے مگر انہیں اس طرف آنے کا کوئی راستہ نہیں ملا۔ صبح اٹھ کر وہ اس دیوار کو ڈھانے کی کوشش کرتے حتی کہ رات ہو جاتی۔ پھر وہ دوسری صبح تازہ دم اٹھ کر اسے ڈھانے کی سوچ کر رات میں آرام سے سو جاتے مگر دوسری صبح دیوار ویسے ہی بلند اور مستحکم رہتی۔ ہر نئی صبح دیوار اور بھی بلند اور مستحکم ہو جاتی۔

یہ سلسلہ صدیوں سے چل رہا ہے اور چلتا رہے گا۔

جس دن دیوار گرا دی گئی اس دن... اس دن... اور اس کا بے تکان سفر جاری ہے۔

خورشید اکرم

قصہ ایک بے لطف شام کا

یہ ہفتے کا دن تھا۔ مارچ کے آخری دنوں کا سورج ڈھل رہا تھا۔ ملگجا اندھیرا کھڑکی دروازہ اور درزوں سے نظر بچا کر ڈرائنگ روموں اور بیڈروموں کی چہار دیواریوں میں اتر آیا تھا۔ سورج مغرب کے آخری سرے پر زندگی کو بھرپور جی لینے کے بعد مرنے والے شخص کی آنکھوں کی طرح ٹھہرا تھا۔ اگرچہ گھروں کی بتیاں جلا دی گئی تھیں مگر باہر اسٹریٹ لائٹس ابھی نہیں جلی تھیں۔ آسمان کا عکس اب بھی زمین پر اتنا روشن تھا کہ چھوٹے سے پارک کے ایک حصے میں دو چھوٹی بچیاں بیڈمنٹن کھیل رہی تھیں۔ ہوا خوشگوار تھی۔ گاہے گاہے نرم ہوا آسمان سے زمین تک چھائی اس گہراتی شام کو دیکھ کر متوالی ہو جاتی تو بیڈمنٹن کھیلتی بچیوں کا شٹل ان کے اندازے سے باہر ادھر اُدھر گھر جاتا۔ متوالی ہوا کالونی میں اترائی ہوئی آتی مگر اونچی اونچی ان بلڈنگوں کے گھیرے سے گھبرا کر متوحش ہو جاتی اور بچیاں ایک بار پھر شٹل کی فلائٹ مس کرتیں۔ بچیوں کے کھیل کے ساتھ ساتھ ہوا اور شٹل کا کھیل بہت دیر سے جاری ہے۔ کالونی کے پارک میں بہار کے ابتدائی دنوں کے پھول کھل گئے تھے۔ یہاں قد آور درختوں کا سبز سلسلہ ایک خاص ترتیب سے لگایا گیا تھا۔ لیکن ایسے اونچے پیڑ جان بوجھ کر نہیں لگائے گئے تھے جن پر پرندے اپنا گھونسلہ بنا سکیں۔ شام کے اجالے کا لطف لیتے ہوئے پرندے اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف جا رہے تھے۔ وہ کافی اونچائی سے اڑ رہے تھے اس لیے اُن کی چہچہاہٹ کی آواز کم کم آ رہی تھی۔ لیکن کبھی کبھی نچلے اڑنے والے پرندوں کا پرا ان اونچے مکانوں کے اوپر سے شور مچاتا ہوا گزر جاتا جس کی مینھی بازگشت دیر تک محسوس کی جاتی اور ہوا ان کی آواز میں آواز ملائے سرسراتی ہوئی کالونی میں گھس جاتی۔

ایسی خوشنما شامیں ہر موسم میں اور ہر روز آتی ہیں — الگ الگ پوشاک پہنے، الگ الگ سنگار کیے۔ لیکن ایسی خوشنما شامیں کالونی کے باسیوں سے کب کی چھین لی گئی تھیں۔ یہ ایک ایچ آئی جی کالونی تھی جس کا مطلب ہے اونچی آمدنی والے لوگوں کی کالونی۔ اس میں رہنے والے بیشتر سرکار میں اعلیٰ افسر تھے یا ملٹی نیشنل کمپنیوں میں انگزیکٹو جن کی پوری زندگی، گھر سے دفتر تک، ایک خاص نظم و ضبط کا نمونہ ہوتی ہے۔ کالونی کو دیکھ کر بھی اس کے مکینوں کے نظم و ضبط کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کالونی کے ترتیب سے لگائے گئے پیڑوں اور پارک کے پودوں اور پھولوں کے انتخاب میں، اس کے راستوں کے صاف ستھرا ہونے میں یا مکانوں کے باہری دیواروں کے رنگ و روغن بنے رہنے میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا کیونکہ یہ کام ڈیولپمنٹ اتھارٹی کا تھا، کیونکہ وہ اس کے لیے ٹیکس دیتے تھے اور چونکہ وہ ٹیکس دیتے تھے

اس لیے کسی شکایت کی نوبت آنے سے پہلے ہی ان کی ساری سوک پرابلمز دور کردی جاتیں۔ شہر میں جب دہشت گردی اور تخریب کاری کا زور ہوا، چوری اغوا اور قتل کی خبریں جب اخباروں میں زیادہ نظر آنے لگیں تو کالونی کے باسیوں کے چہروں پر تھوڑی تشویش لہرائی۔ لیکن اس سے پہلے کہ اُن کے ماتھے پر شکن گہری ہو، کالونی کے گرد کی چہار دیواری جو ذرا نیچی تھی اس پر کٹیلی باڑھ لگا دی گئی اور کالونی کے صدر داخلہ پر ایک بڑا سا پھاٹک لگا دیا گیا جس کا ایک پٹ آدھے سے کچھ کم کھلا رہتا تھا۔ چوبیسوں گھنٹے کے لیے باوردی دربان بٹھا دیئے گئے اور پولس نے وہاں ایک Assitance Booth بھی قائم کردیا۔

یہ اونچی آمدنی والے لوگوں کی کالونی ہے۔ مردم شماری کی رپورٹ بتاتی ہے کہ کالونی کی صد فی صد آبادی خواندہ ہے۔ مگر سچ پوچھو تو ایسا نہیں ہے۔ یہاں کچھ سبزی فروش، کچھ دھوبی اور چوکیدار بھی رہتے ہیں جنہوں نے کالونی کے پچھواڑے میں، جہاں کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی، جھونپڑیاں بنالی ہیں اور اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتے ہیں لیکن سرکاری کھاتے میں یہ یہاں کے باسی نہیں ہیں۔ یہ کالونی ان لوگوں نے بسائی ہے جو اپنی طالب علمی کے زمانے میں اچھے اسٹوڈنٹ گنے جاتے تھے۔ یہ اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں کے نزدیک مایۂ افتخار سمجھے جاتے تھے۔ کتابوں کے بیچ انہوں نے اپنا بچپن شروع کیا تھا اور اپنی ذہانت اور کتابوں کے ساتھ ہی جوانی کی سرحدوں میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے تاریخ اور جغرافیہ پڑھا تھا۔ سائنس، معاشیات، سیاسیات اور سماجیات پڑھی تھی۔ بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کی تھیں اور زندگی کی گاڑی کو صحیح پٹری پر ڈالنے اور ایک سکھی زندگی کا سپنا لے کر مقابلے کے بڑے بڑے امتحانوں میں شریک ہوئے تھے جس کے لیے انہوں نے مہینوں بلکہ برسوں تک اپنی سب دیگر مصروفیات ترک کردی تھیں۔ انہوں نے پوری دنیا کی تاریخ پڑھی تھی، جغرافیہ پڑھا تھا اور جان گئے تھے کہ دنیا کے کن کن ملکوں میں اتنا اناج پیدا نہیں ہوتا جو وہاں کے لوگوں کی خوراک کے لیے کافی ہو اور دنیا کے کس ملک میں اتنا زیادہ آلو اور گیہوں پیدا ہوتا ہے کہ فاضل پیداوار سمندر میں پھینک دیتے ہیں۔ انہوں نے پورے اٹلس کو اپنے حافظے میں اس طرح محفوظ کرلیا تھا کہ آنکھ بند کرکے بتا سکتے تھے کہ کس جگہ کتنا ہیرا اور کتنا سونا نکلتا ہے اور اقتصادیات پڑھ کر یہ جان گئے تھے کہ ہیرے کی قیمت کتنی ہے اور میلوں گہرے زمین کے اندھیرے سے ہیرا کاٹ کر لانے والوں کی قیمت کتنی ہے۔ انہیں اپنے ملک کا قانون، دستوری حقوق اور عدالتی اور سیاسی نظام سب کچھ معلوم تھا۔ مقابلے کے امتحانوں کی تیاری کے لیے نکلنے والے میگزینوں سے یہ اپنے آئی کیو کا ٹیسٹ لیتے تھے اور اپنے ذہین شہری ہونے کے دعوے کی تصدیق کرتے تھے۔ اخباروں اور رسالوں میں ہونے والے ملکی اور بین الاقوامی مباحثوں کو پڑھتے، اور ان پر اپنا ردِ عمل لکھتے تھے۔ اپنے اردگرد کے سماجی، سیاسی اور ثقافتی مسائل پر گفتگو کرتے تھے اور اپنے خون کے زندہ ہونے کا ثبوت دیتے تھے۔ انہوں نے ہر سوال کے جواب کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا تھا۔ بات کرنے کے انداز کو زیادہ سے زیادہ پُراثر بنانے کے لیے guidance حاصل کی تھی۔ چیزوں کے بارے میں مثبت انداز سے سوچنے کی عادت ڈالی تھی۔ مثلاً یہ

غریب کے بارے میں مثبت ڈھنگ سے اس طرح سوچتے کہ اگر وہ گووندا اور متھن چکرورتی کی فلمیں پسند کرتے ہیں تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں کیونکہ ان کے حالات نے ان کی جمالیاتی سطح کو بلند ہونے نہیں دیا اور قاتل کے بارے میں گاندھی جی کی طرح سوچتے کہ برائی سے نفرت کرو برے سے نہیں اور بُرائی کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اس کی بھی کچھ Valid وجہیں ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ — اور اس طرح انہوں نے اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے اور دوسروں کے تجربوں سے کسب کر کے مقابلے کے بڑے بڑے امتحانات پاس کئے تھے اور اونچے اونچے عہدے حاصل کئے تھے اور یہ یا اس طرح کی دیگر کالونیوں میں رہنے کا حق حاصل کر کے اپنے لیے لطف وسکون اور اپنے بہی خواہوں کے لیے اطمینان حاصل کیا تھا۔

اور اب یہ سچ مچ بہت سکون سے اپنی اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے خوبصورت عورتوں سے شادیاں کی تھیں اور بچے پیدا کئے تھے جو ان سے بھی زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔ جو ابھی سے اپنی ذہانت کا ثبوت دے کر ان کی وراثت کو آگے بڑھانے کی پیش گوئی کو صحیح ٹھہراتے ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی کا برا نہیں کیا۔ کوئی ایسا کام مثلاً چوری، زنا، ڈاکہ یا خون خرابہ، کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے ان کی رسوائی ہو۔ یہ ہفتے میں ایک بار بھگوان کے سامنے جا کر حاضری دے آتے ہیں اور ان سب کے عوض بھگوان کی دیا سے ان کے یہاں ذہین اور خوبصورت بچے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ نہایت سلیقے سے زندگی گزارتے ہیں۔ ہفتے کے وہ تمام دن جن میں یہ آفس جاتے ہیں، صبح سو کر اٹھنے سے آفس کے لیے نکلنے تک اور آفس سے واپس آنے سے لے کر رات کو بیڈ روم کی، بتی بجھانے تک نہایت سلیقے اور اطمینان سے اپنے وقت کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے گھروں میں روز صبح اخبار آتا ہے جس کا یہ سچ پوچھو تو ایک نامعلوم بے صبری سے انتظار کرتے ہیں۔ بیڈ ٹی کے ساتھ اگر اخبار نہ ملے تب بھی کم سے کم ٹوائلٹ جاتے وقت تو اخبار آ ہی جاتا ہے۔ کبھی کبھار اگرچہ ایسا واقعی کبھی کبھار ہی ہوتا ہے، اخبار آنے میں دیر ہوتی ہے تو یہ بالکونی میں کھڑے ہو کر اخبار والے کی راہ تکا کرتے ہیں اور جیسے ہی ہاکر اخبار پھینکتا ہے، یہ اسے اٹھا کر تیزی سے ٹوائلٹ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ فارغ ہونے کے دوران اور باہر نکل کر ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھ کر اپنے اطمینان بھر پورا اخبار پڑھتے ہیں۔ اخبار کے ابتدائی صفحوں میں اکثر بری خبریں ہوتی ہیں۔ مثلاً فرقہ وارانہ دنگے میں مرنے والوں کی تعداد، دنگے کا مقام اور اس کی وجہ وغیرہ، مثلاً کسی بڑے نیتا کے پارٹی بدلنے کی تقریب کی تصویر اور نئی پارٹی میں رہتے ہوئے غریبی، جہالت اور کرپشن جیسے مسائل کو جڑ سے ختم کر دینے والے بیانات وغیرہ۔ مثلاً احتجاجی جلسوں کی تصویریں جن کے مشتعل ہو جانے پر پولس کو لاٹھی چارج کرتے یا ٹیئر گیس چھوڑتے دکھایا گیا ہو یا زلزلے میں برباد ہوئے مکانوں اور بے سہار ہو جانے والے لوگوں کی داستان یا طوفان اور سیلاب کی تباہ کاریاں وغیرہ۔ مگر ایسی خبروں کی وہ صرف سرخیاں ہی پڑھ پاتے ہیں۔ کیونکہ زیادہ وقت سوسائٹی گوسپ، فلمی چیٹ اور انٹرنیشنل سلیبریٹیز کے بیڈ روم کے قصوں کو پڑھنے میں ہی نکل جاتا ہے۔ اس طرح گویا پورا اخبار پڑھ کر انہیں اطمینان ہو جاتا ہے اور پھر وہ اپنے معمولی کی تیاری شروع کر دیتے

ہیں۔ ہفتہ اور اتوار جو چھٹی کے دن ہیں، یہ صبح دیر تک سوتے ہیں، ایک کے بجائے دو بیڈ ٹی لیتے ہیں، ٹوائلٹ میں دیر تک رہتے ہیں۔ دیر تک اخبار پڑھتے ہیں۔ خاص طور سے سنڈے سپلمنٹ جس میں ایسے مضامین ہوتے ہیں جن میں کسی بہت بڑے سلیبرٹی کی شاندار زندگی کے پیچھے اس کی لگن اور محنت کی داستان اور کامیابی کا راز بتایا گیا ہو یا کسی ماڈرن گرد کی ترغیب پر ملک کی سب سے بڑی شراب کمپنی کے مالک کے میڈیٹیشن کے سہارے اپنی آتم شکتی بڑھانے اور میٹریل ورلڈ سے اسپریچوئل ورلڈ میں داخل ہونے کی روداد بیان کی گئی ہو۔ اس دن بیوی کو کنگ شوز سے نوٹ کی ہوئی ریسیپی کے مطابق دیر تک کھانا پکاتی ہے جس میں وہ اپنی پوری خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیوی کا ساتھ دیتے ہیں۔ یا بچوں کے ساتھ 'شکتی مان' یا کارٹون یا کمرشیل بریک کے وقفے میں کسی دوسرے چینل پر کوئی چیٹ شو یا سیریل دیکھ لیتے ہیں یا کوئی ملنے جلنے والا آجائے تو اس سے ایک مناسب فاصلہ رکھ کر پوری خوش دلی سے بات چیت کرتے ہیں۔ تیسرے پہر یہ شاپنگ کو جاتے ہیں اور شام کو پولیتھین کی تھیلیوں سے لدے پھندے تھکے ٹوٹے گھر آتے ہیں۔ گھر پہنچ کر انہیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ بہت تھک گئے ہیں۔ چنانچہ ریلیکس ہونے کے لیے ٹی وی آن کر دیتے ہیں جس پر پروگرام سے زیادہ اشتہار آتے ہیں۔ یہ اشتہار بھی کتنے معیاری اور Soothing ہوتے ہیں — 'ہے کوئی جواب' اور ایتا بھ کی آنکھ سے ہری روشنی نکلتی ہے، واہ کیا ہائی ٹیک ایڈ ہے۔ برف سے نکالی ہوئی بوتل سے لڑکے کو لڑکی مل جاتی ہے — جو چاہو ہو جائے۔ کوکا کولا انجوائے۔ یہ اور ایسے بے شمار دل کو لبھانے والے اشتہار ایسی چیزوں کے جوان کی ضرورت بھی ہے اور جن کا استعمال ان کے نفیس اور خوش ذوق ہونے کی دلیل بھی — اور جب رات ان کی گھڑی کے مطابق پوری طرح اُتر آتی ہے تو وہ کھڑکی کے پردے کھینچ دیتے ہیں۔

کھڑکی کا پردہ سرکانے اور کھینچنے کا یہ معمول کب سے جاری ہے اور کب سے خوشنما شامیں اُن سے چھین لی گئی ہیں اس کے بارے میں وہ کبھی نہیں سوچتے۔

— تو یہ ہفتے کی شام تھی۔ ڈرائنگ روموں میں ٹی وی چل رہی تھی اور پنکھے چل رہے تھے اور کھڑکیوں پر پردے کھنچے ہوئے تھے گویا سب کچھ معمول کے مطابق بالکل ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ اچانک ٹی وی سیٹ کے اسکرین آف ہو گئے، بتیاں بجھ گئیں اور پنکھے کی رفتار کا دم ٹوٹنے لگا۔ چند لمحے تک ان کی آنکھوں کے سامنے ایک دم اندھیرا رہا۔ پھر جب آنکھیں ذرا اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو کھڑکیوں سے ایک ایک کر کے پردے سرکا دیئے گئے جس سے ملگجی روشنی اندر آگئی۔ بیشتر گھروں میں لوگ یہ سوچ کر کچھ دیر بیٹھے رہے کہ بس کسی بھی لمحے بجلی آجائے گی اور سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا۔ نیوب لائٹ، پنکھا اور ٹی وی کا اسکرین۔ چھوٹے بچے اندھیرے اور سفوکیشن کے بہانے گھر سے نکلنے کا موقع ڈھونڈنے لگے۔ نوجوانوں نے انگڑائیاں لیں اور بے ارادہ گھر سے نکل پڑے۔ اچانک سیڑھیوں پر چپلوں کی کھٹ پٹ سنائی دینے لگی۔ اس کے بعد بچوں کو روکنا مشکل ہو گیا۔ پھر ایک ایک کر کے بڑے بھی گھر سے نکلے مگر بے

ارادہ۔ اس طرح دیکھتے دیکھتے پوری کالونی کے مکین اپنے اپنے گھروں سے باہر آ گئے۔ عام طور پر شام کا یہ حصہ نہایت خوشگوار ہوتا ہے اور جسے پوری تفصیل نہ معلوم ہو وہ اتنے سارے لوگوں کو گھر سے باہر یوں دیکھے تو سمجھے گا کہ یہ لوگ شام کا لطف لینے باہر نکلے ہیں۔ لیکن دراصل شام کا یہ خوشگوار حصہ ان کے لیے ایک اضطراب لے کر آیا تھا۔

بیشتر لوگ بے دلی سے ہری ہری گھاس کے قطعے پر بیٹھے تھے یا ادھر اُدھر کھڑے تھے جیسے انہیں یقین ہو کہ ابھی ابھی بجلی آ جائے گی۔ لوگ بے چینی سے بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے اور وقت بھاگ رہا تھا۔ پندرہ منٹ، بیس منٹ، آدھا گھنٹہ ایک گھنٹہ، گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھ رہی تھیں، بچے کھیلتے کھیلتے تھکنے لگے تھے اور ان کی مائیں سوچنے لگی تھیں کہ صرف کمپلان سے کام نہیں چلے گا، انہیں کیلشم سینڈوز کی گولیاں بھی کھلانی پڑیں گی بلکہ اس سے بہتر ہوگا کیلشم ٹیکٹ مازا۔ کبھی ہیلتھ، کبھی فن۔ ٹیکٹ اندھیرا تیزی سے بڑھ رہا تھا اور اس سے بھی تیزی سے ان کے اندر بے چینی بڑھ رہی تھی۔ نوجوان لڑکے جو اگرچہ تنہا تنہا تھے لیکن ایک تو یہ کہ وہ عمر کے تقریباً ایک ہی دور سے گزر رہے تھے اور پھر ایک ہی اسٹینس کے تھے۔ یعنی اس کالونی کے رہنے والے تھے، تو انہوں نے پہلے ایک دوسرے، سے ہائے ہیلو کیا۔ پھر بجلی کے اچانک چلے جانے پر حیرت کی کہ انہوں نے اپنے ہوش سنبھالنے سے لے کر آج تک کبھی اپنی شام کا، انہی کے لفظوں میں، اس طرح ستیاناس ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ پھر وہ بے ارادہ ہی آگے بڑھے، بے ارادہ باہر نکلے اور بے ارادہ میں ہی کالونی سے ذرا دوری پر بنے ایک چائے کے کھوکھے تک پہنچ گئے۔ کھوکھے میں لالٹین جل رہی تھی۔ چولہا دھیمی آنچ سے سلگ رہا تھا۔ دو چار لوگ باہر بنچوں پر بالکل اطمینان سے بیٹھے تھے۔ ان میں کوئی بیزاری نہیں تھی بلکہ شاید وہ رات کے اس ابتدائی حصے کا لطف اٹھا رہے تھے۔ ریڈیو پر ایف ایم چینل بج رہا تھا۔ اس روز عالمی ایڈز دوس منایا جا رہا تھا۔ اس لیے پروگرام کا تھیم تھا ایڈز۔ اناؤنسر لڑکی اپنی نشیلی آواز میں بتا رہی تھی کہ ایڈز سے بچیں۔ ایک ہی پارٹنر سے سیکشوئل ریلیشن رکھیں اور سیف سیکس کے لیے کنڈوم کا استعمال کریں۔ اس کے بعد موضوع سے متعلق گانا شروع ہو جاتا ہے — سوتن کنے کا ہے جو میرے کنے نا ہیں۔ کتنا Sensual گانا ہے۔ ہیروئن ہیرو کے سامنے چست پتلون میں کمر مٹکاتے ہوئے یا کسی ہوئی چولی اس کے منہ کے سامنے لے جا کر لہراتے ہوئے گیت گا رہی ہوگی جو اس سے بھی زیادہ شہوانی اداؤں والی کسی اور لڑکی کے عشق میں گرفتار ہوگا۔ آج کل ایکسٹرا میریٹل ریلیشن کتنا عام ہو گیا ہے۔ ٹی وی سیریلیز دیکھ کر اور ایلا ارون کے گانے سن کر لگتا ہے آج کل اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں رہا۔ چٹکتے مٹکتے گانا ختم ہوا تو اناؤنسر کی شوخ آواز ایک بار پھر ابھری۔ وہ بتا رہی تھی کہ افریقہ میں ہر سال لاکھوں لوگ ایڈز کا شکار ہو رہے ہیں۔ افریقہ کے بعد ہندوستان میں ایڈز بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ سن ۲۰۰۵ تک ہندوستان میں چالیس لاکھ لوگ ایڈز سے مر جائیں گے — وہ یہاں ایسی ڈپریسنگ خبریں سننے کے لیے نہیں آئے تھے۔ اس لیے ایک نے ریڈیو کی آواز کم کرنے کو کہا۔ ایک نے جھلا کر کہا Rubbish مگر ایک نے موقع کو سنبھالتے

ہوئے ایک انگلش جوک سنانے کی خواہش ظاہر کی جو اس موقع پر فٹ آتا تھا۔ اس نے انگریزی میں ایک لطیفہ سنایا جس کو ہندوستانی میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے: چلتی ہوئی ٹرین میں بھگدڑ مچ گئی۔ ایک پاگل نوجوان سرنج لیے مسافروں کو دھمکی دے رہا تھا کہ اس میں ایڈز کے جراثیم ہیں۔ اس پر لوگ ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے مگر ایک آئرش اطمینان سے بیٹھا تھا۔ جان نے گھبرا کر اس سے پوچھا ''تمہیں اس پاگل سے ڈر نہیں لگ رہا۔''

''نہیں''

''کیوں؟''

''میں کیوں ڈروں۔ میں نے تو کنڈوم پہن رکھا ہے۔'' ہاہاہا—

انگریزی جاننے اور بولنے والے یہ سارے نوجوان ہنسے۔ پھر کسی اور نے سردار جی کا لطیفہ سنایا جو اس نے خشونت سنگھ کے کالم میں پڑھا تھا۔ اس کے بعد لطیفوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اسی دوران چائے بھی آئی جوان کے اعتبار سے بہت گھٹیا معیار کی تھی لیکن ویج اور نان ویج لطیفوں کی باڑھ میں گاڑھے دودھ اور الائچی کی خوشبو والی چائے بہہ گئی۔ پھر یہ سلسلہ بھی ٹوٹا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ کالونی میں بجلی اب بھی نہیں آئی تھی۔ پھر انہوں نے اب تک بجلی نہ آنے پر اجتماعی تشویش کا مظاہرہ کیا۔ ان میں سے ایک نے بجلی محکمے کی غفلت کی بات کو پھیلاتے ہوئے کہا ''یہاں تو آج ہی ایسا ہوا ہے۔ لیکن پرانے علاقوں میں اور گنجان آبادی والے علاقوں میں تو بجلی کی یہ صورتِ حال روز کی ہے۔ یاد کیجئے کہ پچھلے اسمبلی الیکشن میں پیاز اور بجلی ہی دو ایشوز تھے جن پر پچھلی سرکار ڈھہ گئی اور نئی سرکار Overwhelming majonity سے پاور میں آئی لیکن ہوا کیا؟ اور خیر! بجلی ہی کیا۔ یہاں کس چیز کا حال اچھا ہے؟ شہر کے بیشتر علاقوں میں قطرہ قطرہ گن کر پانی سپلائی ہوتا ہے اور پانی بجلی وغیرہ تو خیر سے چھوٹے چھوٹے مسئلے ہیں لوگ تو مسئلوں کے بیچ...

لگاتار اتنی دیر تک بولنے کے بعد اس نوجوان کو محسوس ہوا کہ کسی نے اس کی تائید تک نہیں کی۔ سچ تو یہ ہے کہ دوسرے سارے نوجوان اس کی بات سے اوب چلے تھے کیونکہ یہ باتیں تو، انہیں اخباروں کے ذریعہ معلوم ہوتی ہی رہتی تھیں اور وہ یہ سوچنے میں، اپنی دانستہ میں حق بجانب تھے کہ دوسری جگہوں میں اگر پانی بجلی یا روز مرہ کی دیگر چیزوں کی کمی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بھی ان مصیبتوں کو جھیلیں۔ کیونکہ وہ اندر پرستھ کالونی میں رہتے تھے اور یہ ایک ایسی کالونی تھی جس کا پتہ بتاتے ہوئے وہ اپنے آپ میں فخر محسوس کرتے تھے کیونکہ وہ ان کامیاب باپوں کی اولاد تھے جنہوں نے سماج کے معزز شہری ہونے اور اس اونچی آمدنی والی کالونی میں رہنے کا استحقاق اپنی صلاحیتوں سے حاصل کیا تھا اور جن کے بارے میں سوچتے ہوئے ان نوجوانوں کے اندر ایک طرح کا Sense of Pride پیدا ہوجاتا تھا۔

کالونی کے بوڑھے ادھیڑ اور جوانوں نے جو تقریباً دو گھنٹے سے اس اوبا دینے والے ماحول سے مقابلہ کررہے تھے، تنگ آکر یہ سن گن لینے کی کوشش کی کہ آخر ہوا کیا ہے۔ کوئی سرکٹ ٹرپ آف ہونے کا قیاس

کرتا تو تو کوئی ٹرانسفار مر بیٹھ جانے کا۔ کسی کا کہنا تھا کہ جنریٹنگ اسٹیشن میں کوئی گڑبڑ ہوئی ہوگی ورنہ اتنی دیر نہیں ہوسکتی۔ سچ کیا ہے اس کا پتہ لگانے کے لیے کچھ لوگوں نے یہ طے کیا یہ سب۔ اسٹیشن چل کر معلوم کیا جائے۔ وہ نوجوان جو ابھی ابھی کالونی میں واپس لوٹے تھے اور جو یوں بھی بے ارادہ ایک دوسرے کے ساتھ تھے، ان لوگوں کے ساتھ ہولیے۔ اس طرح اچھی خاصی تعداد میں لوگ سب۔ اسٹیشن پہنچ گئے۔ الیکٹریکل انجینئر اور مستریوں کی اُس روز شامت ہی آئی تھی کہ وہ شام کو مارکٹ گھومنے چلے گئے تھے۔ ابھی ابھی وہ لوٹے تھے اور انہیں پتہ چلا تھا کہ اندر پرستھ کالونی میں دو گھنٹے سے بجلی نہیں ہے اور وہ اوزار لے کر فالٹ چیک کرنے کے لیے نکل ہی رہے تھے کہ لوگ وہاں پہنچ گئے۔ اندر پرستھ کالونی کے لوگ، جس کی آبادی صد فی صد خواندہ ہے اور جو (اپنے) حقوق اور (دوسروں کے) فرائض کے قانون سے پوری طرح واقف تھے، جب یہ دیکھا کہ بجلی والے اب مرمت کے لیے نکلے ہیں تو انہیں اپنے آپ کو اور ان کو ایک دوسرے کے تقابل میں سوچ کر سخت غصہ آیا۔ نوجوانوں کا غصہ دو طرح کا تھا۔ ایک تو یہی کہ وہ اندر پرستھ کالونی کے باشندے ہیں اور دوسرا یہ کہ ان کی رگوں میں تازہ خون دوڑ رہا تھا کہ یہ عمر ہوتی ہی ہے اتنی سرکش کہ کوئی غلط بات برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ سو انہیں بجلی کے اب تک نہ آنے سے زیادہ اندر پرستھ کالونی کو Neglect کیے جانے پر غصہ آیا۔ انہوں نے انجینئر کو ایسی کچی پکی سنائی جو اس طبقہ کے روزمرہ کے گفتگو کے معیار سے ناشائستہ ہی کہی جاسکتی ہے۔ بڑوں نے البتہ شائستگی سے لیکن بہت کڑے لفظوں میں انجینئر کی سرزنش کی۔ اس کا ٹرانسفر کروادینے، حتی کہ دو ایک نے سسپنڈ کرادینے کی دھمکی دی۔ انجینئر جانتا تھا کہ یہ بیوروکریٹس اور ایگزیکٹو ہیں، یہ فائلوں پر پورے ملک کے سفید و سیاہ کے مالک ہیں۔ یہ صدر جمہوریہ کے Behalf پر قوم کی قسمت کے فیصلے کر کے اس پر اپنے دستخط ثبت کرتے ہیں۔ اس لیے اس نے ہاتھ جوڑ کر سب سے معافی مانگی اور ان کے اطمینان کے لیے مستریوں کے ساتھ خود بھی تاروں کی مرمت کے لیے چلا گیا۔

مستریوں کو کافی ڈھونڈ ڈھانڈ کے بعد پتہ چلا کہ انڈر گراؤنڈ کیبل جل گیا ہے۔ سو انہوں نے جو انجینئر سے بھی زیادہ ڈرے ہوئے تھے۔ پھاوڑے سنبھالے اور زمین کھودی۔ کالونی کے کچھ لوگ جو جلد از جلد بجلی کی بحالی کے لیے بالکل اتاؤلے ہو رہے تھے۔ وہاں آکر کھڑے ہوگئے۔ انہیں سر پر کھڑا دیکھ کر مستریوں نے ضرورت اور اپنی بساط سے زیادہ مستعدی سے کام شروع کردیا۔

ادھر کالونی کے لوگ راستوں پارکوں اور لانوں میں اپنے اپنے مذاق اور عمر کے لوگوں سے ادھر اُدھر کی گفتگو کر کے یہ دشوار گھڑیاں کاٹ رہے تھے۔ ایسی گفتگو جس کا مصرف اگرچہ کچھ نہ ہو لیکن اس میں ان کا اپنا سلیقہ اظہار ان کا Sense of humour انگریزی زبان پر ان کی دسترس ان کی معلومات اور ان کی خوش ذوقی ظاہر ہو۔ اس بے مصرف گفتگو میں بھی یہ اپنے اپنے محکمے کی اہمیت اور اس میں اپنی پوزیشن کے بارے میں فخریہ انداز سے بتاتے ہوئے نہایت شائستہ طریقے سے ایک دوسرے پر اپنا رعب جمانے کی

کوشش کرتے رہے۔ ایسی گفتگوؤں کا بہرحال اتنا فائدہ رہا کہ ان میں سے بیشتر لوگ جو اب تک ایک کالونی میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی صورت تک سے نا آشنا تھے کچھ کچھ ایک دوسرے سے، بلکہ ایک دوسرے کے designation اور skill سے آشنا ہوگئے۔ عورتیں ایک دوسرے کے دفتر، شوہر کے Behaviours اور فریج، ٹی وی اور وی سی آر کے برانڈ وغیرہ کی سطح پر کچھ حد تک ایک دوسرے سے آشنا ہوگئیں۔

عام دنوں میں بالکونی کی ٹیوب لائٹوں اور اسٹریٹ پول کی نیون لائٹوں سے جگمگاتی کالونی میں آج اندھیرا چھایا تھا۔ گھروں میں موم بتیاں جلا دی گئی تھیں۔ لیکن ان کی روشنی اتنی ناکافی تھی کہ وہ باہر تک آتی۔ وقفے وقفے سے کوئی کار یا اسکوٹر کالونی میں داخل ہوتا تو کچھ گھڑی کے لیے ہیڈ لائٹس سے روشنی کا ایک بھبکا اندر آتا اور لوگوں کی آنکھوں پر پڑتا تو وہ چندھیا کر آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا لیتے۔ کاروں اور اسکوٹروں سے واپس آنے والے یہ وہ لوگ تھے جو کچھ دیر بجلی کے آنے کا انتظار کرنے کے بعد اپنے کنبوں کے ساتھ شہر کے مرکزی حصے میں Softy کھانے، یا کسی دوست کے یہاں وقت گزارنے چلے گئے تھے اور اب یہ سوچ کر اطمینان سے واپس آگئے تھے کہ بجلی آگئی ہوگی۔ بجلی ابھی نہیں آئی تھی۔ حالانکہ مستری مستعدی سے کام میں جٹے ہوئے تھے کیونکہ انہیں اپنی عافیت اسی میں نظر آرہی تھی۔ پھر کالونی کے کچھ لوگ انہیں Watch بھی تو کر رہے تھے۔

خیر! اس پوری کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ رات تقریباً گیارہ بجے بجلی کی سپلائی پھر بحال ہوگئی۔ کالونی کے لوگوں کی زندگی جیسے معمول پر آگئی۔ اب تک سب کچھ ایسے ہی ہوا جیسے تھوڑی دیر کے لیے ٹرین کسی ٹنل میں داخل ہوگئی ہو اور عین اسی وقت شارٹ سرکٹ ہوگیا اور کسی نے گھبراہٹ میں چین کھینچ کر گاڑی روک دی ہو۔ اضطراب اور پریشانی کی گھڑیاں گزر گئیں۔ بالکونی اور سیڑھیوں کی ٹیوب لائٹوں اور اسٹریٹ پول کی دودھیا روشنی سے روز کی طرح پھر کالونی اجالے میں شرابور ہوگئی۔ کالونی میں چھائی اضطراب انگیز چہل پہل ایک طرح کے اطمینان میں تبدیل ہوگئی اور لوگ — اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے۔

تھوڑی ہی دیر بعد چوکیدار نے ڈنڈے پٹک پٹک کر اور سیٹی بجا بجا کر اپنے مستعد ہونے کا اعلان شروع کر دیا۔ کالونی کے تقریباً تمام گھروں میں دیر تک بتیاں جلتی رہیں اور ہر گھر میں تقریباً وہ سب کچھ ہوتا رہا جو ہفتہ اور اتوار کی درمیانی رات کو ان کے طے شدہ معمول کے مطابق ہونا چاہیے تھا۔ اس کے بعد کی صبح دوپہر اور شام بھی انہوں نے اپنے اپنے طور پر نہایت سلیقے سے معمول کے مطابق گزاری۔ دوسری شام کالونی کے پارکوں اور لانوں اور راستوں پر کل کو چھوڑ کر پچھلے گزری سیکڑوں ہزاروں شاموں کی طرح سکوت اور ویرانی رہی اور اس سے پہلے کی سیکڑوں ہزاروں راتوں کی طرح رات کے ابتدائی پہر گھروں کی بتیاں بجھ گئیں۔

مانگے کا اجالا

دوسرے بچے کی آمد آمد تھی۔ میں اور میری بیوی بڑی بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ ڈاکٹرز نے جو دن معین کیا تھا وہ کب کا گزر گیا مگر زچگی کے آثار ابھی تک نظر نہیں آرہے تھے۔ اس دور افتادہ جگہ پر اپنا پرایا ایسا کوئی نہ تھا جسے مشورہ لیتے۔

آخر کار مجھ سے رہا نہ گیا۔ دفتر میں اپنے افسر کرنل چڈا سے صلاح لی۔ انہوں نے فوراً ملٹری اسپتال سے ایمبولنس ہوائی اور شوبیتا کو تیج پور بتیس اسپتال بھجوا دیا۔ دوسرے روز میں بھی تیج پور روانہ ہوا۔

''سر، مبارک ہو، سورج سا بیٹا ہوا—'' میں ابھی آفسرز فیملی وارڈ کے اندر جانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ مسکراہٹیں بکھیرتی ہوئی ایک نرس نے مجھے یہ خوش خبری سنائی۔

''تھینک یو سسٹر، تھینک یو ویری مچ'' میں نے تعظیم وتکریم کے ساتھ اس وردی پوش نرس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے کاندھوں پر کانسی کے تین ستارے چمک رہے تھے اور بائیں چھاتی کے ابھار پر نام کی پٹی سیفٹی پن سے بندھی ہوئی تھی۔ قریب جا کر میں نے نام پڑھنے کی کوشش کی۔ ''کیپٹن نینا گنگولی''

''دیٹ از رائٹ'' وہ مسکرا کر چل دی۔

مجھے اس بات کا تعجب ہوا کہ یہ سب اتنی جلدی کیسے ممکن ہوا۔ وہاں نینگا دیلی میں تو درد زہ بھی نہ اٹھا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ داخلہ لینے کے فوراً بعد ہی مریض کو گلوکوز چڑھایا گیا اور رات کو معمولی سا آپریشن کر کے بچہ برآمد کیا گیا۔

وارڈ کے اندر داخل ہوتے ہی میں نے بچے کے ملائم گالوں کو پچکارا۔ وہ مہر تاباں کی طرح اپنی تابندگی بکھیر رہا تھا۔ نظر بد سے بچانے کے لیے کسی نے اس کے ماتھے پر کاجل کا بڑا سا ٹیکا لگایا تھا۔

''یہ ٹیکا کس نے لگایا؟'' میں نے شوبیتا سے پوچھا۔

''سسٹر نینا نے۔ وہ کہتی تھی کہ ڈیلیوری کے وقت بچے کو بدلنے کی کوشش کی گئی تھی مگر سسٹر نے ان کے ارادوں پر پانی پھیر دیا۔'' ڈری سہمی شوبیتا بچے کو بار بار چھو رہی تھی۔

''کم آن— تم اور تمہارا شک۔ وہم کی دارو لقمان کے پاس بھی نہیں۔''

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تمہیں وشواس نہیں آتا، نہ آئے۔ میں نے یہ بھی سنا کہ جو لوگ اس کو بدلنا چاہتے تھے ان کے ہاں چوتھی بار لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ انہوں نے حتی الامکان کوشش کی تھی مگر سسٹر نینا چوکتی رہی۔''

''کیسی باتوں پر تم وشواش کرتی ہو۔ یہ کوئی بچوں کا کھیل ہے جو جی میں آیا کر لیا۔ اس سسٹر نے دیکھ لیا

ہوگا کہ تم ضعیف الاعتقاد ہو، اس لیے شگوفہ چھوڑ دیا ہوگا۔"

"آپ کو ہر بات شگوفہ لگتی ہے۔ فرض کرلو وہ لوگ بچہ بدلنے میں کامیاب ہوجاتے تو جانتے ہو کیا ہوتا۔ ہم دونوں عمر بھر یہی مان کر چلتے کہ میری کوکھ سے لڑکی پیدا ہوئی تھی اور وہی ہماری اصلی اولاد ہے۔ یہی جھوٹا سچ ہم عمر بھر اپنے سینے سے لگائے رہتے۔"

شویتا کی باتوں میں کافی وزن تھا۔ اس کی دلیل سے میرے دل میں شبہات کے دھندلکے چھانے لگے تاہم میں نے شویتا کی ڈھارس بندھائی۔

"ایسی کون سی ماں ہوگی جو اپنے لخت جگر کو الگ کرنے پر راضی ہوگی؟" میں نے سوال کیا۔

"بیچاری مجبور تھی۔ سسرال والوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس بار بھی بیٹی جنی تو گھر واپس نہ آنا۔ اپنے میکے میں اپنا بندوبست کرلینا۔"

"تم نے سنا اور یقین کر بیٹھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔"

"کیوں نہیں ہوسکتا۔ آئے دن اخباروں میں خبریں چھپتی ہیں کہ اب مائیں رحم میں ہی بچے کے جنس کا پتہ لگواتی ہیں اور اگر لڑکی ہوئی تو اسقاط کرواتی ہیں۔"

میں نے اس بحث کو آگے بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ سال بھر بعد میرا تبادلہ ارنا چل پردیش سے شیلانگ ہوگیا جہاں ایک روز اچانک میرے پیٹ میں زور کا درد اٹھا۔ میں نے جیپ منگوائی اور فوراً ملٹری اسپتال پہنچ گیا۔

"آپ یہاں لیٹ جایئے۔" میجر مدھوک نے معائنہ ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اپنی قمیض اور پتلون ڈھیلی کرکے میں ٹیبل پر دراز ہوگیا۔ میجر مدھوک نے اپنی انگشت شہادت سے میرے پیٹ کے نچلے دائیں حصے کو دبا دیا۔

"اوہ گاڈ" میں مینڈک کی طرح اچھل پڑا جیسے کسی برقی رو نے مجھے چھولیا ہو۔

میجر مدھوک نے مجھے وقت ضائع کرنے کے بغیر مجھے فوراً اسپتال میں بھرتی ہونے کی ہدایت کی۔

میں نے ٹیلیفون پر گھر میں اطلاع دی اور خود براہ راست سرجن اسپیشلسٹ کے سامنے پیش ہوا۔

"سسٹر، ان کو جلدی آپریشن تھیٹر میں لے چلو۔ التہاب زائدہ کا کیس ہے۔ فوراً آپریشن کرنا پڑے گا۔" کرنل بدھوار نے میرا معائنہ کرکے اپنا اسٹیتھسکوپ کانوں سے اُتارا اور پاس ہی کھڑی نرس کو حکم دیا۔

سسٹر نے میرے ہاتھ میں نیلا اور سفید دھاری دار پاجامہ تھما دیا اور ہدایت دی کہ سارے کپڑے اتار کر صرف اس پاجامے میں آپریشن ٹیبل پر لیٹ جاؤں۔

"سسٹر، مریض کو جلدی تیار کردو۔ کوئیک۔" باہر سے دوبارہ کرنل کی آواز آئی۔

"یس سر۔"

سسٹر نے بڑے ہی تدبر سے میرا پاجامہ ڈھیلا کردیا اور دھیرے دھیرے اس کو نیچے کی طرف سرکا

لیا۔ پھر وہ بلیڈ سے میرے موٹے زہار صاف کرنے لگی تاکہ آپریشن کرتے وقت کوئی دقت پیش نہ آئے۔ میں یہ ساری کارروائی کسی مزاحمت کے بغیر دیکھتا رہا۔ نرس کے چہرے پر فہمیدہ پن اور متانت صاف جھلک رہی تھی۔

میری خوفزدہ آنکھیں آپریشن ٹیبل کے اوپر لٹکتے ہوئے جھاڑ کی روشنیوں میں زندگی تلاش کر رہی تھیں۔

بے ہوشی کی دوا سونگھنے کے بعد مجھے آگے کا حال معلوم نہیں۔ البتہ جب ہوش آیا تو میں تھیٹر کے بدلے آفسر وارڈ کے ایک بستر پر کراہ رہا تھا۔ درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں گو ابھی بھی غنودگی چھائی ہوئی تھی۔

''پانی... پانی'' میں نے نرس کو آواز دی۔

ایک نرس میرے بیڈ کے قریب آکر مجھے دلاسہ دینے لگی۔ یہ وہ نرس نہیں تھی جو آپریشن تھیٹر میں ملی تھی۔

''سر، آپ پانی بالکل نہیں پی سکتے۔ آج دن بھر آپ کو برداشت کرنا پڑے گا۔ آپ اپنے لعاب سے اپنے منہ اور ہونٹوں کو تر کرتے رہیے۔'' وہ ہمدردی اور شفقت کی مورت بن گئی۔ پھر اس نے اپنی نرم و گداز بانہوں میں میرا سر اٹھا کر تکیے کا غلاف بدل ڈالا۔

میں کنکھیوں سے اس کے گدرائے ہوئے بدن کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ میری اس حرکت کو شاید تاڑ گئی مگر میرا دل رکھنے کے لیے اس نے خفیف سی مسکراہٹ اپنے گلابی چہرے پر بکھیر دی اور گڈ نائٹ کہہ کر چلی گئی۔

دوسرے روز علی الصبح کپتان میناکشی آئینگر، جو مجھے آپریشن تھیٹر میں ملی تھی، میری عیادت کے لیے وارڈ میں وارد ہوئی۔

''سر، اب آپ کیسے ہیں؟''

''پہلے سے بہتر ہوں۔'' میں نے اپنے چہرے پر مسکان اوڑھتے ہوئے اس کا سواگت کیا۔

شگفتہ دل، تبسم ریز میناکشی میرے قریب آئی۔ میرے ماتھے کو سہلایا۔ پھر میرے منہ میں تھرمامیٹر ڈال کر میرا نبض ٹٹولنے لگی۔ آخری میں پاس رکھے ہوئے کاغذوں کی جانچ پڑتال کر کے ہوا میں سنبل کی خوشبوئیں گھول کر چلی گئی۔

اس کے بعد وہ کئی بار آئی یا یوں سمجھئے کہ بار بار آئی۔

میری نوکری پیشہ بیوی بھی مزاج پرسی کے لیے روزانہ آجاتی مگر ہر بار میرے اردگرد دو تین کھلکھلاتی نرسوں کو دیکھ کر حسد سے جل کر کباب ہو جاتی۔ بڑی حاسد قسم کی عورت ہے۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسپتال کی سفید چادر میں ہی مجھے گٹھری بنا کر لے اڑتی۔

ادھر بھگوان کی مرضی کچھ اور ہی تھی۔ ٹانکوں میں پیپ بھر گئی۔ میرا ڈسچارج مزید پندرہ روز کے لیے ملتوی ہو گیا۔ وہ ڈاکٹر کو کوستی رہی اور میں دعائیں دیتا رہا۔

اس دوران میں میناکشی کے ساتھ میرے مراسم کافی حد تک بڑھ گئے۔ وہ رات کو دیر تک میرے پاس

بیٹھ کر خوش گپیاں لڑاتی۔

اسپتال سے ڈسچارج کے بعد بھی میناکشی کے ساتھ میرا رابطہ بدستور قائم رہا۔ کبھی ٹیلیفون پر بات ہو جاتی اور کبھی میں ہی اس کے میس میں جا کر اسے ملاقات کر آتا۔

پھر ایک روز میناکشی نے بتایا کہ وہ شادی کرنے جا رہی ہے۔ لڑکی کیرلا کا برہمن ہے۔ گلف میں نوکری کرتا ہے۔ اس نے اپنی جیب سے اپنے منگیتر کی تصویر نکال کر مجھ کو دکھائی۔ دو ہفتے کے بعد اس نے طے شدہ پلان کے مطابق سنڈیکیٹ بنک میں ہم دونوں کی ملاقات بھی کروالی۔ دیکھنے میں اوسط قد کا سیاہ فام متین لڑکا لگ رہا تھا۔

''ہیلو سر، آپ یہاں...!'' میناکشی نے انجان بن کر مجھ سے پوچھا۔

''بس یونہی۔ کچھ روپیہ نکالنا تھا۔'' میں نے اس کے منگیتر کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

''سر، میٹ مائی ووڑبی۔ گوپی ناتھ۔'' اس کی طرف رخ کر کے وہ پھر بولی۔ ''آپ ہیں میجر اشوک رینا۔''

میں نے مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ''ہیلو ہو آر یو، کپ شادی ہو رہی ہے آپ دونوں کی۔'' میرا ردعمل عام دستور کے مطابق تھا۔

''بس اگلے مہینے۔''

''ویٹ از گریٹ۔ شادی پر ہمیں بھولئے گا نہیں۔''

''نو سر، وہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' میناکشی نے اپنے منگیتر کے بدلے جواب دیا اور پھر اس کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر بنک سے باہر چلی گئی۔

میناکشی کی شادی اس کے آبائی گاؤں میں ہوئی۔ وہ مجھے دعوت نامہ بھیجنا بھول گئی یا شاید دیدہ و دانستہ نہ بھیجا ہو۔ گوپی ناتھ دس روز میں ہی گلف چلا گیا اور میناکشی شتابی واپس شیلانگ پہنچ گئی۔ پہنچتے ہی اس نے مجھے ٹیلیفون کیا۔

''ہیلو، سر، آپ کیسے ہیں؟''

''اچھا ہوں۔ تم آ گئی...! اتنی جلدی...! میری آواز میں تحیر اور تجسس کی ملی جلی کیفیت تھی۔

''ابھی ابھی پہنچی ہوں۔ ابھی تو سامان بھی نہیں کھولا ہے۔''

''شادی کیسی رہی؟ شادی مبارک ہو۔''

''بس سو سو...!'' اس کے لہجے سے اکتاہٹ اور تھکاوٹ ٹپک رہی تھی۔

''گوپی ناتھ کیسے ہیں؟''

''وہ واپس گلف چلے گئے۔ بس دس دن کی چھٹی ملی تھی انہیں۔''

''سر، آپ سنایئے، سونیتا کہاں ہیں؟''

''وہ آج کل میکے میں ہے۔''

''اور بچے...؟''

''وہ بھی اسی کے ساتھ ہیں۔''

''مطلب یہ کہ آپ آج کل اکیلے ہیں۔ بور تو نہیں ہوتے۔'' ''یونہی سمجھو اور بھی تو کوئی چارہ نہیں ہے۔''

''میں شام کو گھر پر ملنے آؤں۔ کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔''

''یو آر ویل کم۔ اس میں اعتراض والی کون سی بات ہے۔ ہاں، میرا بیٹ مین ساڑھے پانچ بجے چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد چلے آنا۔''

''ٹھیک ہے۔''

شام ٹھیک چھ بجے میرے دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے ناریل کی خوشبو میں ملفوف مینا کشی کھڑی تھی۔ اندر آتے ہی وہ میرے ساتھ اتنے زور سے لپٹ گئی مانو برسوں کی جدائی کے بعد ملی ہو۔

وہ سیدھے بیڈ روم میں گھس کر میرے بیڈ پر دوزانو بیٹھ گئی۔

''کیئر فار اے ڈرنک۔'' میں نے رسمی طور پر پوچھا۔

''جن ہے تو پی لوں گی۔''

میں نے لیمن سوڑا ڈال کر اس کے لیے جن کا ایک گلاس بنایا اور خود اپنے لیے وہسکی کا جام بھر دیا۔

پھر ادھر اُدھر کی باتیں شروع ہوئیں۔ وہ بے تکلف ہوتی گئی اور آہستہ آہستہ بستر پر دراز ہوگئی۔ اس کی مخمور آنکھیں دعوت دے رہی تھیں۔

''سر، آپ نے مجھے شادی پر کوئی تحفہ نہیں دیا۔'' وہ بولی۔

''تم نے تو مجھے دعوت کے قابل بھی نہ سمجھا۔'' مجھے شکایت کرنے کا موقع مل گیا۔ ''مجھے کیا معلوم تمہاری شادی کب اور کہاں ہوئی۔''

''میں نے تو کارڈ بھیج دیا تھا۔ کیا آپ کو نہیں ملا؟''

''نہیں۔''

''آج کل ڈاک کا بھی کوئی بھروسہ نہیں۔ میں نے تو خود ہی پوسٹ کیا تھا۔''

''خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ ہاں، تم کچھ تحفے کے بارے میں کہہ رہی تھی۔''

''سر، تحفہ تو آپ کو دینا ہی پڑے گا۔ ابھی کون سی دیر ہوگئی۔'' وہ لجاتے شرماتے کہنے لگی۔

''تمہارے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔ تحفہ کیا چیز ہے۔''

''مجھے آپ کی نشانی چاہیے!'' اس کا چہرہ تمتماہٹ سے انگارہ ہوگیا۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''مجھے آپ کا بچہ چاہیے۔''

حیرت سے میں اس کے چہرے کو گھورنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی تراوٹ اور چمک تھی جو میں نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ اس کے اعضاء میں عجیب سی کشش، تناؤ اور تشنج پیدا ہو چکا تھا۔ وہ خود سپردگی کے عالم میں تڑپ رہی تھی۔

میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر غنودگی کے سبب الفاظ میرے حلق میں پھنس گئے۔ بلا ارادہ میرے بازو پھیلتے چلے گئے اور وہ ایسے کھنچی چلی آئی جیسے تنکا کہربا کی جانب۔

اس کے لبوں کا شہد اور بغلوں کی بو، مجھے دیوانہ بنانے کے لیے کافی تھیں۔ جی میں آئی کہ لقمہ بنا کر یکمشت نگل ڈالوں۔ اسی طوفان میں ہم ایک دوسرے میں اپنا وجود کھو بیٹھے۔

طوفان تھم جانے کے بعد بھی میں اس کے حرارت سے لبریز پستانوں کے ساتھ چھوٹے بچے کی مانند کھیلتا رہا۔ میرا تجسس ابھی برقرار تھا۔ میں نے میناکشی سے سوال کیا۔

''گوپی ناتھ کے ساتھ ہنی مون نہیں منایا کیا؟''

''ہاں منایا۔ پورے ہفتے اکٹھے رہے مگر وہ تو چغد ہے۔ اس کو اس بارے میں کوئی علم نہیں۔ اُن دنوں میرا سیف پیریڈ چل رہا تھا۔ کوئی امکان نہیں...!''

''اور اب؟'' میں نے استفسار کیا۔

''آگے پندرہ روز بڑے نازک ہیں۔ میری تمنا ہے کہ ان دنوں ہم روزانہ ملتے رہیں۔ میں یہ چانس مس نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے آپ کا تخم چاہیے۔''

''مجھے لگتا ہے کہ تم باؤلی ہو گئی ہو۔''

''نہیں سر۔ یہ میری آرزو ہے۔ میں عمر بھر آپ کی نشانی کو گلے سے لگانا چاہتی ہوں۔ مجھے مایوس نہ کرنا۔''

میں نے سنا تھا کہ جنوبی ہند کی دوشیزائیں بہت ہی شہوت پرست ہوتی ہیں۔ گوری چمڑی والوں پر مرمٹتی ہیں۔ مگر ان کے ہیجان کا یہ حال ہوگا مجھے معلوم نہ تھا۔

''میناکشی۔ میرے آپریشن کا وہ منظر یاد ہے؟''

''کون سا...؟ کیا ہوا تھا اس دن...؟'' اس نے بے پروائی سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

''یاد کرو۔ آپریشن سے پہلے تم نے کیسے مجھے تیار کیا تھا۔ میرا پاجامہ ڈھیلا کر کے نیچے کھسکا لیا تھا۔ بلیڈ سے میرے پیڑو کی صفائی کی تھی۔ میرے ننگ دھڑنگ جسم کو دیکھا تھا، چھوا تھا۔''

''ہاں، تو پھر کیا ہوا۔ یہ تو ہمارا پیشہ ہے۔''

''کیا تمہیں اس وقت کچھ بھی محسوس نہ ہوا؟''

''سر، ڈونٹ بی سلی۔ اس وقت تو میں اپنی ڈیوٹی کر رہی تھی۔ ایسا ہونے لگے تو ہم سبھی مریضوں کو چاٹتے پھریں گے۔ مجھے تو اب یہ بھی یاد نہیں کہ اس دن میں نے کیا کچھ کیا تھا۔'' وہ میری عریاں ران کو سہلاتے ہوئے بولی۔

''اوہ، آئی سی...''

اس نے پھر ایک بار اپنے گرم ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیئے اور اپنے ملائم ہاتھوں سے میرے بدن کو آہستہ آہستہ ملنے لگی۔ پھر وہ اپنی تر زبان سے میرے بدن کے مختلف اعضا کو چاٹنے لگی۔ جیسے سارے بدن کا ذائقہ اپنے منہ میں سمیٹ کر لے جانا چاہتی ہو۔ اس کی اس اشتہا انگیز کارروائی نے میرے بدن کا شعلہ پھر بھڑکا دیا اور میں نے اس آگ کو بجھانے کی خاطر دوبارہ اسی کے جسم میں پناہ لی۔ میناکشی کو ایسا محسوس ہوا جیسے ساون کی پھوار نے اس کے کھیتوں کی تشنگی مٹا دی ہو۔

مہینہ ڈیڑھ مہینہ معاملہ ایسے ہی چلتا رہا۔ جونہی اسے پورا یقین ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے، اس نے نوکری سے استعفیٰ دیا اور اپنے شوہر کے پاس گلف چلی گئی۔

میناکشی کے ساتھ میرا ربط اسی دن ٹوٹ گیا جب اس نے شیلانگ کو خیر باد کہا۔ البتہ اس کی سہیلیوں کے توسل سے کچھ اڑتی اڑتی خبریں سننے کو ملتیں۔ پہلی یہ کہ اس نے ایک خوبصورت بیٹے کو جنم دیا ہے اور دوسری یہ کہ اس نے کسی اسپتال میں نرس کا کام سنبھالا ہے۔

ان خبروں کی تصدیق کے لیے میں نرسنگ آفسرز میس میں اس کی سہیلی سے ملا۔

''میناکشی کی کوئی خبر...؟'' میں نے پوچھا۔

''شی از فائین... کل ہی اس کی چٹھی آئی تھی۔ بڑے مزے میں ہے۔'' وہ بولی۔

''سنا ہے کہ نوکری کر رہی ہے۔'' میں نے کریدا۔

''ہاں سر، ایک اسپتال میں نرس کا جاب ملا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں نے تو سنا تھا کہ اس کا بچہ پیدا ہوا ہے۔ پھر وہ نوکری کیسے کر پا رہی ہے۔'' میں نے پھر پوچھا۔

''یس سر۔ لڑکا تو پیدا ہوا تھا مگر اس کو کیرالا میں اپنی ماں کے پاس چھوڑ کر واپس چلی گئی۔'' وہ میری آنکھوں کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتی رہی۔

کچھ دیر بعد میں نے اُس سے رخصت لی اور بوجھل قدموں سے اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔

باہر رات بہت ہو چکی تھی۔ گیلی سڑک کے دونوں کناروں پر گھنے درختوں کے مہیب سائے ڈراونے لگ رہے تھے۔ ایک طرف مینڈکوں کا ٹرٹرانا اور دوسری طرف جھینگروں کا شور۔ سارے ماحول میں طلسمی سنسناہٹ سی چھائی ہوئی تھی۔ دور کہیں دور کوئی کوئل اپنی درد بھری آواز میں کوک رہی تھی۔ کچھ دن پہلے اس نے اپنے انڈے کسی دوسرے پرندے کی تحویل میں رکھ چھوڑے تھے اور آج وہ اس گھونسلے کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کا نام و نشان مل نہیں رہا تھا۔

شاہد اختر

دو پاؤں کا گھوڑا

جانے کتنی دیر ہوگئی تھی اسے ٹک ٹکی لگائے چھت کو گھورتے ہوئے۔ اب تک جانے کتنے آنسو تکیہ میں جذب ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی چیزوں کا اعداد و شمار اس کے پاس نہیں تھا۔ یاد تھا تو صرف یہ کہ بیس برس ہو گئے تھے اس شہر میں آئے ہوئے بلکہ یہ منحوس پیشہ اختیار کیے ہوئے۔

پیسے کے عوض اپنا جسم بیچنے والا وہ شہر میں اکیلا نہیں تھا مگر اس کی حکایت شاید دوسروں سے مختلف تھی۔ شروع میں جب وہ یہاں آیا تھا تب بہت کم لوگ تھے لیکن وقت کے ساتھ تعداد اتنی بڑھی کہ جس کام کا اعتراف مشکل تھا، افتخار کا شائبہ ہونے لگا۔ وقت کے تغیر کی یہ سفاکیت بھی اسے اکثر و بیشتر افسردہ کر جاتی۔ اسے اپنے دھندے سے اب کوئی شرم تھی نہ عار۔ سب کچھ زندگی کا حصہ بن گیا تھا۔ اس سے نجات کا خیال بھی اس کے ذہن میں نہیں آتا۔ اگرچہ اس کے لیے بہت سی چیزوں کے معنی ابھی نہیں بدلے تھے۔ جسمانی اور ذہنی اذیت اسی وجہ سے اوروں سے زیادہ بڑھی تھی باوجود اس کے فرار کا راستہ اس نے خود ہی بند کر دیا تھا بلکہ تالا ڈال دیا تھا۔

اپنے اس روپ کے لیے وہ سب سے زیادہ قصور وار اپنی ماں کو ٹھہراتا۔ خلوت کے اداس لمحوں میں جب وہ اپنے بارے میں سوچتا ایک گول مٹول سا آٹھ نو برس کا بچہ فراک پہنے ہوئے ماضی کے در و محرابوں سے جھانکتا ہوا نظر آتا۔

اس بچے کا نام ببلو تھا اور وہ اپنے پانچ بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ ماں کو ایک عدد لڑکی کی خواہش تھی جس کی پاداش میں اس کے دو تجربے ناکام ثابت ہو چکے تھے۔ ببلو کے ہونے کے بعد اس نے اپنی خواہش کا گلا گھونٹ دیا اور ظاہری طور پر اسے لڑکی بنا دیا۔ کان تک چھدوا دیے۔ ایسی خوبصورت فراکیں آتیں کہ لوگ پوچھے بغیر نہ رہ پاتے۔ ''اے بچی کہاں سے خریدی— کتنے کی ملی— وغیرہ وغیرہ—؟''

ببلو جب تھوڑا بڑا ہوا۔ چیزوں کو بہتر طور پر سمجھنے لگا تو پہلا اعتراض فراک پہننے پر کیا مگر اماں کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ انہوں نے تاویل پیش کی کہ ساری زندگی پینٹ شرٹ تو پہننا ہی ہے ابھی فراک بری نہیں لگتی کچھ دن اور پہن لے— میری خاطر— اور وہ پسیج گیا۔

دوستوں میں اس کی الگ ہنسائی ہوتی۔ وہ اسے ببلی کے نام سے پکارتے۔ وہ سب سے لڑ نہیں سکتا تھا البتہ اماں سے شکایتیں ضرور کرتا۔ ماں ان سب کو تنبیہ کرتیں۔ ممتا کے نشے میں چور انہوں نے کبھی کسی

اور پہلو پر غور ہی نہ کیا یا کیا بھی ہو تو منفی پہلو اس طرح سامنے نہ آئے۔

دھیرے دھیرے فراک کے اثرات اس پر مرتب ہونے لگے۔ لڑکوں سے کنارہ کشی کر کے وہ لڑکیوں کے ساتھ رہنے لگا۔ لڑکیوں کو بھی اس کے قرب میں خاص لطف آتا وجہ دونوں کو نہیں معلوم۔ حالاں کہ مذاق یاں بھی اڑایا جاتا پر اسے ناگوار نہیں گزرتا بلکہ اندر کہیں خواہش ہوتی کہ وہ اسے اسی طرح چھیڑتی رہیں۔ گدگدی کا سا احساس ہوتا۔ جب وہ گیارہ بارہ سال کا ہوا بیشتر لڑکیوں نے اپنے والدین کے کہنے پر اس سے ترک تعلق کر لیا۔ حالاں کہ اس نے پتلون پہننا شروع کر دیا تھا پر اسے یقین اب بھی نہ ہوتا۔ لگتا کہ وہ ننگی ٹانگوں کے ساتھ کھڑا ہے۔ گلی محلے اور اسکول میں وہ جہاں کہیں بھی ہوتا لوگوں کی نگاہ کا مرکز رہتا۔ غیر شناسا اشخاص کو بھی نسوانی جھلک بالکل واضح نظر آتی غرضیکہ ہر جگہ تضحیک ہوتی۔ پڑھائی سے بھی من ایک دم اُچاٹ ہو گیا تھا۔ اپنی ذات میں اس قدر سمٹا کہ بالکل تنہا ہو گیا۔

عارف بھائی کی شادی میں وہ واقعہ پیش نہ آتا تو شاید زندگی کا ڈھب کچھ اور ہوتا۔ گھر شادی کے ہنگاموں سے بھرا ہوا تھا۔ اس دن رت جگا تھا۔ ڈھولک کی تھاپ پر عروسی گیت گائے جا رہے تھے۔ ہر طرف مہندی لگے ہاتھ۔ دو تین بجے تک وہ شور غل رہا کہ کسی کو کچھ ہوش نہیں رہا۔ تین بجے کہیں جا کر سونے کا پروگرام بنا۔ ایسی افراتفری میں جب پورا گھر مہمانوں سے بھرا ہو کون کس کی خبر گیری کرتا۔ جسے جہاں جگہ ملی پیر پسار لیے۔ وہ بھی ایک کونے میں جا گھسا۔ بتیاں بند ہو گئیں۔ وہ گھر جو ابھی تھوڑی دیر پہلے شادی کے شادیانوں سے گونج رہا تھا، اب تاریکی اور سکوت اوڑھے محوِ خواب تھا۔ لوگ تھک کر اتنا چور ہو گئے تھے کہ لیٹتے ہی گہری نیند میں سو گئے۔ ابھی آدھا گھنٹہ ہی گزرا ہوگا کہ ببلو کی آنکھ کھل گئی۔ برابر لیٹے ہوئے آدمی نے اس کا پیجامہ اُتار دیا تھا۔ وہ بری طرح گھبرایا ہوا تھا۔ شاید خوف کی وجہ سے اس کی چیخ بھی نکل جاتی۔ اگر اس آدمی نے اس کے منہ پر ہاتھ نہ رکھ دیا ہوتا۔ وہ معاملے کی نزاکت سمجھ پاتا اس سے پہلے وہ اسے بری طرح سے چومنے لگا۔ وہ ڈر کے مارے بری طرح کانپنے لگا۔ جب جب اسے ببلو کے چیخنے کا خدشہ ہوا اس نے ہونٹ ببلو کے ہونٹوں میں پیوست کر دیے۔ احتجاج کا تو اسے موقع ہی نہ ملا۔ جب تک ہوش بحال ہوتے آدمی غائب ہو چکا تھا۔ خوف و ہراس اس پر اب تک طاری تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب سانسوں کا توازن درست ہوا تو خیال آیا کہ اماں کے علاوہ یہ پہلا آدمی تھا جس نے اس کا مذاق نہیں اڑایا بلکہ اماں سے زیادہ پیار کیا گو کہ بدن میں درد بہت ہو رہا تھا۔

پہلی بار دو پاؤں کا گھوڑا وہ اسی رات کو بنا تھا۔ اسے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ آگے ابھی کون سا مرحلہ آنے والا ہے۔ جب کیف و مستی کے لمحات ایک نقطۂ عروج پر منجمد ہو جائیں گے، اس کی تو جان ہی نکل گئی تھی۔ درد و تکلیف کی وجہ سے جھر جھر آنسو بہہ رہے تھے۔ ببلو کو کافی دیر بعد یاد آیا تھا کہ جانے سے قبل ہمت افزائی کے کچھ جملے مڑے تڑے نوٹوں میں لپیٹ کر اس نے اس کے ہاتھ میں پکڑا دیے تھے۔

اس رات کی صبح کبھی نہیں ہوئی۔ آج بھی وہ اسی رات میں جی رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کی شہرت بڑھی۔ جسے دیکھو اسے بلا لیتا۔ حسبِ حیثیت اس کے ہاتھ پر پیسے دھرتا اور چلتا کرتا۔

ببلو نے اس کاروبار شوق سے خاصے پیسے جمع کر لیے تھے۔ ہتک اور بدنامی اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ یہ مشکل ماں باپ کو جھیلنی پڑ رہی تھی۔ اب تو صورتِ حال ناقابل برداشت ہوگئی تھی۔ ببلو کو وہ ہر ہر طرح سے سمجھا بجھا کر ہار چکے تھے۔ وہ کسی کے تھامے نہیں تھما۔ آخرکار باپ نے حکم دیا کہ اگر وہ اپنے رویے نہیں بدل سکتا تو یہ گھر چھوڑ دے، ہم اور بدنامی برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ شاید ایسے ہی کسی حکم کے انتظار میں تھا۔ کسی سے کوئی سوال جواب نہیں۔ خاموشی سے گھر چھوڑ دیا۔ آج اتنے برس گزر جانے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ گھر چھوٹا کہاں ہے بلکہ گھر کے علاوہ سب کچھ چھوٹ گیا ہے۔ زندگی سے ایسا انتقام کب سوچا تھا اس نے۔

بیس سال بمبئی میں کیسے گزرے۔ کہاں کہاں کی ٹھوکریں نہیں کھائیں۔ اسے خوب اچھی طرح معلوم ہے۔ پلا ہاؤس، کماٹھی پورہ میں بھی رہا مگر وہ جگہ زیادہ راس نہیں آئی۔ اپنے پیشے میں وہ انفرادی طور پر زیادہ کامیاب رہا۔ پیسہ حالاں کہ خوب کمایا پر جوڑ نہیں پایا۔ اب بڑھتی عمر کے نامعلوم اندیشے اُسے خوف زدہ کرنے لگے تھے۔ کسے معلوم آگے کیسا وقت آنے والا ہے۔ اس لیے مستقبل کے لیے پیسہ ہاتھ میں رہنا ضروری ہے۔ وقت کی رفتار کا اسے بخوبی اندازہ تھا۔ اسی وجہ سے اس کی تشویش بڑھ رہی تھی۔

شیوخ کے بارے میں وہ عرصے سے سنتا آرہا تھا کہ تین چار بیویوں کے باوجود اغلام بازی کا شوق رکھتے ہیں اور بہت زیادہ رکھتے ہیں۔ اس کے عوض خطیر رقم ادا کرتے ہیں۔ کئی بار ذہن میں وہاں جانے کا خیال آیا مگر سنجیدگی سے نہیں سوچا۔ اگرچہ کئی عرب سے اس کے مراسم تھے۔ وہ جب بھی بمبئی آتے ببلو کو دو پیر کا گھوڑا ضرور بناتے۔ اس زندگی سے وہ بری طرح اوب چکا تھا۔ ہر شعبے میں ہمیشہ سے ہارنے کی عادت ناگواری کی حدوں کو پار کر کے اذیت ناک ہوتی جا رہی تھی۔ کیا وہ کبھی ایک لمحہ کا بھی فاتح نہیں بن پائے گا۔ جیت کبھی حاصل نہ ہوئی ہو پر اس کی لذت سے تو بہرحال وہ واقف تھا۔ اس کے پاس ایک ساعت ایسی نہیں تھی جو جینے کا مقصد عبث ہونے سے روکتی اور تو اور ہرا یرا غیرا نتھو خیرا اسے دُرکارتا پھٹکارتا رہتا۔ غلیظ گالیاں سننے کو ملتیں۔ رنڈی بھڑوں کی زندگی تو ایسی ہی ہوتی ہے۔ وہ ہزار بار خود کو سمجھانے کی کوشش کرتا مگر کہیں ایک کانٹا سا چبھا محسوس ہوتا کبھی وہ زخم بن کر ٹیس دینے لگتا۔

جب آئینہ دیکھتا تو خیال آتا کہ چہرے کی چمک ماند پڑ گئی ہے۔ اب تو نحوست سی پھیلتی جا رہی تھی۔ پہلے جیسے حالات بھی تو نہیں تھے اب۔ بہت سارے نئے لونڈے آگئے تھے۔ اس کی دکان بھی زد میں آئی تھی۔ باہر جانے کا خیال انہیں اسباب سے فروغ پا رہا تھا اور پھر جلد ہی اس نے فیصلہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو اسے عرب جانا ہے۔ دوڑ بھاگ کر پاسپورٹ بنوالیا ہر جگہ اس کے جاننے والے موجود تھے جس کی وجہ سے کوئی

خاص دقت پیش نہیں آئی۔ رشوت کا ایک پیسہ بھی نہیں خرچ کرنا پڑا۔ بابو تو فیس لینے میں بھی تکلف کر رہا تھا۔ شاید اسے کسی نے بتا دیا ہو یا حرکات وسکنات نے چغلی کی ہو مگر وہ خوش تھا کہ اس کا کام بن رہا تھا۔

اب Travel والوں سے رابطہ قائم کرنا تھا۔ بمشکل پندرہ روز گزرے ہوں گے کہ وہ شیخ آ گیا جس کا وہ مستقل گاہک تھا۔ ببلو کو لگا کہ اس کے ستارے گردش سے نکل رہے ہیں۔ شیخ کے سامنے تجویز رکھی تو اس نے فوراً قبول کر لی۔ ایسے لگا کہ یہ آدمی دو طرح سے فائدے مند ہوگا۔ دو پیروں کا گھوڑا تو وہ ہے ہی خچر اور بنا دیا جائے گا۔

رخصت ہوتے وقت اس نے ببلو کو یقین دلایا کہ ایک ہفتے میں وہ ویزا بھیج دے گا۔ جانے سے قبل اس نے اپنے ایجنٹ سے ببلو کا سامنا پھر کروا دیا تھا۔ ایجنٹ نے چپکے سے اتنا ضرور پوچھا تھا کہ وہاں جا کر تم کرو گے کیا؟

''وہی جو یہاں کرتا ہوں۔'' اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا تھا۔ وہ ہونٹوں کی طرح دیر تک ببلو کو دیکھتا رہا تھا۔

عرب کی زمین پر پہنچنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ دس دن کے اندر ویزا آ گیا۔ تمام کاغذی خانہ پوری نمٹا کر وہ جہاز میں بیٹھ گیا۔

وہاں پہنچتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ وہ کہاں کے لیے بنا تھا اور کہاں ضائع ہو رہا تھا۔

چند دنوں ہی میں اجنبیت کا احساس ختم ہو گیا۔ مانوس ہونے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا۔ لحاظ یا تکلف اس کا مسئلہ کبھی رہا ہی نہیں۔ شہرت کے ساتھ خریداروں کا حلقہ بھی بڑھا۔ اپنے ملک میں جتنے پیسے وہ مہینوں میں کماتا تھا یہاں ایک رات میں ملتے بلکہ رات کی بھی کیا قید۔

جلد ہی چہرے پر رونق بھی لوٹ آئی۔ وہ روز دو بار شیو کرتا۔ اس کے کفیل نے بڑا ساتھ دیا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے اس کا شکر ادا کرتا۔ ببلو کے دماغ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ وہ گدھے کا کام بھی اسی سے لیتا ہے۔ وہ تو ایسا مگن ہوا کہ اور باتوں کا اسے کچھ ہوش ہی نہ رہا یا رہا بھی تو اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ جو کچھ وہ دے رہا تھا۔ حاصل اس سے زیادہ کر رہا تھا۔ البتہ شکست کا احساس اکثر و بیشتر اپنی خوفناک صورت دکھا کر اسے ڈرا ہی جاتا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ فتح کا خیال اس کے ساتھ ہی مٹی میں دفن ہو جائے گا۔ کمر جھکائی ہو یا نہ جھکائی ہو مگر ہر شخص کے سامنے نظر تو جھکانی ہی پڑی ہے بھلے ہی سامنے والے کو احساس نہ ہو پایا ہو۔ دلائل و منطق سے وہ دوسروں کو مطمئن کر سکتا ہے اپنے آپ کو نہیں۔

دیکھتے دیکھتے ایک برس گزر گیا۔ اب وہ تھوڑی بہت عربی بولنے اور سمجھنے لگا تھا۔ خاصے پیسے بھی جمع ہو گئے تھے۔ زندگی بہت سکون سے گزر رہی تھی۔ نقدی کے علاوہ ڈھیروں تحائف اس کی مشاقی اور تجربوں

کی نذر کیے جا چکے تھے۔

ایک روز وہ بازار میں گھوم رہا تھا۔ کار میں بیٹھے ایک شیخ نے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ عربی میں جانے کیا آئیں بائیں شائیں بولا اور دروازہ کھول دیا۔ حالانکہ اس وقت اس کا قطعی موڈ نہیں تھا مگر اس پیشے میں موڈ و مرضی کا اتنا دخل کہاں ہوتا ہے۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

دس منٹ کے بعد گاڑی ایک پورنکو میں رکی۔ وہ ببلو کو بڑی محبت کے ساتھ ایک آفس میں لے گیا۔ آفس کے پچھلے حصے میں ایک شاندار بیڈ پڑا ہوا تھا۔ اسے قدرے حیرت ہوئی۔ بستر اپنی کہانی آپ کہہ رہا تھا۔ فریج سے اس نے ڈھیر سارے پھل اور مشروب کے ٹن باہر نکالے۔ ببلو سے کھانے کا اشارہ کر کے وہ باتھ روم میں گھس گیا۔ دو منٹ بعد نہا کر باہر آ گیا۔ بدن پر صرف چڈھی باقی تھی۔ اس نے ببلو سے بھی غسل کرنے کو کہا۔ پہلے تو وہ سمجھ ہی نہ پایا پر اشارے کی زبان آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ ببلو کو لگا یہ آدمی دوسروں سے مختلف ہے۔ ورنہ آج تک کبھی کسی نے نہانے کی تجویز نہیں رکھی۔

ذرا سی دیر میں وہ تازہ دم ہو کر باہر آ گیا۔ شیخ نے بغیر کسی حجاب یا تمہید کے اسے بستر میں آنے کی دعوت دی۔

دس منٹ تک معاملہ بوس و کنار تک سمٹا رہا اور پھر اچانک بالکل غیر متوقع طور پر شیخ اس کے سامنے دو پیروں کا گھوڑا بن گیا۔ حیرت و استعجاب سے وہ شیخ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ عرب میں سب چار پیر کے گھوڑے نہیں ہوتے۔ یہ اُسے آج ہی معلوم ہوا تھا۔

وہ چابک لے کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اس رفتار سے دوڑایا کہ ذرا ہی دیر میں گھوڑا رخش ہو گیا۔ قدرے توقف کے بعد تھک ہار کر جب دونوں ادھر اُدھر گرے تو دم سادھنے میں کچھ دیر لگی۔ دونوں بری طرح ہانپ رہے تھے۔ سانسوں کا زیر و بم جب معمول پر آیا تو شیخ نے پانچ پانچ سو ریال کے دو نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔ ایک بار اس نے ریال کو اور غور سے دیکھا۔ پھر اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ ''اپنی برادری والوں سے میں پیسے نہیں لیتا۔'' شیخ اس کی بات نہیں سمجھ پایا۔

''ایش کلام اِنتا—؟'' اس نے خود ہی سوال کیا۔

"Do you know English" ببلو نے جواب کے عوض سوال داغا۔

"Something... Something"

"I Can't get money from our community"

رُک رُک کر ببلو نے اپنا جملہ پورا کیا۔ پتہ نہیں شیخ سمجھ پایا کہ نہیں ہونق بنا وہ ببلو کو دیکھ ضرور رہا تھا۔ ببلو نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریال میز پر رکھے اور کالر کھڑے کر کے کمرے سے باہر ہو گیا۔

فیڈ آؤٹ فیڈ آن

گھڑیال نے آٹھ بجائے۔ گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ہلکی ہلکی موسیقی فضا میں پھیلنی شروع ہوئی۔ مدھم روشنیاں تیز ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ دن کا دھوکہ ہونے لگا۔ روشنیاں ایک دھماکے کے ساتھ دھیمی ہوگئیں۔ آخری گھنٹی کے ساتھ چنگ کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ مہتابی چھوٹی اور سرخ دبیز مخملی پردہ بڑے ناز و ادا کے ساتھ خراماں خراماں اٹھنا شروع ہوئے۔ ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ (Neon) نیاں لائٹ میں اشتہار جگمگا رہا تھا۔

''آج شب آٹھ بجے امپریل تھیٹر کمپنی کا مشہور و معروف ڈرامہ ''ابھیگیان شکنتلم'' خاص شان و اہتمام اور زرق برق سین سینری کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔ جس میں کمپنی کی مشہور و معروف اداکارہ حنا شکنتلا کا پارٹ کریں گی۔''

پردے کے اٹھنے کے ساتھ ہی سوتر دھار نمودار ہوا۔ سامعین کو جھک جھک کر سات بار سلام کیا پھر بولا۔ ''سنئے جناب ڈرامہ کیا ہے؟ (مدھم آواز میں شادیانے بجنے لگے)''

ڈرامہ کا فن ویدوں کی طرح خدائی دین ہے۔ تصور یہ بھی ہے کہ ڈرامہ نگاری کسی ایسے دور میں ممکن ہی نہیں جب انسانی زندگی آلام و اضطراب سے آگاہ نہ ہوئی ہو۔ عہد سیمیں میں اس فن کی داغ بیل پڑی۔ اسی دور میں جملہ دیوتا ابوالآباء (برہما) کے حضور میں گئے اور اس سے استدعا کی کہ ایک ایسا فن نمودار کریں جس سے سمع و بصر دونوں محفوظ ہوں۔ یہ پانچواں وید ہو مگر سابقہ ویدوں کے برخلاف اس سے مستفید ہونے کا حق دوسری اور ذاتوں کے لوگوں کو بھی حاصل ہو۔

برہما نے تاریخ اور موعظت کو ملا کر اس کی ترتیب دی اور رگ وید سے انشاد، سام وید سے نغمہ، یجر وید سے سوانگ اور اتھروید سے جذبات نگاری کے فنون کو ہم آمیز کیا۔ شو نے تانڈو (رقص) کا اور پاروتی نے لطافت کا اضافہ کیا اور وشنو نے چاروں ڈرامائی اسالاب کا اختراع کیا اور تب وشوکرما کو حکم ملا کہ وہ نگار خانہ کی تشکیل کرے اور آخر میں اسی موضوعی فکر و فن کو بھرت کے حوالے کیا گیا تاکہ وہ زمین پر آکر اسے معروضی رنگ اور روپ میں پیش کرے۔ اس طرح بھرت خدائی فن نامیہ شاستر کا حامل ہوا۔ سوتر دھار نے اپنے لمبے عصا کو چاروں دشاؤں میں گردش دے کر شکنتلا کے اسٹیج پر آنے کا اعلان کیا اور خود پردے میں غروب ہوگیا۔ شکنتلا کے بے پناہ حسن کو دیکھ کر راجا دشینت سمیت تمام تماشا بین رنگ و نور کے بحر بیکراں میں غوطہ زن ہوگئے۔ روشنیوں نے ایسا رنگ بکھیرا کہ فضا نیلگوں سمندر میں تبدیل ہوگئی اور ہلکے گلابی لباس

میں پری کی طرح پر تھرکتی دوشیزہ حنا نے ہوا میں اپنے رقص سے تماشائیوں کو مبہوت کر دیا۔ گرین روم میں مبارک باد دینے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ ان میں وہ جوتے والا بھی تھا جو پرسوں شام کو حنا کو ملا تھا اور آج اس کے ڈرامے کا اشتہار دیکھ کر آیا تھا۔ حنا کو جوتوں سے عشق تھا۔ طرح طرح کے جوتے اس کی ریک میں سجے تھے۔ اونچی ہیل والے، نیچی ہیل والے، آگے سے بند، پیچھے سے کھلے، بلی، سلیپر، سینڈل، فل بوٹ، تسمے والے جوتے، بغیر تسمے والے جوتے، سفید، کالے، قرمزی، سنہرے، روپہلے، لال، ہرے، نیلے، پیلے، فائسی، گلابی، فیروزی، سرمئی، رنگ برنگے...

حنا کسی بھی شخص کو دیکھتی، تو پہلے اس کے جوتے دیکھتی۔ جوتے دیکھ کر اس کی شخصیت کا اندازہ لگاتی۔ حنا کا کہنا تھا کہ مضبوط جوتے پہنے ہوئے شخص مضبوط کردار کا ہوتا ہے۔ پھٹے گندے جوتے پہننے والا شخص لاپرواہ اور کمزور ہوتا ہے۔ سلیپر گھسیٹتی عورتیں بددماغ ہوتی ہیں۔ ہائی ہیل والی نقشے باز اور کم ہیل والی خوش مزاج، گم بوٹ پہننے والے زندگی میں تیز رفتاری پسند کرتے ہیں اور اکثر کامیاب رہتے ہیں۔ عید، بقرعید پر ملنے والی عیدی کے پیسے یا موقع بہ موقع ملنے والے پیسے جوڑ کر حنا ہمیشہ کے لیے جوتے خریدتی تھی۔ امی لاکھ کہتیں کہ ڈھنگ کا سوٹ خرید لیا کرو، یا کچھ اور لے لو، لیکن حنا کی ضد تھی جوتے۔

حنا کانپور کے بازار میں:

اس شام بھی حنا جوتوں کے شوکیس پر جھکی بڑی حسرت و اشتیاق سے سنہری سینڈل کو نہار رہی تھی۔ اس نے کالج آتے جاتے ان خوبصورت نازک چمکتی سینڈلوں کو ہزار بار دیکھا تھا اور دل مسوس کر رہ گئی تھی۔ ان کی قیمت کا اندازہ اس مہنگی دوکان کے باہر سے ہو رہا تھا۔ اس کے مہینے بھر کے ٹیوشن کے پیسے بھی کم ہی تھے... 'Yes Please' دوکان کے اندر سے ایک خوبصورت گورے پُروقار جوان نے باہر نکل کر اس سے پوچھا۔

''یہ سینڈل...'' وہ ہڑبڑا گئی۔

''کون سی؟ سنہری سینڈریلا سینڈل؟'' وہ مسکرایا۔

حنا کی نظر اس کے سیاہ چمک دار جوتوں پر پڑی۔ یقیناً امیر ہوگا۔ اب بھئی جوتوں کی اتنی بڑی دوکان ہے وہ بھی اتنے شاندار بازار میں تو... کردار درست ہوگا۔ مضبوط جوتے ہیں اس لیے...

''کیا ہوا محترمہ؟'' وہ پھر مسکرایا۔

''جی... میرا مطلب...''

''اندر تشریف لے آیئے...''

''نہیں ابھی میں پرس بھول آئی ہوں گھر پر...'' اس نے گھبراہٹ میں اپنا ننھا منا سا خالی پرس مٹھی میں دبوچ لیا۔

اس کی نظر اس کے شفاف کنول جیسے معصوم کبوتر سے ہاتھوں پر پڑی۔

''اندر آ کر اپنا سائز تو دیکھ لیجئے۔ پیسوں کی کوئی بات نہیں پھر آ جائیں گے۔''

''نہیں'' اس کی صراحی دار گردن خودداری کے زعم میں خم ہوگئی۔ اس نے شوکیس کھلوا کر سینڈل نکلوا کر اس کے نازک قدموں کے قریب رکھ دیں۔ گہری نیلی شلوار کے پائنچے میں سے برہنہ سڈول ترشے ہوئے سنگ مرمر کے پاؤں باہر نکلے جن میں بیل بیوٹی کی طرح عقیق یمنی کے ناخون جگمگا رہے تھے۔ سینڈریلا کی جوتی بالکل صحیح فٹ ہوئی۔

''قیمت؟'' اس نے آواز دبا کر پوچھا۔

''آپ کے لیے ہی یہ سینڈل بنی ہے محترمہ۔ قیمت صرف پچاس روپے۔''

وہ حیرت زدہ تھی۔ ہرنی کی طرح گھبرائی سی۔ پسینہ اس کی پیشانی پر موتی بکھیر رہا تھا۔

دل میں دعا مانگی یا اللہ عزت رکھ لے۔ پرس کھول کر جو ڑا کل پچاس روپے ہی نکلے۔ سنہری رتھ رتھ پر بیٹھ کر حنا اڑ چلی۔

''ابھی گیان شکنتلم'' کا شو دیکھنے کے بعد اگلے ہی ہفتے پیغام آ گیا۔

ساتھ ہی ایک درجن قیمتی جوتے بھی۔

امّی نے کالج سے آتے ہی بلائیں لیں۔

''مبارک ہو حنا...''

''کس بات کے لیے امی؟'' حنا حیران نہ عید نہ بقرعید نا سالگرہ...

یہ اچانک ویران گھر میں مبارک باد کا کیا تک؟

''میری مشکل آسان ہوگئی حنا'' امی کی آواز گیلی ہوگئی۔

اللہ نے سن لی مولا نے مشکل آسان کردی بیٹا...''

''امی... میری جان امی... کیا ہوا'' وہ ڈر کر لپٹ گئی۔ امی بری طرح کانپ رہی تھیں۔ ''کاش آج تمہارے ابو ہوتے تو...''

اس کی نظر شکستہ دالان میں ایک لائن سے رکھے تقریباً ایک درجن جوتوں کے ڈبوں پر پڑی۔

''یہ کیا امّی بازار اٹھا لائیں؟'' وہ ہنس پڑی۔

''نہیں حنا! بازار گھر میں آ گیا۔''

''کیا مطلب؟''

امی نے اپنی مجبوری اور جوتا کمپنی کے مالک کے آئے رشتے کی بات بڑی خاموشی سے کہہ ڈالی۔ حنا کا بزنس کلاس میں جانا کسی کو اچھا نہیں لگا۔ حنا ڈرامے کا درخشاں ستارہ تھی۔ لاکھوں چاہنے والے تھے۔ دوست تھے۔ پورا ایک الگ معاشرہ تھا۔ Intellecltuals کا حلقہ تھا۔ حنا خود اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بے حد

ذہین لڑکی تھی۔ لیکن... حنا کی آواز حلق میں گھٹ گئی اور نکاح کے چھوہارے بٹ گئے۔ امی کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ حنا کا بڑھ گیا۔ امی خوش تھیں۔ حنا خاموش۔ پھولوں والی رات تھی۔ ہر طرف پھول ہی پھول تھے۔ یکا یک اسے ایک تیز بو کا احساس ہوا۔ اس نے اِدھر اُدھر اٹھ کر دیکھا... کوئی بدبودار شے بری طرح مہک رہی تھی... تمام پھولوں کی خوشبو اس کے آگے ہیچ پڑ گئی تھی۔ کمرے میں کوئی چیز ایسی نہیں نظر آئی جس سے بو آرہی ہو۔ بستر پر بیٹھتے ہی اس بو کے بھبکے نے زور پکڑا۔

تب اسے یقین آیا کہ بستر پر پڑے جسم سے ہی چمڑے کی تیز گندھ (؟) آرہی ہے۔

طارق ۶ فٹ ۹ انچ کا کیم شحیم مرد۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن ایسا ہو چکا تھا۔

پہلے وہ واضح طور پر بات سمجھ نہیں پائی اور جب سمجھ میں آئی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس کے دوستوں نے جو تمام باتیں بتائی تھیں بے بنیاد نکلیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس کی بے پناہ خوبصورتی بیکار ثابت ہوئی۔ بستر پر صرف کانٹے تھے اور وہ بھی تنہا... وہ زندگی کا سب سے بڑا جوا ہار گئی تھی۔ چودہ طبق روشن ہوگئے تھے۔ اس کا کیمسٹری لیب میں رکھا فلاسک اچانک ٹوٹ گیا تھا۔ تیز گرم سیال اس کو آبلہ پا کر گیا تھا۔ روح تک میں چھالے ابھر آئے تھے... تمام رات وہ خراٹے مار کر سوتا رہا۔ وہ پھولوں کی آگ میں جھلستی رہی...

دن بھر وہ طرح طرح کی دوائیاں کھاتا۔ ہر پیتھی کو آزماتا۔ ہمیوپیتھی، ایلوپیتھی، نیچر پیتھی، یونانی، آیورویدک ریکی، اکیوپریشر...

لیکن بے کار۔ بے مقصد۔ اس کے جسم سے ناقابل بو آتی۔ رات میں اس کے کمرے میں ۱۱-۱۲ کے بعد ہی آتا۔ اپنی اماں کے پہلو میں چپک کر بیٹھا رہتا یا ٹی۔ وی دیکھتا رہتا۔ اس کو پاکیزگی قناعت پسندی، صبر جمیل اور نیک چلنی کے موضوع پر لیکچر دیتا رہتا، دنیاوی خواہشات کی ہوس دل سے نکال دینا چاہیے کہتا۔

ہر رات وہ ایک پل صراط سے گزرتی۔ حنا کا حسن ہی اس کے لیے اہیشاپ بن گیا تھا۔

ماہر نفسیات کا کہنا تھا اس کی ارج (Vrge) ختم ہو چکی ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ طارق کا کہنا تھا کہ وہ حنا کے بے پناہ حسن کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔ سرد ہو جاتا ہے۔ اس کے شملوں سے ڈر جاتا ہے۔ ہاتھ لگاتے ڈرتا ہے کہ کہیں میلی نہ ہو جائے۔

ہر جمعرات اپنی نظر اتر واتا، جھڑ واتا، جنات، تعویز، گنڈے پر طارق کو بے حد اعتقاد تھا۔

حنا ان تمام چیزوں کو ضعیف الاعتقادی سمجھتی تھی۔

نظر اُتار کر پھٹکری جب آگ میں ڈالی جاتی تو پھٹکری پگھل کر طرح طرح کی شکلیں اختیار کر لیتی۔ طارق ان شکلوں میں کبھی اپنے پڑوسی کی شکل تلاش لیتا تو کبھی کسی جوتا بازار کے شخص کی کبھی کسی رشتہ دار عورت کی اور پھر اس کے پیچھے ماں بیٹے دونوں مل کر پڑ جاتے۔

وہ وقت کھانے کا شوقین۔ شاید وہ اپنی کمی کو اس طرح پوری کرتا تھا۔ صبح سے لے کر رات تک اس کو

کھانے کی ہی فکر رہتی۔ ناشتے میں کیا پکا ہے؟ بالائی نہیں ہے تو بازار سے منگاؤ۔ دوپہر کا کھانا؟ سہ پہر کی چائے۔ رات کا کھانا... طارق نے کمپیوٹر میں ہنی مون' فائل کھول رکھی تھی۔ اس کو پتا ہی نہیں تھا۔ کیوں کہ وہ لوگ تو ہنی مون' کے نام پر دو دن کے لیے کانپور سے لکھنؤ گئے تھے۔ طارق کی خالہ زاد بہن آئی تھی۔ اس نے کمپیوٹر کھول کر دیکھا ''آپ لوگ منالی گئے تھے ہنی مون پر؟''

وہ ہکا بکا گم بوٹ میں نوٹ بھرے رہتے۔ جتنا چاہے خرچ کرو...

حنا کو لگتا جوتے پیروں سے چل کر ذہن تک آ گئے ہیں اور تڑا تڑ پڑ رہے ہیں۔

روپے کی ریل پیل۔ بڑھیا کھانا۔ رہنے کو حویلی... زندہ رہنے کے لیے اور کیا چاہیے... واقعی کیا چاہیے... حنا کو اپنی گلی میں بسا شکستہ بدرنگ چھوٹا سا گھر بے حد یاد آتا۔ جس کے کچے آنگن میں جوہی کی بیل تھی اور گرمی میں رات کی رانی مہکتی تھی...

اس کی سسرال کا آبائی مکان اتر پردیش کے ایک بچھڑے دیہات میں تھا۔

با اقتدار سادات گھرانا:

محرم کرنے وہ لوگ وہاں پہنچے۔ مجلس ماتم کا زور... شور... تعزیہ، علم ضریح، گہوارہ، جھاڑ فانوس... فرشِ عزا... سفید براق چاندی... موی شمعیں بجھی ہوئی... لوبان کا دھواں... اگر کی مہک... دل گیلا... گیلا... شب بیداری... پرسوز مدھم آواز میں مرثیہ پڑھا جا رہا تھا...

''اے رات نہ ڈھلنا کہ اجڑ جائے گی زینب...''

مرثیے کی آواز دل میں اترتی جا رہی تھی...

''اے لڑکی... اے لڑکی... سن... یہ دریا والی مسجد کا علم ہے۔ معجزہ کا علم... منت کا دھاگا باندھ... تو صاحب اولاد ہوگی۔ گود ہری بھری رہے گی... مانگ لو کہ مولا لڑکا ہو تو 'قاصدِ صحرا' بناؤں گی۔ (چھم... چھم... چھم... پائل ناچنے لگے... یا علی... کے بلند نعرے...)

آگ کا ماتم کراؤں گی... یا مشکل کشا مشکل آسان کرے۔

''مانگ لو نا...''

''یہ کیا منحس بیٹھی ہو دولہن؟''

دیہاتی بنجارن دوہے گا رہی ہے رو رو کر...

''اسگر... اسگر مت گہراؤ۔

راج کنور مورے سوئت ہیں۔

پنکھ پکھیرو گل نہ مچاؤ۔

امام باڑے کا صحن سیاہ و سفید عماموں سے بھر گیا۔ فاتحہ ہو گیا۔ ذوالجناح زنان خانے میں لایا گیا۔

عقیدت مند عورتیں ملیدے کا تھال لے کر دوڑیں... زبردستی اسے دیسی گھی، پوریوں و میوہ سے ملیدہ ٹھساتی رہیں۔ وہ بے چین ہوتا رہا... زیوروں کے بوجھ تلے اس کی پچھلی ٹانگیں کمزور پڑ گئیں۔ اس کے منہ سے نکلنے لگا... جھاگ کے ساتھ گرے ہوئے ملیدے کے ٹکڑے کچی مٹی میں سن گئے۔ زبردستی یہ ٹکڑے اس کے منہ میں ٹھونس دیئے گئے۔

یکا یک اسے ایک تیز ابکائی آئی اور صحن کے کچے فرش پر اندر کا سب باہر آ گیا۔

ایک زوردار نعرہ صلوات بلند ہوا اور چپکے سے کسی نے حنا کو مبارک باد دے ڈالی۔ ''مبارک باشد''

پاس کھڑی خلیہ اس نے گھورا ''ایام عزا میں مبارک باد نہیں دیتے۔ کافرہ ہوگئی کیا بی بی؟''

خبر جنگل کی آگ کی طرح دیہات میں پھیل گئی...

''کمینی... دھوکے باز، فاحشہ، منحوس، مکار، مشاطہ... بدچلن... بدذات... دغاباز... بدکار...''

رات میں دیسی اتر پردیش کے مرد نے اپنی مردانگی دکھائی۔ چمڑے کی مضبوط بیلٹ اُتار کر اس کے صندلی نرم و نازک جسم پر ہزاروں نشان ڈال دیئے۔

'I hate you' وہ زیرلب بدبداتی رہی۔

باہر ماتمی انجمنیں زنجیر و ماتم کر رہی تھیں۔ ان کے شور میں بیلٹ کی آواز ڈوب گئی۔

پھر یہ سلسلہ روز و شب ہوگیا۔ وہ اسے طرح طرح سے ایذا پہنچاتا۔ روز ہی دھوبی پاٹ لگاتا۔ اس کی پیٹھ نیلی پڑ چکی تھی۔ اس ڈر سے کہ کوئی جان نہ لے۔ وہ گردن تک اونچے اور کمر سے کافی نیچے ناف تک بلاوز سلوانے لگی۔ ہر رات مغلظات کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

ہر رات اس کی روح کی Tawning ہوگی۔ Nailing ہوگی... طارق کی چمڑا فیکٹری میں وہ چمڑا بننے کا پورا کھیل دیکھ چکی تھی۔ کھال کو پہلے نمک کے پانی میں ڈالا جاتا۔ اس کے بال اور کھال کی اوپری سطح پٹا کر پھر اسے تیزاب میں ڈالا جاتا۔ اس کی Tawning کی جاتی۔ اسے سکھا کر پھر اس کی Nailing کی جاتی۔ کھال کو کھینچ کھینچ کر کیلوں سے جڑا جاتا۔ صلیب پر ٹانگا جاتا۔ پھر جس رنگ میں چاہیں چمڑے کو رنگ لیتے۔ یہی سب اس کے ساتھ بھی تو ہو رہا تھا... لیکن اس پر کوئی رنگ چڑھ ہی نہیں رہا تھا۔

بعض اوقات وہ حنا سے کوئی مختصر سا سوال کرتا اور اس کی آواز انتہائی سخت عجب اور کچھ وحشیانہ سی ہوتی جس سے اس کا جسم لرز اٹھتا۔ وہ تشدد کے نئے نئے طریقے ڈھونڈ لیتا۔ اس کی حلق میں ہاتھ ڈال کر تالو میں اپنے گندے ناخون گڑا دیتا۔ کبھی سر دروازے یا دیوار میں ٹکرا دیتا۔ لہولہان جسم۔ نیل پڑا جسم...

اب مار کھانا اس کی عادت بن چکی تھی۔ روز روز ڈسپنسری جانے کی زحمت سے بچنے کے لیے اور ڈاکٹر کے طرح طرح کے سوالات سے بھی بچنے کے لیے اس نے خود ہی اسپرٹ کی بڑی شیشی اور روئی کا بڑا بنڈل خرید لیا۔ اب وہ اپنی مرہم پٹی خود ہی کرنے لگی۔ لیکن اسے اب اپنی جسمانی کمزوری کا احساس بڑی شدت سے ہونے لگا تھا۔ جسمانی اذیت... روحانی اذیت...

اسے یقین تھا کہ اللہ اب اور دکھ نہیں دے گا۔ لیکن اللہ اپنے نیک بندوں کا خوب امتحان لیتا ہے اور وہ تا زندگی امتحان پر امتحان دیتی ہی چلی جا رہی تھی۔ رزلٹ میں صرف صفر در صفر ہی آ رہا تھا۔

بلکہ اب جس رات وہ نہ مارتا وہ جاگتی رہتی۔ اس کو خارش سی ہوتی... اس کو تشدد میں لذت آنے لگی۔ ایک عجیب سا لطف... شروع میں وہ روتی تھی پھوٹ پھوٹ کر... اپنی قسمت کو کوستی... اپنے کو بچاتی... پھر وہ پٹنے لگی اور ہنسنے لگی... اس کو لطف آنے لگا... وہ مارتے مارتے تھک جاتا۔ وہ نہ تھکتی۔

''بنجر مرد مار ہی تو سکتا ہے...'' وہ ہنس پڑی وہ مارتے مارتے ٹوٹ گیا۔

حنا کو پتہ چل چکا تھا کہ مذہبی انتہا پسند منطقی دلائل اور مباحث سے ہمیشہ خوف زدہ رہتے ہیں اور اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے تشدد میں پناہ حاصل کرتے ہیں۔

شادی کا ڈھول گلے میں پڑا تھا۔

اس کو جب چاہے بجالو... بھنالو...

اصل میں کہیں کچھ بھی نہیں تھا... فلاپ شو ... فلاپ شو... نہ راحت... نہ وصال... سب جھوٹ... کوئی تحفظ نہیں تھا... کوئی مکان نہیں تھا... کوئی جذباتی لگاؤ نہیں تھا...

صرف ڈیوٹی تھی... ڈیوٹی تھی... فرض تھا وہی نبھانا تھا... وہی نبھا رہی تھی...

بھرا پُرا گھر تھا... ذمہ داریاں تھیں... جو اس پر مسلط تھیں... بس محبت نہیں تھی باقی سب تھا... پورا خاندان انتہائی قدامت پسند لیکن ذہنی طور پر مفلس۔ جاہلانہ رسومات کی پابندی تھی۔ عجب حالت تھی اس کی۔ گھر میں نا تو کوئی کتاب تھی نا ہی میگزین لائی جاتی تھیں۔ جو کتابیں وہ خود خرید کر لاتی وہ ہٹا دی جاتیں۔

''شریف زادیاں کتابیں نہیں پڑھا کرتیں۔''

یہ اکیسویں صدی کا انت تھا... اور جہالت کا کوئی علاج نہیں تھا۔

اس کی سسرال میں عورتیں سوئٹر بنتی تھیں یا گل بوٹے چادروں پر کاڑھتی۔ کھانا پکاتیں۔ وہ آسمان کے رنگ گنتی رہتی...

''بہو کو بلندی سے اُتارو۔ اس پر کسی کا سایہ ہے۔''

ساس ماں فرماتیں۔ ''تبھی بولتی نہیں چپ رہتی ہے۔''

حنا کے بال ریشم کی طرح چکنے تھے۔ کسی بندھن میں نہ بندھتے۔ اس کی روح کی طرح آزاد۔ تمام ربر بند کھل جائے۔ جوڑے کے ہیئر پن گر جاتے بال کھل جاتے۔ طارق زمین پر گرے ہوئے پن اٹھا اٹھا کر اکثر دے دیتے۔ اک دو بار سب کے کہنے پر فلم دکھانے بھی لے گئے۔ حالانکہ لے جانا نہیں چاہتے تھے۔ اس دن حنا کی ساس نے خاکہ مہندی لگوائی تھی۔ اس سے دماغ ٹھنڈا رہتا ہے۔ مہندی رچ جائے۔ اس لیے پانی نہیں لگنا تھا۔ پیاس لگنے پر طارق نے پکچر ہال کے باہر لگے نل سے ہاتھ کا چلو بنا کر پانی پلایا۔

حنا کو لگا چلو یہی سہی۔ کم از کم کچھ تو ہے زندگی میں... کوئی یاد... ایک اچھے لمحہ کی یادگار یاد...

بس... لیکن رات میں جب وہ روز پیٹھ موڑ کر لیٹ جاتا تو اس کا خون کھولنے لگتا۔ وہ رات میں ۲-۲ بجے اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے جاڑوں میں نہا لیتی۔ ساس کہتیں ''دیر رات میں حمام سے نہانے کی آواز آرہی تھیں۔ بہو، غوطے طہارت کی پابند ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔''

اکثر طارق اپنا منہ شرم سے اس کے پلو میں چھپا لیتا۔ عرق ندامت میں شرابور ہو جاتا... ہاتھ پیر ڈھیلے ہو جاتے... بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتا مجھے چھوڑ کر مت جانا مری رس بھری...

وہ اس کے ستار کے تار کس دیتا۔ جب ستار تیار ہو جاتا کہ اس پر راگ گایا جائے تو وہ باتھ روم میں گھس جاتا اور دروازہ اندر سے بند کر لیتا۔ لاکھ کھٹکھٹانے پر بھی نہ نکلتا۔ گھنٹوں بعد نکلتا پھر راکھ میں چنگاری تلاش کرتا۔ وہ اپنی ہی آگ کے شعلوں میں نہا جاتی۔ جل جاتی۔ بال نوچ ڈالتی۔ چوڑیاں توڑ کر اپنے ہونٹ چبا جاتی۔ اک عجب سا بخار۔ بدن کو توڑ دینے والا۔ تمام نسوں اور رگوں میں گرم گرم سیال دوڑتا۔

آنکھوں کو کھولنا مشکل... گرم گرم سلاخیں سی جھجھین وجود سے لپٹیں نکلتیں۔

تکلیف سے اک اک ریشہ ٹوٹتا پھوٹتا... درد... عجیب سا لطف... پھواری اور بوچھاری... گرم اور ٹھنڈی، پوری ہولیکا جلتی... ہولیکا ردھن... چٹکتی... چنگاریاں... انگارے... شعلے... راکھ... دیوالی کے پٹاخے پھٹتے... لہسن دیواروں پر مارے جاتے... پھل جھڑیاں... چکر گھنیاں... سب ناچ رہے... راکٹ ہوا میں چھوڑے جاتے... وہ کبھی آسمان پر موتی کبھی زمین پر... بجلی کے تار... تیز کرنٹ کی جھنجھناہٹ... درد کی تیز لہر... اور پھر سب کچھ شانت... وہ گوشت کا سفید لوندا بن کر بستر پر پڑا رہتا۔ حنا کا جی چاہتا ایک زوردار کک مار کر اس کو اپنے بیڈ روم سے باہر کر دے۔ تھوک دے اس پر۔ مارے نفرت کے اسے قے آنے لگتی۔ خارش زدہ کتا... کمزور... للجا... بدصورت مرد...

سینڈل پہنتے وقت اچانک اسے اُسی تیز ناقابل بیان بو کا احساس ہوا۔ اسے اپنی ہی سینڈل سے کراہیت آنے لگی۔ جھٹک کر اس نے سینڈل دور پھینک دیئے۔

ننگے پاؤں... فرش پر قدم رکھا... پھر کمرے کا دروازہ کھول کر لان میں اتر گئی۔ نرم شبنم میں ڈوبی دوب میں پاؤں جو پڑے تو لگا روح تک معطر ہو گئی...

کمرے میں آکر وہ دیر تک ننگے پاؤں ہی گھومتی رہی۔

امی آ گئیں۔

''کیسی ہو بیٹی؟''

''ٹھیک ہوں۔''

''یا اللہ... یہ ننگے پاؤں کیوں گھوم رہی ہو؟''

''چپلوں سے بو آ رہی ہے امی'' اس نے لاپرواہی سے کہا۔

امی تشویش سے اُسے دیکھتی رہیں۔

''امی کیا لمبے بال منحوس ہوتے ہیں؟'' اسی نے اپنے پشت پر پھیلے سیاہ بالوں سے پانی پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''حنا... تم کیسی باتیں کرنے لگی ہو بیٹی... قنوطی ہوتی جارہی ہو... شادی کے بعد تو لڑکیاں گلاب سی کھل جاتی ہیں... تم مرجھارہی ہو؟ کیوں... چمپئی رنگ مٹی کے رنگ سی ہورہی ہے... امی تو... وہ وہاں رہنے آئی...

ستارہ شناس اسے دیکھ کر مسکرادیا۔

''ذہین لڑکیوں کی خانہ آبادی مشکل سے ہوتی ہے...''

''لیکن کیوں؟'' امی نے برقعے کا کنارہ منہ میں دبا کر سسکی لی۔

''زوال کا پرندہ مسلسل اور مستقل اس کے سر کا طواف کررہا ہے...''

زائچہ میں قمر اور مشتری دونوں مائل بہ زوال ہیں۔ یہ اس کے تاریک دن ہیں۔ روشن دن شروع ہونے میں...

اس پر غنودگی طاری ہوگئی۔

لوبان کی خوشبو۔ ستارہ شناس کی آواز میں گھل مل گئی۔ یونان کی شہزادی۔ فصیل شب... طوفان نوح... کشتی رواں دواں ہے... زنجیر ٹوٹ رہی ہے... کالی آندھی... سیاہ شب... تاریک راستے...

تھا... تھا... تھا... ستارہ شناس کی آنکھیں آسماں کی طرف اٹھ گئیں۔ گہرے نیلے آسمان پر ایک سیاہ ننھا سا پرندہ کافی بلندی پر پرواز کررہا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ اچانک پرندہ تیزی سے اڑا۔ ایک چیل نے اُسے دھر دبوچا۔ زخمی پرندہ ستارہ شناس کے سامنے آگرا۔ ستارہ شناس نے اپنا سیاہ لبادہ سنبھالا اور جھک کر زخمی پرندے کو اٹھانے لگا... لبادہ کی ایک جیب سے اس نے ہارسنگھار کے تازہ مہکتے ہوئے نارنجی پھول نکال کر حنا کی مٹھی میں بند کردیئے...

مکاں کی کال بل دیر تک بجتی رہی۔

پھر شاید کسی نے دروازہ کھولا...

''شیلی تم؟'' شیلی اس کے گلے لگ چکی تھی۔

مارے خوف اور شرمندگی کے حنا نے آنکھ موند لیں۔

اس کی پشت سے ساڑی کا پلو سرک کر نیچے گر چکا تھا۔ پوری پیٹھ نیلی تھی۔

شیلی ساکت کھڑی رہی۔ پتھر کے بت کی طرح حنا سوال سے ڈرتی تھی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ''حنا میں حقوق نسواں کے لیے گذشتہ دس بارہ سالوں سے فعال ہوں۔ خواتین کے مسائل پر پر ویکلی کالم لکھتی رہی ہوں جو بے حد مفید سمجھے جاتے ہیں مقبول ہوئے ہیں۔

میں اپنے بارے میں یقیناً مبالغہ سے کام نہیں لے رہی ہوں۔

تم سندھی ادب کے کسی بھی قاری سے تصدیق کر سکتی ہو...''

''میں جانتی ہوں۔''

''جانتی ہو... لیکن مانتی نہیں... مظالم پر خاموش رہنا بھی...''

''میں اپنی تمام کشتیاں جلا چکی ہوں...''

''میں بھی انتہائی قسم کی انتشار ذہن کا شکار رہی ہوں۔ سترہ سال کی عمر میں جب انٹر کا رزلٹ لے کر گھر آئی کہ ابا دیکھئے میں کلاس میں اوّل آئی ہوں۔''

تو مجھ پر پردہ واجب ہو چکا تھا، اسی شام میرا نکاح ایک ۴۵ سال کے عاشق رئیس سے کر دیا گیا۔

بیس سال کی عمر میں میں دو معصوم بچیوں کی ماں تھی اور اکیسواں سال لگنے سے پہلے ہی میرے شوہر نے مجھے لڑکیاں پیدا کرنے کے جرم میں طلاق نامہ پکڑا دیا۔ میری ہی کم سن بھتیجی سے ان کا نکاح ہو گیا... میں نے عدالت کا دروازہ چھوا۔ مجھے سنگین نتائج کی دھمکیاں دی گئیں...

''لو شیلی شربت پی لو... اب تم تھک گئی ہو...''

''نہیں... میں تھکی نہیں ہوں... ہاں راجا دشنت نے تم کو یاد کیا ہے'' اس نے شربت کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔''

''کون راجا دشنیت؟''

''بھول گئی؟''

''اوں...''

''ارے روہت کمار...''

روہت کمار کی سیاہ گہری کالی گھنی پلکیں اوپر اٹھیں۔ وہ طنزیہ مسکرا رہا تھا...

ساس اس کو دیکھتے ہی جھلا گئیں۔

''دلہن تم نے پھر سارے زیور اُتار دیئے... جھاڑ جھنکاڑ بن گئیں۔ اللہ نے اتنا دیا ہے... اوڑھا پہنا کرو... یہ بدشگونی نہ کیا کرو... میرا لال سلامت رہے... تمہارا سہاگ سلامت رہے... یہ فیشن نے دماغ خراب کر دیا ہے تمہارا...''

ایک فریم میں سے تصویر نکل کر اچانک دوسری جڑ گئیں...

''پھولوں کو زیور پہنے کبھی دیکھا ہے؟''

روہت کا زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

ریہلسل کرتے ہوئے تمام فنکار پلٹ کر اس کو دیکھنے لگے۔ وہ سین کے لیے زیوروں سے سجائی جا رہی تھی۔ جھلا پڑی تھی۔ گرجتا چمکتا بھادوں برس رہا تھا لگاتار... سلسلے وار بارش...

''آج فائنل ریہلسل ہے کیسے جاؤں گی؟''

وہ بار بار کھڑکی کا پردہ اٹھا کر باہر دیکھتی۔ تیز بارش سے پانی گھر کے احاطے میں بھر گیا تھا۔
سونے احاطے میں موٹر سائیکل کا شور گونجا۔ بھیگا ہوا روہت گنگناتے ہوئے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹا رہا تھا۔

''کالی گھوڑی دوارے کھڑی...''

''ارے واہ... اندر آؤ روہت'' امی نے بھیگے ہوئے روہت کو اندر بلا لیا۔

''اتنی بارش میں...؟''

''میں تو خادم ہوں۔ ڈائرکٹر صاحب کا حکم نامہ صبح صبح ملا کہ نیلم پری کو تختِ طاؤس پر بٹھا کر لے آؤ تو جناب ہم حاضر ہو گئے...''

اس کو دیکھتے ہی ڈائرکٹر عثمان عاف نے حیرت کا اظہار کیا۔

''تم اتنی بارش میں کیسے آئیں؟''

روہت نے اس کی طرف دیکھ کر لبوں پر شرارت سے انگلی رکھ لی۔

کسی شخص کو نہ بھی یاد کرنا چاہو تو بھی وہ کیوں بے طرح یاد آجاتا ہے...؟

وہ چپ چاپ اوبرائے کانٹینٹل کی آخری میز پر طارق کے ساتھ بیٹھی فش سیزلر کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے اپنا سر میز پر اتنا جھکا لیا تھا کہ طارق اس کی طرف دیکھ نہ سکے اور اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔ اس نے شمع کا رخ طارق کی طرف کر دیا اور چینی کے گل دان میں سجے گل دستے کو اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ تاکہ طارق اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے اور اس کی آنکھوں کے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر پلیٹ میں گرنے لگے...

آج ان کی شادی کی دوسری سالگرہ تھی اور طارق اپنے دوستوں کے حکم کے مطابق اس کو ہوٹل میں ڈنر کھلانے لائے تھے۔ دھول بادلوں اور دھند سے گزرتا ہوا اس کا ذہن ایک دم سے کالج کی دیوار سے نیچے اترا اور چرمرا کر کھانے لگا۔ سفید، سفید لیا، سرخ مونگ پھلی کے دانے، بیسن کے زرد ستو... پیاز کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، چٹ پٹا مسالہ، نمک، نیبو، ہری دھنیا اور کتری ہری مرچ کی ترشی...

کھانے آنتوں کے ساتھ گھل مل گئی۔

ڈرامے کی ریہلسل کے وقفہ میں اکثر روہت چُرمرا لے آتا۔ اس فائیو اسٹار ہوٹل کی ڈش سے اچھا مزا چُرمرے کا تھا... یا ذائقہ اس چُرمرے کا نہیں بلکہ اس لمحے کا تھا جو ان کی زندگی سے رخصت ہو چکا تھا۔

''تم نے تو کبھی فائیو اسٹار ہوٹل دیکھا نہیں ہوگا؟'' طارق کے لہجے میں حقارت تھی۔

اس نے خاموشی سے سر جھکا کر چاندی کے بول میں نیم گنگنے پانی میں پڑے نیبو کے ٹکڑے سے ہاتھ صاف کرنے شروع کر دیئے۔

''ہیلو...''

''ہیلو... حنا؟''

''جی سر... آپ نے میری آواز کیسے پہچان لی؟''

''تمہاری آواز بھی کوئی بھول سکتا ہے۔تم ہمیں بھول گئیں... اپنے ساتھیوں کو بھول گئیں... لیکن ہم تمہاری سحر انگیز... سماعتوں میں مٹھاس گھولنے والی آواز نہ بھول سکے...''

''سر میں نہ آپ کو بھول سکی نہ اپنے ساتھیوں کو... بس حالات...''

''میں جانتا ہوں...''

''آپ جانتے ہیں...؟ کیا...؟''

''یہی کہ تم کو اسٹیج بار بار بلا رہا ہے... تالیاں تمہاری منتظر ہیں۔

''سر اب تو میری جگہ کوئی دوسرا...''

''حنا تم بھول گئیں کسی کی جگہ کوئی نہیں لیتا سب کی اپنی اپنی جگہ ہوتی ہے...''

''کیا میں اب بھی آسکتی ہوں...؟''

''حنا! صراط مستقیم پر چلنے کے لیے ایسے گروہ کی ضرورت ہے جس کے ارکان ہم خیال ہوں۔ہم خیالی تحریک کو مربوط رکھتی ہے اور صحیح سمت میں لے چلتی ہے۔

ہم لوگ اگلے ماہ سنسکرت ناٹیکہ ''مرچھ کٹیکم'' فنِ لینڈ لے جا رہے ہیں۔''

''اچھا۔''

اس نے اپنے سفری بیگ میں دو نیلے کھدر کے کرتے اور سفید شلوار رکھی۔اپنی چند کتابیں وہ ڈائری کیمنی... امی کی یاد برچھی کی طرح جگر میں اتر گئی...

''ہم جا رہے ہیں۔''

''گم بوٹ میں مال ہے لے لو...''

''نہیں...''

''کب لوٹو گی؟'' آواز میں بیچارگی اتر آئی... باہر نکل کر اس نے دروازہ زور سے بند کر دیا۔بس میں پورا گروپ ایئر پورٹ کے لیے بیٹھ چکا تھا۔اس کے سامنے کی ہی سیٹ پر روہت بیٹھا تھا۔اس کی کالی گہری آنکھیں حنا کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔حنا پر اک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی تھیں۔

لہٰذا وہ فوراً سمجھ گیا... کہ اس نے حنا پر فتح حاصل کر لی ہے۔اس کے لبوں پر وہی پرانی نیم طنزیہ فاتحانہ مسکراہٹ آ گئی۔

دل میں کوئل کوکنے لگی...

پتوں کی پازیب بجنے لگی...

پپیہا من کے سونے آنگن میں بولنے لگا...

اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر گہرے کالے آسماں کو دیکھا۔ستارہ سہیل چمک رہا تھا...

احمد صغیر

اَنّا کو آنے دو

سارا گاؤں دہشت گردوں کا نشانہ بن چکا تھا—، آہستہ آہستہ گھروں سے اٹھتے شعلے اب دھواں بن چکے تھے۔ گلیاں ویران تھیں، لوگ اپنے اپنے گھروں میں یوں چھپے بیٹھے تھے جیسے مُرغیاں دربوں میں دبکی رہتی ہیں۔ آسمان کا کنارہ تک سیاہی مائل ہو چکا تھا اور ہر طرف خاموشی کی طویل چادر بچھی ہوئی تھی۔ پولس جیپ کی گڑگڑاہٹ، سائرن اور سرچ لائٹ کی روشنی سے چند لمحوں میں سارا گاؤں روشن ہوگیا۔ پولس، گواہی اور ثبوت اکٹھا کرنے میں لگ گئی اور ایک بار پھر اَدھ جلے گھروں سے رونے اور چیخ و پکار کی صدائیں بلند ہونے لگیں—

بولنا سب ہی چاہتے تھے مگر خاموشی کی کیلیں سب کے ہونٹوں میں جیسے پیوست کردی گئی تھیں۔ کتنے ہی نازک پھول مرجھا گئے تھے یا شاخ سے ٹوٹ کر بکھر گئے تھے، کتنوں کا تو آشیانہ ہی اجڑ گیا تھا نہ پردہ، نہ رسّی، نہ طنابیں... کھلے آسمان کے نیچے کتنے ہی لوگ آ چکے تھے—

پھُلمتیا کے ذہن میں بہت سارے سوالات گونجتے رہے۔ وہ کھاٹ پر چُپ لیٹی تھی۔ پھول سی اَدھ کھلی بچّی اس کے بغل میں سوئی تھی جس کے زخم پر چند گھنٹہ قبل مرہم لگایا گیا تھا— کبھی کبھی پھُلمتیا کو محسوس ہوتا کہ واقعی جینا بہت مشکل ہے۔ ایک ہی رات میں کیا سے کیا ہوگیا—؟

لیکن یہ کوئی ایک دن کا واقعہ تو تھا نہیں—؟

—پھُلمتیا جلے ہوئے مکان کی طرف دیکھتی ہے۔ اُس پر کوئی تصویر موجود نہیں۔ تمام تصویریں خاکستر ہو چکی تھیں۔ فقط اُن کے نقوش باقی تھے، ہِنا، رامو، دُکھیا، ہریا اور سُمنیا، گھر کے کتنے ہی افراد مارے گئے تھے اور یہ صرف ایک گھر کی بات نہیں تھی۔ کتنے ہی گھروں کے افراد ہلاک ہوئے تھے۔ پھُلمتیا تو گن بھی نہیں پائی تھی۔ کہتے ہیں پولس نے بہت سی لاشیں ہی غائب کردیں۔

اُس نے دیکھا دُم کٹا کتا پھر بھونک رہا تھا، ایک ہفتہ سے لگاتار وہ بھونک رہا تھا، اب اور کون سا حادثہ باقی ہے—؟ اس نے سوچا اب وہ اکیلی تھی ایک دم اکیلی۔ چاروں طرف اندھیرا تھا اور اُس پھیلے اندھیرے کا وہ ایک حصہ بنی ہوئی تھی۔ دل دھڑک رہا تھا، دھڑکے جا رہا تھا۔ ابھی تک خوف سے اُس کا بدن کانپ رہا تھا، کہیں اندھیرے میں وہ راستہ نہ بھول جائے—؟

اِس گاؤں سے اٹھتی آگ کی لپٹوں کو آس پاس کے گاؤں والوں نے بھی دیکھا مگر ایک انجانی دہشت تھی کہ پورے علاقہ کے لوگوں کے دلوں کو دھڑکائے جا رہی تھی اور اِس دہشت زدہ ماحول میں لوگوں کی

نگاہیں خود بخود انا کو تلاش کر رہی تھیں—

— مگر اُسے تو اقتدار کے ذخیرہ اندوزوں نے سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا تھا!

— پھلمتیا کو اچھی طرح یاد تھا کہ انا کے آنے سے گاؤں والوں کی خود اعتمادی دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی وہ جہاں تہاں لوگوں کو جمع کر کے کہتا رہتا—

''ساتھیو!

''کب تک چپ چاپ ظلم سہتے رہو گے۔ دیکھو اپنے ویران گھروں کو، اپنے پریواروں کی چتاؤں سے چنختی ہوئی چنگاریوں کو— آنسو انسان کو کمزور اور بزدل بنا دیتے ہیں۔ یہ ظلم غریبوں پر آج سے نہیں صدیوں سے ہوتے آرہے ہیں۔ ہر طرح سے شکار صرف غریب ہی ہوئے ہیں لیکن ہم اسی طرح ظلم سہتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہمارا نام و نشان مٹا دیا جائے گا۔ ساتھیو، آؤ میرا ساتھ دو، میں تمہیں راستہ دکھاتا ہوں پھر دیکھو کس طرح تمہاری یہ بظاہر اپاہج زندگی اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاتی ہے اور تم محض ایک رینگتے کیڑے نہ رہ کر ایک مکمل وجود بن جاؤ گے اور یہ وجود ہر طرح سے محسوس کیا جائے گا—''

اور انا گاؤں کا ہر دلعزیز ساتھی بنتا چلا گیا— نئی نئی باتیں ظہور میں آنے لگیں۔ انا سارا سارا دن گاؤں گاؤں پھرتا رہتا۔ اُس کا دماغ ہمیشہ نئی نئی باتیں سوچتا رہتا۔ پاؤں کی گردش بدستور جاری رہتی، معمولی معمولی بات پر وہ طوفان برپا کر دیتا جس کے باعث دوسرے لوگوں میں بھی احتجاج کی قوت بڑھ گئی تھی۔ بے چینی، قلبی بے چینی سلگ اٹھی تھی، نہ جانے کب کہاں انا آ پہنچے اور—

— شام ہونے کو آئی تھی، دھوپ نڈھال سی آنگن سے رخصت ہو رہی تھی، جیسے ہی پھلمتیا نے گھر میں قدم رکھا انا کو چارپائی پر بیٹھا پایا۔ وہ حیرت زدہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اُس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ انا اور اس کے گھر—؟

''آج ہم رات یہیں گزاریں گے، صبح ایک مہم پر جانا ہے۔ باقی ساتھی پیچھے سے آرہے ہیں—'' انا نے اسے اطلاع دی۔

پھلمتیا بغیر کچھ کہے اندر چلی گئی تھی اور کھانے کا انتظام کرنے لگی تھی۔

آدھی رات تک وہ چھپر پر نظریں جمائے سوچتی رہی۔ دور سے آنے والی کسی بھیانک آندھی کا شور اُسے سنائی دیتا رہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دھندلے چاند کا دھندلا آسمان ڈوبتا رہا۔ کس کس کی جان جائے گی۔ کتنے پرندے زخمی ہوں گے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں گھٹتی بڑھتی رہیں، وہ کھاٹ پر کروٹ بدلتی رہی۔ بالآخر وہ بے چینیوں کی کشائش سے تھک کر چور ہو گئی اور رات کے کوئی تیسرے پہر نیند نے اُس کی بے قراری کو قرار دے ہی دیا—

صبح نمودار ہوتے ہی وہ اٹھ بیٹھی تھی اور جلدی سے انا کی کھاٹ تک پہنچی لیکن انا نہ جانے کس وقت

چلا گیا تھا۔ وہ باہر آئی اور دور تک گاؤں سے باہر جانے کے راستہ کو تکتی رہی۔ اکا دکا لوگ آجا رہے تھے بس— آج کیا ہونے والا تھا—؟ وہ دیر تک اپنے آپ سے پوچھتی رہی اور جواب نہ پاکر مزید الجھتی رہی۔ سارا دن وہ گھر، صحن اور دہلیز کے چکر لگاتی رہی۔ اس کا دماغ سوچتے سوچتے تھک گیا۔ ذرا دیر ٹھہر کر آرام بھی نہ کر پائی۔ گھر آنگن میں رہتے ہوئے بھی نہ جانے وہ کہاں کہاں بھٹکتی رہی— انا کی مہم کا کیا ہوا؟ انا کے بہت دشمن ہیں۔ سب کی نظروں سے اُسے بچنا پڑتا ہے— آسمان کا کنارہ کتنا سرخ تھا۔ اُسے محسوس ہوتا کہ لمحہ بھر میں آسمان سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتیں گی۔ خون خون— سارا منظر خون خون—!

دوپہر سے شام ہونے کو آئی۔ سرمئی اندھیرے کا وجود قریب آتا چلا گیا۔ سب آنے والی رات کو آنکھوں میں بسانے کے انتظام میں لگے تھے۔ پھلمتیا صحن سے ہوتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئی۔ اُس نے چراغ روشن کر دیا۔ لمحہ بھر میں کمرہ روشن ہوگیا تھا لیکن پھلمتیا کی آنکھوں میں نیند کی آہٹ تک نہیں تھی بس رہ رہ کر اس کے ذہن میں ایک ہی نام اُبھرتا— انا— انا— وہ نام جو اب سارے گاؤں کی زبان پر تھا پتہ نہیں وہ کہاں ہوگا؟

پچھلے ہی دنوں کی بات ہے۔ لکھیا جو بابو صاحب کی حویلی میں برتن مانجھنے کا کام کرتی تھی حمل سے رہ گئی تھی۔ بہت پوچھے جانے پر اس نے بابو صاحب کا نام بتا دیا پھر کیا تھا۔ انا کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ گاؤں کی عزت کی بات تھی۔ دو سو آدمیوں کے ساتھ بابو صاحب کی حویلی پر اُس نے دھاوا بول دیا تھا اور حویلی کی دیواروں کو ہلا کر رکھ دیا تھا—

عجیب آدمی ہے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ سارا گاؤں اُس کا ہے اور وہ سارے گاؤں کا۔ وہ جو عہد کرتا ہے پورا کرتا ہے۔ کبھی وہ ایک جگہ نہیں ٹکتا۔ آج اس گاؤں میں تو کل دوسرے گاؤں میں۔ رات یہاں تو دن کہیں اور۔ اُس کے پیر میں گویا چرخی لگی ہوئی ہے۔ ہنسی کبھی اُس کے چہرے پر نمودار نہیں ہوئی، ہمیشہ تمتمایا ہوا چہرہ اور ساری دُنیا کے نظام کو بدل دینے کا عزم— بھاشن دیتا تو چہرہ کیسا سرخ ہو جاتا۔ وہ کیا کیا کہتا تھا۔ سب بات تو پھلمتیا کی سمجھ میں نہ آتی مگر کچھ جملے کہیں کہیں سے اُس کو یاد تھے۔ ایک مرتبہ اُس نے کہا تھا—

> ''یہ ساری دیوستھا سڑی گلی ہے، جس محکمے میں جایئے وہاں رشوت اور بھرشٹا چار پنپ رہا ہے۔ ہر کوئی ہاتھ میں بھیک کا پیالہ لیے بیٹھا ہے اور ہم لوگ بھی اس کے پیالے میں کچھ نہ کچھ ڈالنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ ہمیں یہ عادت بدلنی پڑے گی۔''

تقریر ختم ہوگئی۔ چند جوشیلے نوجوانوں نے انا کو گود میں اٹھا لیا— ''کامریڈ انا کو لال سلام... لال سلام لال سلام!''— بڑا جوشیلا اور بدن میں خون کی رفتار کو تیز کر دینے والا منظر تھا۔ پھلمتیا مجمع کے کنارے کھڑی سوچ رہی تھی— آج کسی آفیسر کی ضرور شامت آنے والی ہے... یہ آئے دن کا معمول تھا۔ جب کسی کے خلاف احتجاج کرنا ہوتا، وہ لوگوں کو جمع کرتا، جوشیلے بھاشن دیتا اور احتجاجی طریقے پر عمل کر بیٹھتا۔

کارومستری کے پریوار کو بے دردی سے مار دیا گیا تھا۔ اُس کا بس یہی تھا قصور کہ اُس نے مکھیا کے خلاف کورٹ میں گواہی دی تھی۔ سچ بولنے کی اتنی بڑی سزا؟ — ایک سچ کے عوض پانچ پانچ لوگوں کی جانیں! — اور دوسری صبح انا مہم پر نکلا تھا اور مکھیا کے ظالم ہاتھوں کا وجود ختم ہوگیا تھا — یہ سلسلہ کب ختم ہوگا — ؟ کیا اکیلا انا ساری دنیا سے لڑ پائے گا؟ دفعتاً اُس کا ذہن انا پر آ کر ٹھہر گیا — اب کیا ہوگا؟

انا کو ہر حادثہ کی خبر ہو جاتی ہے اور کسی نے اُس تک آج کے حادثہ کی خبر ضرور پہنچا دی ہوگی۔ انا پر کیا گزر رہی ہوگی یہ وہ اچھی طرح سمجھ رہی ہے۔ اگر وہ جیل میں نہ ہوتا تو کب کا یہاں پہنچ چکا ہوتا اور جن عدالت لگا کر کوئی نہ کوئی فیصلہ لے چکا ہوتا۔ اور پھر کسی بڑے کانڈ کی خبر قومی اخباروں کی موٹی موٹی سرخیاں بن جاتیں — یہ بہاؤ کہاں جا کر تھمے گا؟

کیا اکیلا انا اِس نظام کو بدل دے گا یا ہر گھر میں ایک انا کا وجود اب لازمی ہے؟ ہر گاؤں ہر قصبے اور ہر گھر میں انا کی ضرورت ہے جو موجودہ نظام کو بدلنے میں معاون ہو سکے لیکن اس قدر انا آئے گا کہاں سے؟ — برسوں میں صرف ایک انا پیدا ہوتا ہے اور بس ایک دن میں اُسے ختم کر دیا جاتا ہے یا جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جاتا ہے —

تو کیا ہر ماں کو ایک انا — ؟

پھلمتیا یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ دھیرے دھیرے واپس جاتی جیپ پر بیٹھے دو شخص جلے مکانات کو تمسخر سے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے — ''بڑے نکسلائٹ بنتے ہیں سالے، ایک ہی رات میں ٹھنڈے پڑ گئے!'' پھلمتیا اچانک سلگ اٹھی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور چلّا کر بولی —

''انا کو آنے دو سالو! پتہ چل جائے گا!'' — پھلمتیا کی آواز اُن ٹھنڈا کرنے والوں تک پہنچی یا نہیں لیکن وقت کے گنبد میں اُس کی آواز دیر تک گونجتی رہی — ''

اَنا کو آنے دو —!

اَنا کو آنے دو!!

سید اختر الاسلام

ایک فرشتے کا جنم

رات کے ساڑھے تین کا عمل ہوگا کہ فضا میں ایک چیخ گونجی۔ اس سے نہ صرف اس کی آنکھ ہی کھل گئی بلکہ اس کا ذہن بھی صاف ہوگیا۔ وہ بہت دن سے جس پریشانی سے دوچار تھا اس کا حل ایک دم اس کے سامنے آگیا تھا۔ پڑوس کے ایک مکان میں آگ کی روشنی نے اندھیرے کا دامن چاک کردیا تھا۔ اس گھر کی عورت آگ لگا کر خودکشی کررہی تھی۔ وجہ! گھریلو اور خانگی جھگڑے۔ وہ ابھی شادی بیاہ کے جھمیلوں میں پڑنا نہیں چاہتا تھا کہ خانگی جھگڑوں کے دلدل میں پھنسنے سے قبل کوئی آسان سا راستہ تلاش کرلے اور خود اپنی راس لیلا میں اسے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اس نے شریف اور غیر شریف سب قسم کے لوگوں کا کردار دیکھا تھا۔ سب شادی ہوجانے پر عجیب سے ناگفتہ بہہ حالات کا شکار ہوگئے تھے اور ان کی ازدواجی زندگی جہنم سے بھی بدتر ہوگئی تھی۔

لیکن شادی تو اسے ایک نہ ایک دن کرنی ہی تھی۔ ویسے شادی کی عمر ہوئے کافی دن ہوگئے تھے۔ بوڑھی ماں اکثر اس خواہش کا اظہار کرچکی تھی۔ اس کا اصرار تھا کہ گھڑی کی چوتھائی میں بیٹے کو ایک عورت کے پلے باندھ دے جب کہ بیٹا روزانہ ہی اپنی راتیں رنگین کیا کرتا تھا۔

لیکن اس روشنی نے اسے ایک صحیح راستہ دکھا دیا تھا۔ اس نے آناً فاناً فیصلہ کرڈالا کہ چلو تھوڑی سی دیر کے لیے اپنی شریک حیات کے سامنے ذلیل تو ہونا پڑے گا مگر یہ ذلت مستقل آزار سے نجات دلا دے گی۔ نہ جھگڑا، نہ کھٹ پٹ اور نہ دانتا کل کل۔ آخر ایک دن وہ شادی کے بندھن میں بندھ گیا۔ آرسی مصحف کی رسم پر اس نے اپنی شریک حیات کی جھلک دیکھی تو وہ اپنا فیصلہ بدلنے کے لیے تڑپ کر رہ گیا۔ پری چہرہ، رنگ میدا شہاب، نقش و نگار گویا صانع قدرت نے اپنے ہاتھوں سے بنائے تھے۔ آنکھوں میں موتی کوٹ کوٹ کر بھر دیئے گئے تھے۔ لیکن اسی وقت اس نے اپنے کو سنبھالا۔ اس کے اندر کے شیطان نے اسے دکھایا اور اسی کے دماغ میں کچھ پھونکا۔

طبعاً وہ بہت حساس تھی۔ نظم و سلیقہ اور ادب و آئین کا پابند۔ خوب صورت جسم کا دلدادہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ جمالیت پسند اور فیشن پرست بھی تھا۔ اُسے خود کو بنا سنوار کر رکھنے والی عورتوں کے جسم پسند تھے۔ مگر اپنی شریک حیات میں اسے اس وقت سیکڑوں عیوب نظر آنے لگے۔ اُس نے اس کی بغلوں میں بالوں کے گچھے جھولتے دیکھے اور اس منظر سے اس کے سامنے ڈھیلی ڈھالی عورت کا سراپا لہرا گیا جس میں کوئی کشش تھی نہ کوئی حسن تھا۔ یعنی کوئی جاذبیت قطعاً محسوس نہ کی۔

جلد ہی شادی کے جملہ ہنگامے ختم ہوگئے تو اسے ایک کمرے میں دھکیل دیا گیا۔ سہاگ رات منانے

کے لیے۔ اس رات کے لیے جب ارمانوں کی جوت جگائی جاتی ہے۔ یہاں بھی وہ ایک ساعت کے لیے جھجکا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ جذبات سے مغلوب ہوکر اپنے چنگل میں پھنسی اس اکیلی عورت کو دبوچ ڈالے۔ مگر وہ رکا اور اسے اپنا فیصلہ یاد آ گیا۔ اس کی دلہن پلنگ کے ایک کونے میں بیٹھی اپنے ارمانوں کی شبنم کے گھونٹ بھر رہی تھی۔ اس نے خود آگے بڑھ کر اپنے بارے میں بتایا۔ ''ناز، میری عزت تمہارے ہاتھ ہے۔ مجھ سے بڑی سخت غلطی سرزد ہوئی ہے۔ میں نے تمہاری زندگی کو کانٹوں سے بھر ڈالا—

وہ قدرے رکا۔ پھر اس نے ہمت جمع کر کے آخر کہہ ہی دیا۔ ''میں نامرد ہوں۔''

''نامرد؟'' یکا یک گٹھری نما عورت میں زبردست حرکت ہوئی۔ اس نے جھٹ پٹ اپنا نقاب الٹ دیا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور جاتا رہا۔

ناز ڈارلنگ، اب میری عزت تمہارے ہی ہاتھ ہے۔ اس گھر کی شان تمہارے ہی دم سے ہے۔ تم چاہو تو میں تم سے ابھی الگ ہوسکتا ہوں کیوں کہ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ تمہاری عزت و ناموس محفوظ ہے۔ میں تمہیں پھولوں کی ڈالی بنی دیکھنا چاہتا ہوں—''

''مگر لوگ کیا کہیں گے؟'' ناز نے دلیل پیش کی ''اس میں تو سراسر میری ہی بے عزتی ہے۔''

''پھر؟''

''عورت کو ایک سہارا درکار ہے۔ آپ میرے شوہر ہیں۔ میری قسمت میں یہی دن دیکھنا تھا۔ آپ مجھے اپنا پیار دیتے رہیے۔''

''ہوں، خالی پیار؟ اس سے کیا ہوگا؟ ناز، عورت اور مرد کی تخلیق صرف پیار کرنے کے لیے ہی تو نہیں ہوئی۔ یہ رشتہ تو تخلیق انسانی کے لیے بنایا گیا ہے۔ تاکہ دو جواں جسم جب ایک دوسرے میں مدغم ہوں تو ان سے ایک نیا وجود آدم تخلیق پائے۔ روزِ ازل سے یہ اصول کارفرما ہے۔ آدم اور حوا اگر صرف پیار اور بوس و کنار تک ہی محدود رہتے تو ان کے اولاد کیسے ہوتی اور اولاد نہ ہوتی تو یہ دنیا کیسے تشکیل ہو پاتی بلکہ اس کے برعکس ان کی زندگی بے مقصد ہوجاتی۔ میں تو جیسے تیسے اپنی زندگی گذار ہی لوں گا لیکن تم گیلی لکڑی کی طرح اندر ہی اندر سلگتی رہوگی۔ تم میں کوئی شعلہ نہ پیدا ہوسکے گا۔''

مجبور و بے سہارا عورت اس کے فلسفے اور نکتے کی گہرائی کو نہ پا سکی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ پھر اس نے اپنے مجازی خدا کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا۔ پھر وہ اس سے لپٹ گئی۔

لمحہ بھر کو شوہر کے مردانہ احساس میں بیداری آئی۔ لیکن اسی لمحہ اس نے بے حسی سے اُسے سرد کر دیا۔ اس کے اندر والے شیطان نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ وہ بے اندازہ دولت کا مالک تھا۔ شہرت اس کی لونڈی تھی۔ مرتبہ و عزت میں وہ خوش قسمت تھا— لیکن وہ آزاد روش پسند تھا۔ اگر اس طرح کا ڈرامہ نہ کرتا تو اس کی بے زبان بیوی ایک دن اسے بھی آوارہ، بدقماش، بدچلن مشہور کر دیتی اور تب اس کی ازدواجی زندگی اوروں جیسی ہوجاتی— جہنم سے بھی بدتر۔ اور اب وہ خود کو آزاد محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اپنی بیوی پر اپنی نامردی کا ڈھونگ رچا کر اپنے مردانہ پن میں یک گونہ اضافہ کرلیا تھا۔ شہوانی جذبات کی تسکین کے لیے

اپنا مستقبل محفوظ کر ڈالا تھا اور اپنی گناہ آلودہ زندگی کو یکسر پاک کر ڈالا تھا۔

اس کا کاروبار کئی شہروں میں پھیلا ہوا تھا۔ بہت سی لڑکیاں اس کے اشاروں پر ہر وقت رقص کرنے کو تیار تھیں۔ ہر رات وہ ایک نئی حسینہ کے ساتھ دادِ عیش لوٹتا تھا۔

اس کے برعکس اس کی شریک حیات، ناز ایک گھریلو عورت تھی۔ مشرقی تہذیب و تمدن کی پروردہ۔ اپنے مجازی خدا کا جائز ناجائز ہر حکم بجالانے والی۔ ساس پر اس نے یہ ظاہر کیا کہ شوہر و بیوی میں بے پناہ محبت ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے بنا سانس بھی نہیں لے سکتے۔ وہ شوہر کے آنے سے قبل سراپا منتظر رہتی۔ اور اپنی بے کلی کا اظہار کرتی — لیکن درحقیقت وہ نیک خصلت عورت اس فطری کیف اور لذت سے بالکل ماوراء تھی۔ جو شوہر اور بیوی کے قریب میں میسر آتا ہے۔ اس کی خواہش اسے اکساتی۔ کاش اس کا شوہر اسے بھرپور پیار دے۔ لیکن کمرے میں کیا ہوتا — اس کا راز کسی پر افشاء نہ ہوسکا۔ اتنا ہونے پر بھی وہ اس نام نہاد مرد کو مجازی خدا ہی سمجھتی رہی۔

آخر ایک دن یہ راز افشا ہوگیا۔ شادی ہوئے کئی سال ہوگئے تھے۔ مگر اولاد ایک بھی نہ ہوئی۔ ناز کے خسر نے اپنی بیوی سے اسکا ذکر کیا۔ ساس نے بہو سے اسکی تشریح کی۔ اشاروں اشاروں میں بڑھیا نے اپنا مطلب بہو پر واضح کیا۔ شریف بہو نے گویا اپنے کان گنگ کرلیے۔ زبان کو اینٹھ ڈالا۔ بس اپنے تکیے کے نیچے نرودھ اور مانع حمل ادویہ اور ساماں رکھنا شروع کردیا۔ ساس نے جب یہ حال دیکھا تو اپنے شوہر سے مشورہ کیا اور اس دن سے بوڑھی عورت اس تمام سامان کو وہاں سے الگ کرنے لگی۔ اب ساس اور بہو کے درمیان زبردست کش مکش جاری ہوگئی۔ جب بوڑھی عورت کے پار نہ بسا تو وہ اپنی بہو کو میڈیکل چیک اَپ کے لیے ڈاکٹر کے یہاں لے گئی۔ معائنہ ہوا۔ ڈاکٹر نے صاف رپورٹ دی ''عورت کے جسم میں اندرونی طور پر تو کوئی خرابی نہیں۔'' ناز اس رپورٹ سے بہت متفکر ہوئی۔ اب تو ساری برائی اس کے شوہر پر آگئی تھی۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو حالات کے سپرد کردیا۔

یہاں قدرت نے اس کی مدد کی۔

ابھی میڈیکل چیک اَپ کرائے ایک مہینہ ہی ہوا تھا کہ ناز کا پیٹ اپنا حجم بڑھانے لگا۔ ساس اُسے پھر ایک بار ڈاکٹر کے یہاں لے گئی۔ وہ دل میں خوش تھی کہ اس کی سبکی نہ ہوئی اور اس کا بیٹا پوری طرح مرد نکلا۔ یہ بہو کی کارستانی تھی کہ وہ اسے بیٹے کی اولاد کے سکھ سے محروم کیے ہوئے تھی۔ اس نیک ساعت کے لیے بڑھیا کتنے دن سے امید کھائے بیٹھے تھی۔

اس کے برعکس خود ناز اور اس کے شوہر کی نفسیات عجیب ہورہی تھی۔ دونوں کو اپنی اپنی جگہ حیرت اور غصہ تھا۔ شوہر اپنی بیوی کو بدچلن سمجھ چکا تھا اور ناز اس مخمصے میں گرفتار تھی کہ اس کے پیٹ میں بغیر مرد کے حمل کیسے قرار پایا۔ کہیں یہ خدائی معجزہ تو نہیں؟ اچانک اس کی آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا جب ایک دوپہر وہ اپنے کمرے میں بے خبر سو رہی تھی تو اس نے اپنے چہرے پر گرم گرم سانس محسوس کی تھی۔ وہ اس کیف آور لمحہ سے اتنی سرشار ہوئی کہ اس نے قصداً اپنی آنکھیں بند ہی رہنے دیں۔ کسی طرح کی مزاحمت نہ کی۔ اس

کے اوپر والے وجود نے ناز کو زبردستی لپٹا لیا۔ اس کے کولہے، پیٹھ اور سینے پر اس قدر ہاتھ پھیرے کہ ناز کے پورے جسم میں چنگاریاں سی سلگ اٹھیں اور اس تپش میں وہ وجود اس میں سما گیا۔ ناز کو خوشی ہوئی کہ پتہ نہیں کس پیر کامل کی دعا سے اس کے نامرد شوہر کی قوت مردانہ جاگ گئی۔ چنگاریوں کی تپش ناز برداشت نہ کر پائی۔ اور اس نے جیسے تیسے اپنے کو چھڑا کر نکل بھاگنا چاہا۔ اس پر ایک وحشت سی طاری ہوگئی۔ لیکن اس وحشت زدہ حالت میں اسے کتاب میں لکھی یہ بات یاد آگئی کہ عورت اور مرد کے اختلاط سے تو بڑا تیز طوفان آتا ہے جب کہ دریا میں طغیانی نہ آسکی۔ اس کی جنسی آسودگی نہ ہوئی۔ بس بہت ہلکے سے یہ محسوس ہوا کہ اوپر والے وجود نے کوئی معمولی سی رقیق شے اس کے جسم میں داخل کردی ہے۔

اگلی ساعت اس نے اپنے شریک زندگی، اپنے شوہر کو دیکھنے کے لیے جیوں ہی آنکھیں کھولیں تو اسے تصویر حیرت بن جانا پڑا۔ اس کی منہ بولی بہن، اس کی پڑوسن شہلا تھی جس کا شوہر اس کے شوہر کے پاس ملازمت کرتا تھا۔ وہ اکثر آؤٹ ڈور خدمات کے لیے باہر جاتا رہتا تھا۔

''ہیں؟'' ناز حیرت سے بولی،، باجی تم، یہ ہٹاؤ— یہ کیا غلط حرکت ہے؟ اس نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔

''میری جان، حرکت نہیں۔ میں تمہارے اس لازوال حسن پر ایک عرصہ سے فدا تھی۔ آہ! تم کتنی خوبصورت ہو۔ نرم و گداز۔ میں تم سے مباشرت کے لیے کتنی مدت سے منتظر تھی۔ تم نے آج میری جنم جنم کی پیاس بجھا دی۔''

ناز نے بمشکل اپنے کو الگ کیا اور شرما گئی۔ شہلا نے اسے عریاں کر ڈالا تھا۔ اس کے نسوانی اعضاء بالکل عریاں ہوگئے تھے۔ اس نے جلدی جلدی اپنے کو درست کرنے کے لیے کمرے کا کواڑ بند کیا کہیں ساس نہ آجائے۔

شہلا بڑی تجربہ کار عورت تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو یہ گُر سکھا دیا تھا کہ وہ اپنے باس کو ہمیشہ خوش رکھے۔ اُس نے دوسری طرف ناز کے شوہر پر ڈورے ڈالے تھے اور اسے اپنی زلف کا اسیر کرلیا تھا۔ اسی کی مرضی سے ناز کا شوہر شہلا کے شوہر کو آؤٹ ڈور کاموں کے لیے بھیجتا تھا اور اس کام میں کئی کئی دن لگ جاتے تھے۔ اس ڈیوٹی کے بدلے باس اپنے ملازم پر دولت کی بارش کرتا تھا اور اس کی غیر حاضری میں اس کے گھر بار کا مالک ہوجاتا تھا۔ ناز کو اپنے شوہر کی نامردی کا مکمل یقین تھا۔ اسی لیے وہ اس کے شہلا کے گھر آنے جانے پر کوئی اعتراض نہ کرتی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت شہلا کے پاس گذارتا تھا۔

دن گزرتے گئے۔ ناز کا پیٹ پھولتا گیا اور ایک دن اس نے ایک خوبصورت بچے کو جنم دے دیا۔ شوہر صاحب اندر ہی اندر حسد کے مارے جلتے رہے لڑکا بالکل باپ کی صورت تھا۔ اب اُسے یہ پشیمانی ہو رہی تھی کہ اپنے حیوانی جذبات کی تسکین کے لیے اسی نے کیوں ایک پاکباز اور فرشتہ عورت کو گناہ کی دلدل میں دھکیلا۔ اس کا دل کسی بھی صورت ناز کو بدچلن ماننے کو تیار نہ تھا۔ وہ اس کی پاکیزگی کی قسم کھانے کو تیار تھا۔ شادی کے بعد ناز اس کے ساتھ ہی تھی۔ گھر میں کسی مرد کا کوئی گذر نہیں تھا۔ کالوں اور دیگر قسم

کے اجتماعات میں ناز کبھی نہیں جاتی تھی جس سے یہ امکان ہوسکتا کہ اس نے اپنی جنسی بھوک کو غذا بہم پہنچائی ہے۔

اس نے ایک بار یہ بھی چاہا کہ اپنی شکل کے اس بچے کو مار ڈالے لیکن اس کے ذہن میں ایک نیا خیال آیا— کیوں نہ ڈاکٹر سے مشورہ کرے۔

''کیا عورت بغیر مرد کے حاملہ ہوسکتی ہے؟'' اس نے بالآخر ڈاکٹر سے دریافت کر ہی ڈالا۔

''کیا مطلب؟'' ڈاکٹر نے سوال طلب انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ وہ گھبرا گیا مگر دوسرے لمحہ اپنے اوپر کنٹرول کیا اور بات بناتا ہوا بولا ''مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کہ جیسے حضرت عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے؟''

''دیکھئے مسٹر'' ڈاکٹر نے سخت لہجہ میں کہا'' وہ خدائی معجزہ تھا۔ اس موضوع پر کسی مذہبی رہ نما سے بات کیجئے کیونکہ مذہب پر تنقید اسلام میں نہیں کی جاتی۔ اور پھر میں نہیں چاہتا کہ آپ کے خیالات برگشتہ ہوں۔''

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔

پھر ڈاکٹر بولا ''میں اس سلسلے میں آپ کو ایک کیس کا حوالہ دے سکتا ہوں۔ ابنارمل سائی کولوجی میں ایک بار ایک ایسا کیس میں نے پڑھا تھا کہ دو عورتوں کے ہم جنسی اختلاط سے ایک عورت کے حمل ٹھہر گیا تھا۔ ویسے قدیم سنسکرت گرنتھ چرک سہنتا اور سشروتی میں عورتوں عورتوں کے درمیان حمل ٹھہرنے کا ذکر ملتا ہے۔ آج کل جو ٹیسٹ ٹیوب پیدائش کے سلسلہ میں تجربات ہورہے ہیں وہ بھی اس زمرے میں آتے ہیں۔ حال ہی میں دولت کی تقسیم روکنے کے لیے ایک بھائی نے اپنی سگی بہن کی کوکھ میں اپنے نطفہ کو رکھ کر اس سے بچہ پیدا کیا ہے جو اخباروں میں موضوع بنا تھا۔ جو بات میں آپ کو بتا رہا ہوں وہ خاص قسم کے حالات کے تحت ہوئی تھی۔''

''کیسے؟ عورت عورت کے مابین اختلاط سے پیدائش؟'' اس کے منہ سے نکلا۔

''بہت سی عورتیں ہم جنسی (Lesbianism) کی عادت بد، کا شکار ہوتی ہیں۔ یہ تحریک عورت میں کثرت جماع سے پیدا ہوتی ہے۔ عرب عورتوں میں اکثر ختنے کرانے کے واقعات آپ نے پڑھے اور سنے ہی ہوں گے۔ زیادہ شہوت والی عورت سے اگر کوئی مرد مباشرت کرلے اور وہ عورت بنا غسل کئے دوسری عورت سے ہم بستری کرلے تو اس کی اندام نہانی (Vagina) میں دوسری جارح عورت کے ختنہ میں چپکے مادہ منویہ کے جراثیم دوسری عورت کے رحم میں داخل ہوکر ایک بچہ کی پیدائش ممکن بنا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر کی بات سنتے سنتے ناز کے شوہر کے ذہن میں اسکی معشوقہ شہلا کی وہ بات اچھل کود مچانے لگی جب اس نے کہا تھا کہ پیارے لو میں آج تمہاری بیوی کے ساتھ یہی کھیل کھیل آئی ہوں۔ اس وقت تو اس نے اس طرف زیادہ دھیان نہ دیا تھا مگر اب ڈاکٹر کی بات پر محو حیرت ہوگیا تھا۔

اور پھر فوراً ہی اسے اپنا وجود تحلیل ہوتا نظر آیا۔ اس کا ذہن صاف ہوگیا تھا۔ ناز نے جس بچے کی تخلیق کی تھی وہ اس کا نطفہ تھا۔ اسی کا بیٹا تھا۔ اس کی بیوی ناز فرشتہ تھی اور اس نے فرشتے کو ہی جنم دیا تھا۔

محمود شیخ

ماگندیا

میں ایک پتھر کی مورت ہوں۔
میں جو پتھر ہے۔
خاموش، اداس وتنہا!
نہ جانے کتنی صدیوں کے نشاں میرے سینہ پہ ہیں۔ ہر پل احساس کا آئینہ ہے۔ پھول کی خوشبو، جھرنوں کی کھنک اور دریا کا سکوت مجھ میں ہے۔ لبوں پہ کسی معصوم بچہ کی سی مسکراہٹ اور پیشانی پر صداقت کا نور دمکتا ہے۔ ہوا مجھے گرد وغبار سے اٹ دیتی ہے۔ لیکن برسات کی نرم پھوار پڑتے ہی میں تابناک ذروں کی مانند دمک اٹھتا ہوں۔ قدیم تر ہوتے ہوئے بھی، سورج، چاند، ستاروں کی مانند نیا ہوں۔ کائنات کی ہر شے مجھے خود میں دکھائی دیتی ہے اور ہر شے میں خود کو دیکھ لیتا ہوں۔ حیات وممات کی زنجیروں سے آزاد ہوں میں۔ یہ سبزہ زار، یہ روش، یہ پرندوں کی نغمہ ریز آوازیں، یہ گھنے درختوں کے نرم سائے، یہ اونچے اونچے فواروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار، یہ سنگِ مرمر کے سرد چبوتروں کے گرد پھولوں کی خوشنما ڈالیوں کے ہجوم، یہ دیوداسیوں کی سی نرم ونازک انگلیوں کا لمس، میرے پتھر ایسے بدن کو چھوتا ہے، کانپ جاتا ہے۔

ایک زمانہ ہوا۔ جب ایک روز، ایک پجاری اپنی اکلوتی کنواری کنیا کا ہاتھ لیے، ایک تیجسوی سادھو کے پاس پہنچا اور اپنی سندر ششیل کنیا کو بیوی کے روپ میں قبول کرنے کی درخواست کی۔ سادھو نے نظریں اٹھا کر اس حسین وجمیل سچائی کو دیکھا بھی نہیں جس کے سامنے بڑے بڑے شہنشاہوں کے سرنگوں ہوجاتے ہیں۔ اس نے نہایت منکسرانہ لہجہ میں کہا۔

"یہ شریر تو پاؤں سے چھوئے جانے کے لائق بھی نہیں ہے۔ مجھے معاف کرو کہ میں مایا موہ کے بندھن سے مکت ہوچکا ہوں۔"

اتنا اہنکار، اتنا غرور، اپنی خودی کا، اپنے ہونے کا اتنا شدید احساس اور وہ بھی میرے سامنے۔ مجھ تک تو تمہیں خود ہی آنا چاہیے تھا لیکن میں تمہارے پاس آئی۔ کیا تمہارا موکچھ مجھ سے بھی زیادہ اہم ہے۔ میرا حسن، میری صداقت، تمہاری تپسیا اور تیاگ کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ یہ جھیل سی آنکھیں دیکھو۔ ساون کی گھنگھور گھٹاؤں ایسے سیاہ بال، کنول سا کھلا ہوا چہرہ دیکھو۔ زندگی ایک سچائی تو ہے مگر مجھ سے بڑی نہیں۔ ایک دن سچ اور جھوٹ کا فرق میں تمہیں بتاؤں گی۔ ہاں، ہاں میں جانتی ہوں کہ شبنم کی ایک بوند صحرا کی آنکھ کی ٹھنڈک نہیں ہوسکتی۔ لیکن بوند کو سمندر اور چنگاری کو شعلہ بنتے بھلا دیر کتنی لگتی ہے... وہ دل ہی دل میں ہزار پیچ وتاب کھا رہی تھی۔ محبت میں تباہ ہونا تو عورت کی فطرتِ ازلی ہے۔ خواہ وہ اپنی مرضی سے ہو یا کوئی

اور اسے تباہ کرے۔ اپنے ہونے کا غرور، حسن و جمال کا احساس اسے شعلہ صفت بنا دیتا ہے اور یہ چند لمحوں کی حدت بھی اس کے اپنے ہی وجود کو خاکستر بنانے کے لیے کافی ہے۔ آخر ماگندیا کا حسن و جمال رنگ لایا اور وہ راجہ اڈین کی رانی بنی۔ پھر اس نے راجہ کو سمجھایا کہ تم جس کی اپاسنا کرتے ہو، وہ تم سے کہیں تمہاری حکومت نہ ہتھیا لے۔ اس نے محل میں رہنے والی داسیوں کو منع کیا کہ تم جس کی اپاسنا کرتی ہو وہ تو ایک بہت معمولی انسان ہے۔ اس میں ایسا ہے ہی کیا جس کی تعریف کی جائے۔ لیکن اس کے جذبات و احساسات کا کسی نے کوئی خیال نہ کیا اور وہ اپنی ہی آگ میں اندر ہی اندر سلگتی رہی، اپنی نفرت سے اپنی محبت سے!

سنگِ مرمر کے دس فٹ اونچے پلیٹ فارم پر استادہ بت میں اکثر میری روح اپنے جسم کے واپس لوٹنے کا انتظار کرتی ہے۔ صدیاں گزر گئیں۔ ہزاروں چہرے بدل گئے۔ مگر لوگ مجھ ایسے پتھر کو سینے سے لگائے چلتے رہے۔ نہ جانے کتنے ہاتھوں نے مجھے چھوا۔ نہ جانے کتنی آنکھوں نے مجھے چاہا ہے۔ لیکن میری سرگرداں اور پریشان روح کو آج بھی اپنے جسم کے واپس لوٹنے کا انتظار ہے۔

حادثات کے سیل رواں کو میں نے پتھر ایسی فکر سے ٹکرا کر ٹوٹتے دیکھا ہے اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ سینۂ دہر پہ نرم و نازک احساسات نے پتھروں کو موم کی طرح بہا دیا۔ پھول کھلتے ہیں، سوکھ جاتے ہیں، بہار آتی ہے، لوٹ جاتی ہے۔ صدیوں کے جسم پر انگنت زخموں کے نشاں پھول سے مہکتے بھی ہیں اور کانٹوں کی طرح انگلیوں میں پیوست بھی ہو جاتے ہیں۔ کبھی پتھروں کی چوٹ سے بھی شیشہ نہیں ٹوٹتا اور کبھی ہوا کی ہلکی سی آہٹ ہی پہ درک جاتا ہے۔ عورت کی سازش میں اس کا دماغ نہیں دل کام کرتا ہے۔ اس لیے انجام کی پرواہ کیے بغیر اس نے رات کے آخر پہر محل میں آگ لگا دی۔ داسیاں جل کر راکھ ہو گئیں۔ محل بھی خاک ہو گیا۔ دوسرے دن راجہ اڈین نے اس جرم کی پاداش میں اس کے باپ کو قتل کرا دیا۔ پھر ایک ایک کر کے اس کے سامنے تمام افراد خاندان بھی قتل کر دیے گئے اور آخر میں اس کی محبوب رانی ماگندیا بھی قتل کی سزاوار ہوئی۔ جو آج طاقت ور ہے، کل وہ بہت کمزور تھا۔ مگر عورت جو کل تھی وہی آج بھی ہے۔ جیسے چاند اور سورج، جیسے دریا اور سمندر، جیسے زمین اور آسمان۔ روز اول سے اس کی فطرت میں خود سپردگی اور شدت احساس کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اس روز شام کو کھیت سے ماگندیا گھر لوٹی تو رات گئے انتظار کے باوجود مرلی گھر نہیں پہنچا۔ چار ماہ پرانی ازدواجی زندگی میں یہ پہلا اتفاق تھا جب وہ رات بھر تنہا اپنی جھونپڑی میں کروٹ بدلتی رہی اور کسی کے بدن کا سخت اور مانوس لمس اس کے مقناطیسی جسم سے دور دور رہا۔ صبح جب وہ مرلی کو ڈھونڈتی ہوئی گاؤں کے زمیندار کے یہاں پہنچی تو معلوم ہوا، اپنے مالک کے برتن چرا کر مرلی کل شام سے فرار ہے۔

''کیا، کیا سامان لے گیا؟'' ماگندیا نے اداس لہجہ میں مالن سے دریافت کیا۔

''دو گلاس پیتل کے۔'' اس نے تھکے تھکے سے لہجہ میں جواب دیا۔ ''ایک کانسے کا کٹورا...''

''اور...؟''

''ایک پیتل کی تھالی۔'' بوڑھی مالن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''بس اتنا ہی!''

''اتا!'' ماگندیا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''کہاں لے جائے گا؟''

دادا، پردادا پھر باپ اور اب مرلی اپنے پرکھوں کا قرض چکانے آیا تھا۔ لیکن یہ قرض کم ہونے کی بجائے گلے کا پھندا بن گیا اور جس میں اب ایک نرم و نازک گردن آئی تھی۔ ماگندیا!

وہ میرے سامنے پھولوں کے کنج میں بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں جو ایک پتھر کی مورت ہوں۔ میں جو پتھر ہے۔ خاموش، اداس و تنہا! سانولی، سلونی ماگندیا سنگ مرمر کی نرم و نازک سیڑھیوں پر اپنے صندل ایسے پاؤں رکھتی ہوئی آہستہ آہستہ نیچے روش پر اتر آئی۔ اس کی پرسکون آنکھوں میں سمندر کا سونا پن جھلک رہا تھا۔ جب آدمی تنہا اور اداس ہوتا ہے۔ جب سمندر خاموش اور پرسکوت ہوتا ہے۔ تو چٹانوں کو خش و خاشاک کی طرح اڑا دینے والا طوفان بھی ضرور آتا ہے۔

''مالک نے کہا ہے، تجھے اپنے پتی کے گناہ کا پرائشچت کرنا ہوگا۔'' بوڑھے ملازم نے کہا۔ ''جب تک تیرا پتی واپس نہیں آجاتا تجھے مالک کی سیوا کرنی ہوگی۔''

پھر ایک دن مالک نے اسے دسترخوان کی طرح سجایا۔ دوسرے دن پھر، پھر تیسرے دن بھی باز نے کبوتری کے تمام پر نوچ لیے تھے۔ تنہائی میری رفیق ہے اور خاموشی میرا لباس۔ دوست و دشمن سب مجھے برابر ہیں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ سب اپنے اپنے وجود کا ٹکراؤ ہے اور جب احساس اپنی حدوں سے گزر جاتا ہے تو تباہی ناگزیر ہوتی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ الفاظ کائنات کی اس لامحدود حقیقت کو بیان کرنے سے قاصر ہیں جو نگاہ دیکھتی اور دل محسوس کرتا ہے۔ جب رات بھیگ رہی تھی اور لوگ نیند کی وادیوں میں محو سفر تھے۔ جب آرزوئیں کروٹ بدل رہی تھیں اور فضا میں ٹھنڈک تحلیل ہو رہی تھی۔ جب پرندے آشیانوں میں کسمسا رہے تھے۔ اچانک محل نما عمارت کی بلندیوں پر ایک چنگاری نے سر اٹھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے شعلۂ جوالہ بن گئی۔ ہوا شعلوں کو لے اڑی اور آگ دہکنے لگی۔ چاروں طرف آگ بھڑک اٹھی تھی۔ شعلے ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر برس رہے تھے۔ ایک قیامت کا منظر تھا اور لوگ بے بس کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی آگ انسانی دسترس سے باہر ہو جاتی ہے۔ آج بھی یہی ہوا تھا۔

صبح کی مدھم کرنوں نے زمین پر دہکتے ہوئے اس منظر کو کچھ اور اجال دیا۔ ہوا تیز ہو گئی تھی۔ کچھ لوگ کنوئیں سے ایک لاش نکال کر لائے اور باغ کے سنگی چبوترہ پر لٹا دیا یہ ماگندیا تھی۔ جو اپنے پتی کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے آئی تھی۔ معصوم و خوبرو ماگندیا کا چہرہ سورج کے روپہلی کرنوں سے دمک اٹھا تھا۔ اس کی بے جان اور ادھ کھلی آنکھوں سے زندگی کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اس دنیا میں کچھ لوگ مر کر بھی جی اٹھتے ہیں۔ میرے سر پر چڑیوں کا ایک جوڑا اداس بیٹھا تھا۔ میری روح ماگندیا کا طواف کر رہی تھی۔ وقت نے کتاب زندگی کا ایک ورق اور موڑ دیا تھا اور میں ایک ادائے بے نیازی سے سر جھکائے سب دیکھ رہا تھا۔

میں جو ایک پتھر کی مورت ہوں
میں جو ایک پتھر ہے
خاموش، اداس و تنہا!

خالی کمان

کھلونے تو ہوتے ہی ہیں ٹوٹنے اور بکھرنے کے لیے اور پھر۔ مٹی کے کھلونے ان کی بساط ہی کیا۔ ذرا سی ٹھیس لگی اور ٹوٹ گئے۔ ویسے بھی ہر چیز اپنی اصل کی جانب لوٹتی ہے۔ لوٹنا چاہتی ہے۔ ہر شے کی حقیقت فنا ہے۔ مگر چودھری حسین اپنے دالان کے وسیع و عریض تخت پر بیٹھے سوچ رہے تھے کیا واقعی یہ تخت کبھی فنا نہیں ہوگا؟ کیا اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔ یہ تخت جس کے اردگرد ہر پل یادوں کا بازار سجا رہتا ہے— پچھلے ساٹھ سالوں سے وہ اس تخت پر مسلسل بیٹھا رہتا ہے۔ یہ تھکتا نہیں، ٹوٹتا نہیں اور مرتا بھی نہیں۔ شاید یہ کبھی نہیں مرے گا۔ کیونکہ فنا ہونے والے کچھ لوگ لافانی اشیاء چھوڑ جاتے ہیں۔ جنہیں کبھی موت نہیں آئے گی—

اس تخت سے چودھری حسین کا رشتہ کیا تھا یہ تو وہی جانتے تھے یا پھر وہ، جو تعمیر و تخریب پر قادر ہے۔ وہ تو بس اتنا جانتے تھے کہ اب سے ساٹھ برس پہلے جب وہ شکوری کو بیاہ کر لائے تھے تو اس کے جہیز میں چاندی کے پایوں والا یہ تخت بھی شامل تھا—

اپنے کچے مکان میں چاندی کا تخت انہیں ہر لمحہ اپنی کم مائیگی کا احساس دلاتا رہا اور انہیں یہ تخت دیکھ کر کوفت ہوتی— مگر ایک روز اچانک ہی انہوں نے محسوس کیا وہی ناپسندیدہ تخت ان کے دل سے گزرنے لگا ہے— ہوا یوں کہ اس روز چودھری حسین میاں نے اپنی نو بیاہتا بیوی شکوری کو تخت پر کچھ اس طرح دراز دیکھا کہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ اسکی آنکھیں بند تھیں۔ سرہانے کی جانب لمبے اور ریشمی بال تخت کے نیچے فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ رخسار پر سیاہ تل غلاف کعبہ کی طرح لپٹا ہوا تھا اور گلابی پاؤں میں چاندی کی پازیب اپنے خوابیدہ نغموں کو تھپک رہی تھی۔ حسن و جمال سے مزین شکوری پر کم سنی مزید قیامت ڈھا رہی تھی۔

منظر نگاہوں سے پھسل کر باطن میں اتر جائے تو کبھی دھندلاتا نہیں پڑتا— یہ انہیں حسین لمحوں کا کرشمہ تھا کہ حسین میاں کے لیے گھر کی تمام اشیاء سے زیادہ محبوب صرف وہ تخت تھا جس پر شکوری کی شبابی یادیں کسی شہزادی کی طرح آج بھی براجمان تھیں۔

عمر کی اسی سیڑھیاں اترنے کے بعد صحت، بینائی، حافظہ سب بیگانے ہو جاتے ہیں۔ مگ چودھری حسین کے حافظے میں گزرے ہوئے دن پل پل زندہ تھے اور شکوری جگنو کی طرح اس کی پلکوں پر سجی رہتی تھی۔ محبت کا یہ عالم تھا کہ چودھری حسین کی ہر گفتگو میں شکوری کا ذکر ضرور شامل ہوتا۔ کئی بار تو بیٹیاں چڑ کر

کہتیں—

''بابا، اس عورت کا ذکر بار بار کیوں کرتے ہیں جو آپ سے بیوفائی کر کے ایک غیر مرد کے ساتھ فرار ہوگئی۔

''بیٹی! وہ اس کا اپنا فعل تھا، اور یہ میرا— ماں کو کچھ نہ کہو ماں تو پھر ماں ہوتی ہے۔ اولاد پر اس کے بڑے حقوق ہیں—''

''مجھے تو نفرت ہے اس ماں سے جو ہم دونوں جڑواں بہنوں کو پالنے میں چھوڑ کر بھاگ گئی—''

''قسمت کا لکھا کون ٹال سکا ہے بیٹی۔'' وہ ہر بار شکوری کی بدچلنی کو قسمت کے خانے میں ڈال کر بیٹیوں کو چپ کرا دیتے۔

چودھری حسین کبھی کبھی سوچتے جو کچھ ہوا اس میں شکوری کا کیا قصور تھا— اندھیروں سے روشنی کا سمجھوتہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں—

اور— اب تو شکوری کے ہاتھوں لگائے ہوئے آنگن کے تمام درخت بلند ہو چکے تھے اور درخت کے ہر پتے، ہر پھول، ہر شاخ پر شکوری کا بسیرا تھا۔ اسی کی حکومت تھی، اسی کا راج تھا۔

''اری او نگینہ دیکھ میری چلم کی آگ بجھ گئی—''

''آئی بابا، بوڑھی ملازمہ ہاتھ میں کرچھل پر دہکتے کوئلے لئے حسین میاں کے سامنے ہانپتی کانپتی آن کھڑی ہوئی۔

''لا بیٹی لا۔'' چلم کو آگے بڑھاتے ہوئے چودھری حسین بولے۔ ''اس میں بھر دے۔''

''بابا کیوں پیتے ہو اتنا حقہ؟ جانتے ہو نا پچھلے دنوں وید جی نے کیا کہا تھا۔ سخت، نقصان دہ ہے تمہارے لیے۔''

''نقصان! بیٹی انسان تو روزِ ازل سے خسارے میں ہے۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو بابا میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''وقت سب کچھ سکھا دے گا جا اپنا کام کر اور ہاں سن طاہرہ سے ایک گلاس پانی بھجوا۔'' خادمہ بغیر جواب دیئے خاموشی سے سر جھکائے دالان سے باہر نکل گئی— ہر وقت ایک ہی سوال کا جواب دے دے کر وہ تھک چکی تھی۔ وہ ہر وقت بیٹیوں کی صدا لگاتے اور خادمہ انہیں بتاتی کہ اب ان کی بیٹیاں یہاں نہیں پرائی ہو کر اپنا اپنا گھر آباد کر چکی ہیں—

چودھری حسین کی دھندلائی آنکھیں ہزار گز کے وسیع و عریض آنگن کا گوشہ گوشہ تلاش کرتیں اور پھر الگنت چیختے سائے منظر میں اجاگر ہو جاتے۔ شکوری اپنے سنہرے ریشمی بالوں کو سکھاتی ہوئی تخت پر جلوہ نما ہو جاتی۔ کہیں مٹی کے گھروندے بناتی ہوئی طاہرہ اور نگینہ کی بچکانہ نوک جھونک ساعت کو جھنجھوڑتی۔ آنگن

کے ایک سرے پر چھوٹی سی کوٹھری میں مصلے پر بیٹھی ہوئی بوڑھی ماں بادل کے سفید ٹکڑے کی طرح چمکتی ہوئی دکھائی دیتی۔ یہ ساری سفیدی باپ نے ماں کو سوغات میں دی تھی۔ جس پر ماں نے آخری دم تک کوئی رنگ نہ چڑھنے دیا۔ وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا اور ماں نے ایک پھول کے لیے اپنی جوانی کا پورا گلشن قربان کیا تھا——

شکوری بیاہ کر آئی تو ماں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ حسین و جمیل بہو پا کر اس کے خوابوں کی تعبیریں ہر لمحہ رقص کرتیں۔ چاند کا ٹکڑا کہتے منہ نہ تھکتا اور حسین میاں تو چاند کہہ کر ہی مخاطب کرتے مگر دل ہی دل میں یہ بھی کہتے۔

''شکوری تم میرے آنگن کا وہ چاند ہو جسے دیکھ کر میرے طاق کا دیا ہر لمحہ شرمندہ رہتا ہے۔'' شادی کو ایک سال گذر گیا تھا۔ شکوری اب سولہ سال کی ہوگئی تھی۔ سولہ سال کی عمر جذبوں کی زبان سمجھنے لگتی ہے۔ یہی سوچ کر حسین میاں پر ایک خوف طاری تھا۔

کئی دنوں سے شکوری اُداس اُداس اور سنجیدہ نظر آرہی تھی۔

''کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی چاند! حسین میاں شکوری کے قریب آکر بولے تو شکوری نے انہیں اس طرح چونک کر دیکھا جیسے کہہ رہی ہو میں بچی نہیں ہوں سب سمجھتی ہوں۔

''کیا کہنا چاہتی ہو بولو؟ جواب میں شکوری کی نظریں اٹھیں اور جھک گئیں۔ حسین میاں کو لگا کوئی تیر تھا جو سیدھے ان کے دل میں اُتر گیا۔ وہ تلملا کر رہ گئے۔

تھوڑے ہی دنوں میں چودھری حسین میاں نے محسوس کیا کہ شکوری کی زلفوں کی خوشبو اب ان کے گھر کی چہار دیواری پار کرنے لگی ہے اور ان کے آنگن کے پیڑ پودوں، اور پھولوں پر نت نئے بھونرے منڈلانے لگے ہیں۔ وہ سخت الجھن میں تھے۔ خوشبوئیں قید نہیں کی جاتیں۔ بھونرے گرفتار نہیں ہو سکتے۔ کئی بار ارادہ کیا کہ اس بارے میں شکوری کو تنبیہ کریں مگر یہ سوچ کر سہم گئے کہ اگر شکوری نے یہ پوچھ لیا کہ جوان بیوی کے بستر پر ہوتے ہوئے اس سے منہ موڑ کر کیوں سوتے ہو؟ کیوں بغیر غسل کے نمازِ فجر ادا کرتے ہو تو کیا جواب دیں گے۔ مگر یہ آنکھ مچولی آخر کب تک چلے گی۔ ایک دن تو یہ بات ظاہر ہو کر رہے گی——

مگر آج حسین میاں نے اپنی تمام تر خود اعتمادی کے ساتھ یہ فیصلہ کر ہی لیا کہ اب شکوری کو مزید اندھیرے میں نہ رکھیں۔

''غور سے سنو! جو میں کہہ رہا ہوں شکوری میں کسی عورت کے قابل نہیں۔ تم سے اس لیے چھپایا کہ میں تم سے بے حد پیار کرتا ہوں۔ میں تمہیں کسی بھی حال میں کھونا نہیں چاہتا——'' اس انکشاف کے بعد شکوری پر ایک ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی اور کافی دیر تک وہ بے ہوش رہی——

شکوری کے نرم بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے حسین میاں بولے۔

''تمہارا غم میرا غم ہے شکوری آؤ آج ایک فیصلہ کریں۔''

''میں سمجھی نہیں!

''تمہارے پاس جوانی ہے اور میرے پاس خواب۔ میں مجبور ہوں مگر تم تو مختار ہو میری جان، میں اپنے آنگن میں ننھے منوں کی کلکاریاں سننا چاہتا ہوں۔ اب تم یہ پوچھو گی کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ تو سنو! میں تمہاری مدد کروں گا۔ مرد عورت کے لیے ایک سایہ ہے، ایک آڑ ہے، ایک ڈھال ہے، کوئی تم پر شک بھی نہیں کرے گا اور ہم صاحبِ اولاد ہو جائیں گے۔ لیکن ایک بات دھیان سے سن لو جو مرد تمہارے جسم تک آئے کبھی دل تک نہ پہنچے۔ تمہارے دل تمہاری روح پر صرف میرا حق ہے۔

اُس روز حسین میاں نے اپنے ہاتھوں سجا سنوار کر شکوری کو تیار کیا تھا اور ان کا دوست صدر دروازے سے گھر میں داخل ہوا تھا اور وہ پچھلے دروازے سے باہر نکل گئے تھے—

پھر— پورے نو مہینے بعد۔ حسین میاں کے گھر میں دو جڑواں بیٹیوں کی پیدائش کا جشن منایا گیا تھا— باپ بن جانے کی خوشی میں تھوڑی سی اُداسی بھی گھلی ہوئی تھی جسے شکوری بھی محسوس کر رہی تھی۔ کبھی کبھی اسے حسین میاں پر ترس آتا اور قدرت کی محرومی پر روتی بھی اور گلہ بھی کرتی۔

حسین میاں کے دوست الطاف کا اب بھی شکوری کے بستر سے رشتہ قائم تھا۔ بلکہ اور مضبوط ہو گیا تھا۔ کیونکہ شکوری کو ایک ساتھ دو بیٹیوں کا تحفہ دے کر اب عاشق ہی نہیں اس کا محسن بھی بن گیا تھا اور شکوری کا الطاف کی طرف دل و جان سے مائل ہونا فطری تھا کیونکہ اس کی بیٹیوں کا باپ تھا—— دو دن بعد الطاف کی شادی تھی۔ شکوری نے رو رو کر اپنا حال برا کر لیا تھا اور حسین میاں اسے دیکھ دیکھ کر کڑھ رہے تھے— ''تو اب شکوری الطاف سے محبت کرنے لگی ہے؟ ان کے سینے میں ایک آگ دہکنے لگی تھی اور آج انہیں اپنا وجود ایک حقیر ذرّہ سے بھی کم تر لگ رہا تھا۔

''دل بھی دوسرے کا اور جسم بھی۔ ہائے شکوری پھر میرے لیے تو نے کیا رکھا؟ شکوری بھی کیا کرتی۔ دل اپنی بستیاں بسانے کے لیے کسی حکم کسی پابندی کا محتاج نہیں ہوتا اور پھر جسموں کے سفر میں دل کا بچنا اتنا آسان بھی تو نہیں ہوتا—

اُس رات شکوری اور الطاف ایک دوسرے کی بانہوں میں سمٹ کر صبح ہونے تک روتے رہے اور حسین میاں اپنے کمرے کے روشن دان سے لگے اپنے پتھر ہونے کا احساس کرتے رہے اور انہیں لگا وہ اسی درخت کی جڑ کو کاٹ رہے ہیں جس پر وہ بیٹھے ہیں— مگر اب کرتے بھی کیا تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

اگلے روز— الطاف اور شکوری کے بھاگ جانے کی خبر پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی—

اور اب طوفان گذرے دیر ہو چکی تھی۔ بیٹیاں جوان ہو گئیں۔ چھوٹی بیٹی نگینہ بالکل ماں کے مشابہ تھی۔ عادات و اطوار میں بھی ماں سے ملتی جلتی وہ جب بھی حسین میاں کے سامنے آتی۔ ان کا دل انجانے

خوف سے لرز اٹھتا۔ وہی چال، وہی ڈھال، آواز میں وہی نغمگی، ایسا لگتا نگینہ کی روح نے شکوری کا جسم پہن لیا ہو—

نگینہ حسین میاں کی سب سے لاڈلی بیٹی تھی مگر اس کی ایک بات انہیں بالکل پسند نہ تھی کہ وہ ماں کو برا بھلا کہتی تھی ہر روز کہتی۔

''بابا! آپ ماں کو بھول کیوں نہیں جاتے۔ بات بات پر ماں کا ذکر کرتے ہیں۔''

''بیٹی! محبتوں کے مسافر قیام نہیں کرتے۔ وہ تو مسلسل سفر میں رہتے ہیں۔

''بابا آج تک آپ کی کوئی بات میں سمجھ نہ سکی۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے آپ کو ہر وقت ماں کا ہی قصیدہ پڑھتے سنا ہے اور سب سے زیادہ دکھ تو اس بات کا ہے کہ آپ نہ اچھا کھاتے ہیں، نہ اچھا پہنتے ہیں۔ آرام دہ کمروں اور بستروں کو ترک کر کے دالان میں دھوپ کی لپک اور تپش میں تخت پر پڑے رہتے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں کہ کیا دیا ہے اس تخت نے اور تخت والی نے آپ کو؟ کیوں اتنی محبت کرتے ہیں۔ اس تخت سے کیوں اس پر بیٹھے ہوئے اپنی بوڑھی ہڈیوں کو اذیت دیتے ہیں؟

''بس کر بیٹی! تجھے کیسے سمجھاؤں کہ کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جن میں سکھ کا احساس ہوتا ہے اور پھر بیوفائی کرنے والوں سے کیا گلہ۔ جیون کے اس لمبے سفر میں کون کس کا ساتھ دیتا ہے۔ تو بھی تو ایک دن اس بوڑھے باپ کو چھوڑ کر اپنے گھر چلی جائے گی۔ ہم سب ٹرین کے مسافر کی طرح ہیں۔ اپنے اپنے اسٹیشنوں پر اترتے رہیں گے۔ یہی نظامِ قدرت ہے—''

اور جب بیٹیاں اپنے اپنے گھر چلی گئیں تو حسین میاں کو اُن کے چلے جانے کا جیسے یقین ہی نہ آیا ہو۔ ہر وقت پکارتے رہتے۔ کبھی طاہرہ کو کبھی نگینہ کو۔ مگر اس وسیع و عریض حویلی میں صرف ایک بوڑھی خادمہ ڈولتی پھرتی نظر آتی اور وہ ہر پانچ دس منٹ بعد حسین میاں کو یقین دلانے کی کوشش کرتی کہ یہاں نگینہ اور طاہرہ اب نہیں رہتیں—

ایک صبح جب آسمان پر پرندوں نے سفر کا آغاز کیا، بھونرے پھولوں کے نزدیک آئے۔ ہواؤں نے گلشن کو صبح بخیر کہی اور مشرق کی جانب سورج کی پاکیزہ کرنوں نے لجاتے شرماتے مناظر کا گھونگھٹ کھولا۔ تبھی ایک کوا آنگن کی منڈیر پر آکر بیٹھ گیا مگر روز کی طرح آج اس کی کائیں کائیں میں صرف شور نہ تھا بلکہ اک پیغام تھا۔ تخت پر لیٹے ہوئے چودھری حسین کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ دوسرے ہی لمحے دور سے کہیں ریل کی سیٹی سنائی دی۔ کوا منڈیر سے اڑ گیا۔ ٹرین کسی اسٹیشن پر رک گئی تھی۔ منظر ساکت ہو گئے۔ حسین میاں کا ایک ہاتھ تخت سے نیچے اس طرح جھول رہا تھا جیسے تصور میں وہ شکوری کے سنہرے بالوں کو چھونے کی کوشش کر رہے ہوں——

کتنی عجیب بات ہے کہ جب انسان کو ساتھی کی ضرورت ہوتی تو لوگ اُسے تنہا کر دیتے ہیں اور جب

اُسے کوئی حاجت نہیں رہتی تو ہر کوئی اس کی طرف دوڑا چلا آتا ہے— دیکھتے ہی دیکھتے چودھری حسین میاں کے گھر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہوگیا— میت کو غسل دے کر جب تیار کیا گیا اور جنازہ لے جانے کی تیاری ہی تھی کہ نگینہ حسین میاں کا ایک وصیت نامہ لے کر آ گئی۔ جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ مرنے کے بعد ان کی تدفین اسی تخت کے نیچے دالان میں کر دی جائے۔

نگینہ نے آج اُس تخت کو غور سے دیکھا جسے دیکھ کر وہ ہمیشہ نفرت سے منہ موڑ لیا کرتی تھی۔ آج اسے لگا کہ بابا صحیح کہتے تھے'' کچھ دکھ ایسے ہوتے ہیں جن میں سکھ کا احساس ہوتا ہے۔'' ماں کی یادوں سے جڑے ہوئے اس تخت نے جس پر نفرتیں درج تھیں آج اچانک اس سے ایک رشتہ قائم کرلیا تھا۔ باپ کی میت فرش پر رکھی ہوئی تھی۔ مگر نگینہ تو اسی تخت پر باپ کو دیکھ رہی تھی۔

''بابا آپ کی ہر الجھی ہوئی بات اب میں سمجھنے لگی ہوں۔ میں سمجھ گئی ہوں بابا تم نے کیوں اپنی پوری زندگی اسی تخت پر گذار دی۔ نگینہ کا رو رو کر برا حال تھا۔

ستر برسوں بعد پہلی بار وہ تخت اپنی جگہ سے ہٹایا گیا۔ تاریخی حیثیت کا حامل وہ تخت جس نے سرد گرم تمام موسم دیکھے تھے۔ زر، زمین، زن، دنیا کے یہ تینوں معرکے سر کر لیے تھے اب وہ بھی اُداس نظر آ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد، قبر کی کھدائی شروع ہوگئی۔ پھاوڑے کی ہر ضرب طاہرہ اور نگینہ کے دل پر پڑ رہی تھی۔ تبھی جیسے آسمان سے کوئی بجلی ماحول پر گری—

''یہ کیا—؟'' گورکن کے ہاتھوں سے کدال چھوٹ گئی اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں— ''ہائے اللہ یہ سب کیا ہے عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ طاہرہ اور نگینہ کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

''ہٹ جاؤ سب لوگ گاؤں کے پردھان اپنی دھوتی سمیٹے ہوئے قبر میں اُترے اور بڑی احتیاط سے منظر کا جائزہ لینے لگے۔ اب گاؤں والوں پر یہ راز کھل رہا تھا کہ چودھری حسین میاں نے اپنی ساری زندگی تخت کے ساتھ کیوں گذاری۔ ایک ہی جگہ پر ہر وقت کیوں بیٹھے رہتے تھے۔

پولس بھی آ چکی تھی اور اب قبر سے ان دو انسانی ڈھانچوں کو نکالا جا رہا تھا جو ایک مرد کا تھا اور، دوسرا عورت کا—

قنبر علی

بابا

نام تو اس کا تر لوچن پرشاد تھا۔ لیکن وہ اب وہ تر لوچنا سے صرف لوچن ہو گیا تھا۔ خود بھی اب وہ اپنے آپ کو لوچن ہی کہتا اور تمام لوگوں کو باتوں ہی باتوں میں اس کا یہ فقرہ ازبر ہو گیا تھا۔ ''پیر جی کی کرپا نہیں ہوتی تو یہ لوچن آپ لوگوں کی سیوا کیسے کرتا۔''

فساد میں کچہری کمپاؤنڈ کا مزار توڑ پھوڑ سے بچا رہا۔ اس کے عقیدت مندوں کے تعداد بھی بہت تھی پر رحمت میاں، خاندانی مجاور فساد کے دوسرے دن سے ہی لاپتا ہو گئے تھے۔

یوں تو ریڈیو اسٹیشن کے باہر کے مزار کو شیو مندر میں تبدیل کرنے میں لوچن کا بڑا ہاتھ تھا۔ توڑ پھوڑ میں یہ سب سے آگے تھا۔ لیکن ہزار جتن کے بعد بھی شیو مندر کی طرف لوگوں کو آکرشت نہ پا کر لوچن نے وہاں سے اپنا ڈیرہ ڈنڈا اٹھا لیا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن کے احاطے کے باہر مزار کے پاس اس کی پان کی دکان تھی جہاں دن بھر لوگ اڈا بازی تو خوب کرتے، پان کم کم کھاتے۔ یہاں کچہری کمپاؤنڈ کے مزار کے ٹھیک سامنے اس نے مٹھائی کی ایک دکان کھولی تھی اور پھر مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے اندر اگر کی بتیاں اور موم بتیوں کے علاوہ مزار پر عقیدت مندوں کے چڑھانے کے لیے طرح طرح کی خوش رنگ گوٹے پٹھے سے مزین چادریں بھی بنوا کر رکھ لیں تھیں۔ پھر ایک دن مزار سے قریب ہی رہنے کے لیے ایک جھونپڑا بھی ڈال لیا تھا۔ اس کی دکان چمک اٹھی تھی۔

کچہری کمپاؤنڈ سے متعلق اکثر ملازمین اپنی کوئی سی بھی کامیابی کے بعد مزار پر شیرینی چڑھانے نذو نیاز کے لیے ضرور آتے۔ کسی کی فائل کہیں اٹکی ہو یا کسی کا پروموشن کہیں فائل میں پڑا پڑا کسی ٹیبل پر بے جان ہو گیا ہو یا مقدمے کی کارروائی کس حق میں ہو جائے۔ بلا مذہب و ملت مزار پر عقیدت مند آتے۔ اپنے من کی مرادیں پاتے۔ اکثر شام کی فضا اگر کی بتیوں سے پر تقدس اور موم بتیوں کی روشنی مزار کے اعتراف کو بقعہ نور بنائے رکھتی۔ قرب و جوار کے فقیر بھی ہر صبح اپنا آسن بچھائے دیر گئے رات تک مرادیں پانے جانے والوں کو دعائیں دیتے اور عوض میں انہیں بھی بابا کے طفیل پیٹ بھر دانا پانی مل جاتا۔

روزانہ مزار پر نذر و نیاز کے سلسلے سے لوچن کو روٹی کپڑا میسر تھا تو جمعہ جمعرات کے دن کی وافر آمدنی سے وہ اپنی بیٹی کی بدائی کا خرچ مٹھی مٹھی جمع کر رہا تھا۔ اس کی اپنی ذات پر کوئی خرچ بھی نہیں تھا۔ کپڑے نہایت معمولی پہنتا۔ ادھر جمعہ جمعرات کو پہننے کے لیے اس نے دو جوڑے خان ڈریس سلوائے تھے۔ بیڑی پیتا نہیں تھا اور پان اس نے کبھی کھایا نہیں تھا۔ جس طرح مکر شنکرانتی کے بعد دن روز بروز ایک ایک تل بڑھتا جاتا ہے۔ لوچن کی بیٹی بھی روز بروز اپنے شباب کا سفر طے کرتی جا رہی تھی۔ لوچن کو البتہ اس کی فکر

اب تک نہ ہوتی تھی۔ لیکن جب اسکوٹر مستری رام پرشاد مزار پر ہر جمعہ آنے جانے لگا اور اس نے اپنی بیٹی میں رام پرشاد کی دلچسپی کو کن انکھیوں سے دیکھ لیا تو جلد ہی بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کا خواب دیکھنے لگا۔

لوچن کے گراہکوں میں کارپریشن کے بڑا بابو اکھوری جی اس کے اچھے گراہک تھے جو اس کی گھریلو زندگی کی بھی گاہے گاہے خبر لیتے تھے اور لوچن کو ان کا سرپرست بننا اچھا لگا تھا۔ تبھی بیٹی کے لیے دھن جٹانے میں اکھوری بابو کے مشورے پر وہ سنجیدگی سے وچار کر سکا تھا۔ ایک دن صبح ہی صبح لوچن اکھوری بابو کے گھر آ گیا۔ اکھوری بابو نے اسے کمرے میں بٹھایا۔ ابھی حال چال پوچھنا ہی چاہتے تھے کہ لوچن بول پڑا۔ ''سرکار ہم نے دان دہیج میں بہت کچھ کرلیا پر اب اسکوٹر لینے کی بات پر وہ لوگ اڑ گئے ہیں۔'' لوچن کے چہرے پر پریشانی کی لکیریں یکا یک ہلکے پسینے سے گڈمڈ ہونے لگیں۔

''اچھا۔ اسکوٹر کی مانگ کرنے لگا۔'' اکھوری بابو نے تعجب ظاہر کیا۔

''ہاں سرکار'' لوچن کھڑا ہو گیا۔ اکھوری بابو کی طرف ایک قدم بڑھا اور باتوں کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''رام پرشاد کے گھر والے''..... ''اب آپ ہی کچھ کر سکتے ہیں.....'' وہ مطلب کی بات پر آتے آتے رک گیا۔ اچانک اپنی دھوتی کا ابھی ابھی کھلا ڈھیکا اڑسنے کے لیے وہ جھکا۔ اس بیچ اندر دروازے پر پڑا پردہ ہلکا سا ہلا اور ساتھ ہی اکھوری بابو کی بیوی کی آواز ابھری۔ ''سنتے ہیں۔ اندر آیئے... پہلے کون سے پونیہ نہیں کمائے جو اب گھر لٹانے کا شوق ہے۔'' بیوی کی آواز میں تلخی تھی۔ اکھوری بابو کے چہرے پر لاعلمیت کی سفیدی پھیل گئی۔ انہوں نے جواب میں کچھ جاننا چاہا۔ ''کیا کہہ رہی ہو؟''

''کہوں گی کیا؟'' اندر سے آواز پھر ابھری۔ ''سب کو قرض دینے سے اچھا ہے کہ گھر ہی لٹا دیجئے۔ جس تس کو آئے دن پیسے دینا... ہم کچھ نہیں جانتے... یہ سب مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

بیوی کی بات کو سمجھنے جاننے کے لیے اکھوری بابو کے گھر کے اندر تیزی سے داخل ہوئے جیسے کسی چیز کو ٹوٹ کر بکھرنے سے بچانا چاہتے ہوں۔ انکی بیوی جلی بھنی تھی۔ قریب گئے تو اس نے اپنا بھرپور غصہ جتایا۔

''اب کس آدمی کو قرض دے رہے ہیں۔ پہلے جس جس کو دیا۔ وہ تو وصول ہونے سے رہے۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ یہ لوگ سونالی کو بھی مٹی نہیں دینے والے۔''

''کیا سب بکے جا رہی ہو؟'' اکھوری بابو نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ پھر معاملہ صاف کرنے کے لیے بولے۔ ''کہاں سے تم نے قرض کی بات نکالی۔ لوچن قرض کہاں مانگ رہا ہے؟''

''کون لوچن؟''

''ارے وہی پیر بابا والا۔''

''تو پھر کیا لینے آیا ہے؟''

اب کے اکھوری بابو مسکرا بیٹھے اور فتح مندانہ انداز میں ایک قدم پیچھے ہٹے اور اپنی آواز میں کچھ وقار ڈال کر بولے۔

''وہ تو شکریہ کے دو بول کہنے آیا ہے۔''

''کیا پیسہ لوٹایا اس نے؟''

''اس نے کبھی قرض ہی کہاں لیا تھا۔''

''پھر شکریہ کس بات پر؟''

''ارے میں تو صرف مشورے دے دیتا ہوں... اس کی بیٹی کا بیاہ ہے نا۔ بیچارہ غریب آدمی ہے۔ اب شادی بیاہ تو ایک مصیبت ہے۔ غریب آدمی جب تک کچھ الگ سے ارجت نہیں کرتا۔ بچوں کی شادی اس کے لیے ایک خواب ہی ہوگا۔''

''اس کی بیٹی کی شادی میں آپ کیا کریں گے؟''

''میں کیا کروں گا۔ بس کچھ دھن حاصل کرنے کی ترکیب...''

''وہ کیسے؟'' ان کی بیوی بیچ میں بول پڑی۔

''روز کی دکانداری سے تو گھر بیچارہ چلا ہی رہا تھا۔ برسپت اور شکر کو دکانداری کچھ اچھی ہو جاتی ہے تو گھر اس کا ٹھیک ٹھاک سے چل جاتا ہے، مگر بیٹی کی شادی کے لیے دھن...''

''وہ روز کی آمدنی سے دو پیسہ بچائے۔ اور کیا۔''

''دو پیسے بچانا کیا آسان ہے؟'' اکھوری بابو کے لہجہ میں تھوڑی سی تلخی ابھری۔

''تو پھر کسی کے گھر ڈاکہ ڈالے''..... ان کی بیوی کی آنکھوں میں محلے کے بنیا گردھر کے بیٹا کی صورت ابھر آئی، جو باپ کے نام پر تین ہزار روپیہ لے کر گیا تو پلٹ کر نہ آیا۔ نہ اس کا اتا پتا چلا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنے دوست سارنگی ماسٹر کے ساتھ بمبئی نکل گیا۔

''ڈاکہ کیوں ڈالے گا؟''..... اتنا بولتے ہوئے اکھوری بابو بیوی کے قریب بیٹھتے ہوئے تفسیر جاننے اور بتانے کے ملے جلے انداز میں پھر بولے..... ''دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے۔''

''دوسری صورت کیا ہوگی؟''

''میں نے پہلے اس کو کچھ بتایا تھا اور اس نے بیٹی کی شادی کی تیاری بساط بھر کر بھی لی ہے۔''

''ایسا اسے آپ نے کیا بتایا جو...''

''آٹھ نو مہینے پہلے کی بات ہے۔ اس کو میں نے مشورہ دیا تھا کہ تم کسی مولوی وغیرہ کو پکڑو اور کچھ پیسے دلا کر مزار پر کچھ دنوں کے لیے بٹھاؤ۔ بابا کا جنم دیوس مناؤ۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ عرس کا کام تین چار دنوں تک چلا۔ اس نے کافی پیسے کمائے، اپنی بیٹی کی شادی کی بہت ساری تیاریاں پوری کر لیں۔''... اکھوری بابو مسکرائے اور ان کے چہرے سے مسکراہٹ پھسل پھسل کر ان کی بیوی کے چہرے پر گال مل گئی۔

بیوی کو مسکراتا دیکھ کر ان میں اچانک لوچن کی بیٹی کے گھونگھٹ کا ستارہ چمک اٹھا۔ واپس کمرے میں آئے تو لوچن کا کہیں پتا نہ تھا۔ پہلے تو تھوڑا شرمندہ ہوئے پھر جلدی جلدی تبدیل کرنے کے بعد کنگھی کرنے کے لیے اندر اُسارے میں آئے۔ ان کی بیوی نے اس بیچ چائے تیار کر لی تھی۔ چائے لے کر ان کے قریب آئی تو اک ذرا حیرت میں آکر پوچھ بیٹھی...

''کہاں چلے۔''

چائے کی پیالی ہاتھ میں لیتے ہوئے اکھوری بابو بولے۔

''تم کو کبھی کوئی سلیقہ نہیں آئے گا۔ خواہ مخواہ چیخنے لگی۔ لوچن بیچارہ چلا گیا۔ جانے کیا سوچے۔ ایک تو خود پریشان ہے۔ دوسرے...''

''اب کیوں پریشان ہے۔''

''پریشانی کی بات ہی ہے۔ اب لڑکے والا اسکوٹر مانگ بیٹھا ہے۔''

''اس میں آپ کیا کریں گے؟''

''وہی انجانا خوف... ارے میں اس سے کہوں گا کہ وہ اسکوٹر نہ دے۔ اسے ٹی وی دے دے۔ اسکوٹر مستری کو اسکوٹر کی کیا آوشیکتا... ٹی وی ہوگا تو لوچن کی بیٹی اکیلی گھر میں پڑی پڑی من بہلایا کرے گی۔''

''بات اسکوٹر کی ہو، یا ٹی وی کی۔ آئے گا کہاں سے؟ بیوی نے طنز کیا۔''

''اسی کے لیے تو بے چارہ لوچن آیا تھا۔'' انہوں نے چائے کی خالی پیالی سامنے پڑے ٹیبل پر رکھتے ہوئے آئینے میں ایک بار پھر اپنا چہرہ دیکھا۔ آئینے میں بیوی کا چہرہ بھی دکھائی دے گیا۔ نظر بھر کے دیکھنے کے لگے تو عکس نے سوال کر دیا...

''آپ اب کیا کریں گے...؟''

''مجھے تم آج بھی وہی پہلے والا... سمجھتی ہو... میں کیوں پیسہ دینے لگا؟''

''پھر کیا کیجئے گا؟''

''وہی تو سوچ رہا ہوں۔''

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اکھوری بابو نے آئینے میں پھر اپنا چہرہ دیکھا اور یکا یک مسکراتے ہوئے باہر جانے لگے تو بیوی کے سوال نے پھر ان کو روک لیا...

''کیا کریں گے آپ؟''

''سوچتا ہوں کہ لوچن سے کہوں کہ وہ پھر بابا کے مزار پر ایک بڑا عرس کرائے جو کم از کم ایک ہفتے تک چلے۔''

اکھوری بابو کی بیوی طنز اور حیرت کے ملے جلے انداز میں مسکرا کر بولی۔

''اب کون عرس ہوگا۔ اب تو سال بھر بعد ہو سکتا ہے نا۔''

''ہاں... ہاں... یہ ٹھیک ہے... کیا ایسا نہیں ہو سکتا۔''

اکھوری بابو اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

''ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ ایک اور عرس کرائے اور اب کے یہ کہے کہ اسی دن بابا کی بھگتی سویکار ہوئی تھی۔''

اتنا کہہ کر اکھوری بابو مسکرانے لگے اور ان کی بیوی کے چہرے پر اطمینان کا رنگ کوند گیا اور پھر اکھوری بابو گھر سے باہر نکل گئے۔

موہن دھیبر

ہوا چھت سے سیڑھیاں اُتر کر سرہانے کی کھڑکی سے اندر آ رہی تھی۔ باہر سب کچھ آدھا ادھورا سا تھا۔ امرود کی شاخیں، میگھلا آکاش اور گیلا سا چاند۔

کھڑکی کے باہر امرود کے پتوں پر بارش کے قطرے ہیرے کی کنی کی طرح جھل مل جھل مل کر رہے تھے۔ پچھلے کئی دنوں کی بارش نے انہیں اجال دیا تھا۔ بچے سارا دن کچے پکے پھلوں سے الجھے رہتے۔ کبھی کبھی ایک آدھ میری طرف بھی اُچھال دیتے۔ باہر سے ہرا اور اندر سے لال لال۔ بچپن میں امرود کے پتوں کو پان کی طرح چباتا تو پورا منہ کسیلا ہو جاتا۔ اس کی ہری پیک ہونٹوں کے گوشے سے بہہ نکلتی۔ سرما کے ختم ہوتے ہی اس کے پتے پورے آنگن میں بکھر جاتے۔ ہوا ان خشک پتوں کو اِدھر سے اُدھر بہارتی رہتی۔ میں انہیں بٹور کر کچرے کے ڈبے میں ڈال آتا لیکن دوسرے دن آنگن پھر زرد پتوں سے بھر جاتا۔

وہ نیم کی پھنگی جو بچپن سے مجھے نہارتی تھی۔ دھندلکے میں کہیں گم ہو چکی تھی، لیکن مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ میرے ذہن کے کسی گوشے میں اب بھی سانس لے رہی ہے۔ سارا سارا دن رُت رُت کی دھوپ اس پر بیٹھا کرتی۔ اب دن کے اُجالے میں ادھر دیکھتا تو میری نظر بجلی کے ننگے تاروں سے الجھ کر دم توڑ دیتی۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، میں نے لائٹ آن کر کے سامنے پڑی کتاب اٹھا لی۔ ورق گردانی کرتے ہوئے میری نظر Thomas Gray کے مرثیے Elegy written in a church yard پر جم گئی۔ میں جب بھی اسے پڑھتا ایک جہان دیگر میں پہنچ جاتا۔ اسے پڑھنے کے بعد میری نیند اور بھی مجھ سے دور ہو گئی، میں نے کتاب رکھ دی۔ میرے ذہن نے پیچھے بہت پیچھے کی طرف لوٹنا شروع کیا۔

مجھے یاد آیا وہ اوٹ پٹانگ کتابیں پڑھنے کا موسم تھا۔ صبح کی نرم دھوپ نیم کی پھنگی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ آنگن میں موہن دھیبر ابا سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ اکثر ہمارے ہاں آیا جایا کرتا۔ ناک نقشہ بھی موہنا سا۔ سیاہ چمکدار رنگ، چھریرا اونچا قد، تیز مگر قدرے باریک آواز، نیلی قمیص اور پرانی دھوتی، منہ میں پان، ہنستا تو اپنے بے ترتیب دانتوں کے ساتھ اور بھی پیارا لگتا۔ اس دن اسکول جاتے ہوئے میں دھیبر پاڑا سے گذرا۔ ایک سجے سجائے پنڈال کے نیچے رنگ برنگ کپڑوں میں بچے چہک رہے تھے اور بوڑھے خوش گپیوں میں مگن۔ جگر جگر پوشاک میں عورتیں گنگا پوجا کی تیاری میں مشغول تھیں۔ میری نظر موہن دھیبر پر پڑی۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ بچپن میں ہر صبح میں بھاگ کر پاس کے تالاب پر پہنچ جاتا جہاں وہ پہلے سے موجود ہوتا۔ ان دنوں تالاب کے ٹھہرے ٹھہرے مبہوت پانی میں شالوک کے سفید اور گلابی پھول مسکراتے تھے۔ تالاب چاروں طرف سے فالسہ، ناریل، آم، جامن، بیل، گولر، املتاس کے پیڑوں اور ناگ پھنی، سندھامنی کے پودوں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف چکوڑے کے پتوں سے بھرا چھوٹا سا میدان جس میں اگی

ہوئی نرم نرم گھاس پر زور سے پاؤں مارتا تو کیچ سے انگلیوں میں پھنس جاتی اور عجیب سی گدگدی بھری لذت کا احساس ہوتا۔ آس پاس بجی سجائی تتلیاں ادھر ادھر اڑتی پھرتیں۔

پاس ہی ایک پختہ گھاٹ جس کی سیڑھیوں کی دونوں جانب پانچل تھی۔ ساون بھادوں میں گھاٹ کی نچلی سیڑھیاں اور پانچل کے اگلے سرے پانی میں ڈوب جاتے جن پر کائی بیٹھ جانے سے پھسلن ہوتی۔ دن بھر لڑکے پانچل کی ڈھلان پر دوڑتے ہوئے پانی میں چھلانگ مارتے۔ کوئی قلابازی کھاتا تو کوئی سر کے بل کودتا۔ کوئی پھسل کر پانی میں گر پڑتا تو اس کی پسلی اور رانیں چھل جاتیں۔ اکثر عورتیں گھاٹ پر کپڑے دھوتے ہوئے کہتیں کہ بیچ تالاب کے تل میں سونے کے کھٹولے پر ناگ ناگن کا ایک جوڑا رہتا ہے۔ میں جب بھی تیرتا ہوا بیچ میں پہنچتا تو مجھ پر خوف طاری ہو جاتا۔ میری سانس اٹکنے لگتی۔ ان دنوں مجھے بیڑی پینے کی لت پڑ گئی تھی۔ اکثر ابا کی بیڑی کے بنڈل سے بیڑیاں چرا لیا کرتا۔ سلیمہ جو میرے ساتھ رہنا زیادہ پسند کرتی خوب بیڑی پیتی تھی۔ ہم دونوں کئی کئی بار تالاب میں نہاتے۔ سہ پہر کو تالاب عموماً خالی رہتا۔ تیرتے وقت وہ اپنے لمبے بالوں کا جوڑا پیشانی پر اس طرح باندھ لیتی جیسے ریلوے انجن کی ہیڈ لائٹ۔ ایک بار منہ سے بھک بھک دھواں نکالتی ہوئی اس نے کچھ اس انداز سے مجھے تالاب پر چلنے کو کہا کہ میں فوراً راضی ہو گیا۔ ساتھ ہی میرا سارا بدن سنسنا اٹھا۔ شاید ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ اس کیفیت کا اظہار کرتے کرتے شرما کر رہ گیا تھا۔ اس نے بہت ضد کی مگر میں بات پوری نہ کر سکا اور اپنے تپتے بدن کو پانی کے حوالے کر دیا۔

اس دن بھی موہن دھیمر مجھ سے پہلے تالاب پر موجود تھا۔ ہوا بھری لاری کی ٹیوب، اس پر بچھا لکڑی کا تختہ، وہ درمیان میں کھڑا اپنے جال کو کندھے کے گرد پوری قوت سے کئی بار گھما کر تالاب میں پھینکتا تو کھڑا رہتا پھر جال کی رسی کو جھٹکے دے دے کر کھینچتا جاتا۔ دھیرے دھیرے پورا جال سمٹ کر اس کے قدموں میں آ جاتا۔ وہ جھک کر جال کی تہہ پلٹتا جاتا اور مچھلیوں کو ایک ایک کر کے صراحی نما بانس کی ٹوکری میں ڈالتا اور چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو پانی میں پھینکتا جاتا۔ اس کے جال میں سوکھی ڈالیاں اور ٹن کے ٹکڑے بھی آ جاتے جنہیں وہ دور اچھال دیتا۔ پھر وہ پانی میں ساکت کھڑے بھیلے کو بانس کے سہارے کھیتا ہوا کنارے پر لے جاتا۔ اسے مچھلیاں وہیں ملتیں۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہتا۔ بانس سے ٹیک لگا کر اس کا جال کھینچنا مجھے بہت اچھا لگتا۔ کسی دن زیادہ مچھلیاں ہاتھ آتیں تو وہ ایک آدھ میرے حوالے کر دیتا۔ مچھلی اتنی لس دار اور چکنی ہوتی کہ میرے ہاتھوں سے پھسل پھسل جاتی اور زمین پر گر کر تڑپنے لگتی، اس کا منہ ہپ ہپ کرتا میں اسے مشکل سے قابو میں کر پاتا۔ ایک سال اتنی بارش ہوئی کہ سارا تالاب لبالب بھر گیا۔ اس سے پہلے کہ پانی آس پاس کے گھروں میں داخل ہو اس نے عرصے سے بند پڑے نالے کی مٹی کاٹ کر اسے تالاب سے ملا دیا۔ رات بھر میں نہ جانے کتنی مچھلیاں اس نالے سے بہہ گئیں۔ ایک طرف یہ آفت ناگہانی دوسری طرف اسے تالاب کے مالک کو بھی خوش رکھنا پڑتا۔ تہوار یا خاص خاص موقع پر اس کے گھر مچھلی پہنچانی پڑتی۔ ارد گرد کچھ ایسے بھی مہربان تھے جو راتوں کو ٹھٹھی یا جال کے پھندے پھینک کر اس کی مچھلیاں چرا لیتے۔ اس کے لیے اُسے راتوں کو چکر لگانے پڑتے۔ یہ ساری باتیں وہ ابا کو بتایا کرتا۔

اس دن تالاب کے کنارے کافی بھیڑ تھی۔ محلے کے ایک مستان نے اسے بری طرح پیٹ دیا تھا۔

اس کی کھالوئی میں مچھلی کم تھی تو کیا ہوا۔ اس نے مچھلی دینے سے انکار کیوں کیا تھا۔ اس دن وہ ہمارے گھر آیا تو اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ دوسرے دن ایک اور مصیبت، تالاب کی ساری مچھلیاں مر کر سطح پر پھیل گئی تھیں۔ شاید کسی نے تالاب کے پانی میں فولی ڈول (Folidol) ملا دیا تھا۔ اس دن چیل کوؤں کی بن آئی تھی۔ کبھی کبھی آسمانی عتاب بھی اس پر نازل ہوتا۔ شہر کے بیشتر حصے کوئلے کی کانوں کی وجہ سے کھوکھلے تھے۔ ایک دن تالاب کی زمین سرک جانے سے سارا پانی اندر چلا گیا۔ پورا شہر تالاب کو دیکھنے امڈ پڑا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی تالاب ہے جس کے کنارے میں دائیں طرف جھک کر زور سے ٹھیکر پھینکتا تو دور تک وہ سطح پر پھیلتی چلی جاتی۔

ساعتوں کے احاطے میں ماہ و سال کی گرد اڑتی رہی، موسم بدلتے رہتے۔ اب ان پیڑوں کی جگہ پختہ مکان تھے۔ میدان کی ساری ہریالی ریت اور سیمنٹ کی چادر سے ڈھک گئی تھی۔ وہ تالاب بھی سمٹ کر کچوری پانی کے پتوں میں پوری طرح چھپ گیا تھا۔ اس دن آفس میں بیٹھا کسی کام میں الجھا ہوا تھا کہ اردلی نے مجھے اطلاع دی کہ کوئی ملنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے اندر بھیج دینے کو کہا۔

''نمسکار بابو'' موہن دھیمر میرے سامنے تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا تو وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ میں نے اٹھ کر اسے کرسی پر بٹھایا اور اس کے لیے چائے منگوائی۔ عرصہ بعد ملاقات ہوئی تھی۔ حال چال معلوم کرنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا کوئی کام ہے؟''

اس نے کارخانے کے باہر بیکار پڑے تالاب کو لیز (Lease) پر لینے کی خواہش ظاہر کی۔ جس میں وہ مچھلی کی کاشت کرنا چاہتا تھا۔ اس تالاب سے پمپ کے ذریعہ کارخانہ میں پانی آتا تھا۔ ساتھ ہی دوسری طرف اِدھر اُدھر سے نالوں کے ذریعہ اس میں ڈھیر سارا پانی جمع ہوتا رہتا تھا۔ میری کوششوں سے وہ تالاب دو سال کے لیے اسے لیز پر مل گیا۔ اس پر بڑھاپے کے آثار نمایاں تھے۔ گٹھیا کی وجہ سے اس کی چال میں لچک سی آ گئی تھی۔ اس کے لڑکے بھی اس کے دھندے سے جڑ گئے تھے۔ چھوٹا لڑکا مچھلی لے کر ہاٹ میں بیٹھا کرتا۔ ایک شام گھر پہنچا تو بیوی نے کہا کہ کوئی آدمی مچھلی دے گیا ہے۔ بار بار کہنے پر بھی اس نے پیسے نہیں لیے، میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ مجھے اس کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی۔

اگلی اتوار کی صبح وہ میرے گھر آیا تو میں نے اسے تنبیہ کی تو اس نے مجھ سے کہا۔ ''بابو! آپ کا بابا بھی اسی کارخانے میں تھا جہاں آپ چاکری کرتا ہے۔ وہ مانس نہیں تھا بابو، دیوتا تھا دیوتا، ہمارا اوپر کیا کیا اپکار کیا تھا۔ ہم بولنے نہیں سکتا، سارا جیون اسے بھولنے نہیں سکتا۔''

اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ میں ایک کرب ناک خموشی کی دلدل میں دھنستا چلا گیا۔

چند دنوں بعد اس کی لڑکی کی شادی ہوئی، میں اپنی بیوی کے ساتھ اس میں شریک ہوا تو وہ خوشی سے نہال ہو گیا۔ اس نے ہماری خوب خاطر کی۔ دن بدلتے گئے۔ اب وہ بہت کم ہمارے یہاں آتا جاتا۔ رستے میں کہیں دکھائی نہیں پڑتا۔ ایک دن اچانک صبح صبح اس کے لڑکے نے آ کر میرے دل پر ایک ضرب لگائی۔ میرے اندر کہیں کچھ ٹوٹ سا گیا۔ مجھے یوں لگا کہ پوری قوت سے گھما کر پھینکا ہوا جال، صراحی نما ٹوکری، ہپ ہپ کرتی مچھلیاں، تالاب اور پیڑ پودوں کے ساتھ وہ نیم کی پھنگی پر بیٹھی ہوئی صبح کی نرم دھوپ مر گئی ہے۔

ناصر راہی

شبھ راتری

"ہوا مار ڈالا"

یہ وہ آواز تھی جو گریہ کناں ماں کے اجاڑ سینے سے نکلی، ہوا میں اڑی اور قرب و جوار تک جا پہنچی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگ اس کے چوکھٹے سے آگے جہاں ایک نوجوان کی نچڑی ہوئی لاش پڑی تھی جسے جنگل کے کسی وحشی درندے نے چیر پھاڑ کر چھوڑ دیا تھا۔

''ستم یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی جنگلی درندوں سے محفوظ نہیں ہے!'' گرد و نواح کی مشترکہ آوازیں سوگوار ہوا میں ابھریں۔

ان کے نزدیک یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ آئے دن وحشی جانور جنگلوں میں اترنے والوں کو بری طرح چیر پھاڑ کھاتے تھے اور خون کی تازہ چھینٹیں، بدن سے نیچے لوتھڑے اور جھاڑیوں میں پڑے خون سے سنے کپڑے شناخت کے لیے پیچھے چھوڑ جاتے تھے۔

ان دنوں جنگل سے کوئی محفوظ نہ تھا، پھر جب جنگلوں میں درندوں کے خوف کے باعث انسانی قدموں کی آہٹ معدوم ہوگئی تو گوشت کے ذائقوں اور لہو کی لذت نے انہیں شب خون پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کی آبادیوں کے اوپر رات اندھیرے موت کے سائے منڈلانے لگے۔ جب ان میں باہمی فیصلہ ہوا کہ ''شب خون کا مداوا کیا ہوا؟'' تو سب کے سب فیصلے کی آگ اپنے اپنے دروازے کے آگے جلانے لگے اور مسلح ہو کر ایک بڑے الاؤ کے گرد پہرے پر بیٹھ گئے۔

ہر رات حملہ آور درندوں کے در آنے کے خوف کو روشن آگ کے حوالے کر دیا جاتا۔ اندھیری رات کی زبان پر قصے زندہ رہتے اور صبح کی تازہ ہوا ان کے اوراق اڑا لے جاتی۔ دراصل یہ آگ جنگل کے خوف سے جی رہے لوگوں کے لیے ایک کامیاب نسخہ تھی۔

کہتے ہیں جنگل کے وحشی درندے مذہب و دھرم کے شتر و تھے نہ ہی نسل کشی کے دشمن! انہیں تو صرف آدمی کے ماس اور رکت کا لوبھ تھا۔

یہ گذشتہ بات تھی۔

انسانی آبادی جب اپنے بے شمار ہاتھ پاؤں زمین پر اگانے لگی تو گھنے جنگل اور اس کے جانور اپنی اپنی جگہ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ پھر خالی قطعوں پر انسانوں نے اپنی چھتیں پاٹ لیں۔ لوگ بلاتفریق ایک ساتھ رہنے لگے۔ مدتوں ساتھ رہنے کے بعد ایسا ہوا کہ دو جانوروں نے ان کے درمیان فاصلوں کی

سرحدیں کھینچ دیں۔

خوف پسند لوگوں نے گائے کی ہڈیاں چبانے والوں کے گھروں کو پھونک دیا۔ پھر کیا تھا، ایک ہی خطے کے لوگ اپنے اپنے جانوروں کو لے کر دو حصوں میں بٹ گئے۔ خود کو غیر محفوظ سمجھنے والی قوم نے اپنے لیے محفوظ ترین مقام ڈھونڈ لیا۔

کہا جاتا ہے۔ سب سے قیمتی شے انسان کی جان ہے!

اور جب نعمان کی جان چلی گئی پوری بستی پر موت کی سی خاموشی چھا گئی اور قسمہ جو کہ ملت نگر بستی کا تسلیم شدہ سردار تھا، اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے پیچھے سے اس کی گردن لے لی ہو۔!

پہلے پہل تو سب نے یہی سمجھا کہ نعمان بغیر بتائے کہیں چلا گیا ہے لیکن جب تشویش دلوں میں گھر کرنے لگی تو ان لوگوں نے اپنے قرابت داروں کے دوازے کھٹکھٹائے تو ان لوگوں نے نفی میں سر ہلایا۔

اگلی صبح یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پوری بستی میں پھیل گئی کہ نعمان کی لاش دھرم نگر کے نالے میں پڑی ہوئی ہے اور پولس دھرم نگر کے لوگوں سے تفتیش کر رہی ہے۔

پولس والوں کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ دھرم نگر کے لوگوں نے نعمان کا قتل کر کے اپنے نالے میں پھینک دیا ہے۔

یہ دھرم نگر — ملت نگر بستی سے تقریباً دو کلو میٹر کی دوری پر واقع ہے۔

پوسٹ مارٹم پھر تجہیز و تکفین کے بعد یہ فیصلہ لیا گیا کہ ملت نگر کے لوگ خون کا بدلہ خون سے لیں گے۔

انتظار کے لمحوں میں ایک اتفاق ہی تھا کہ ایک وجیہہ نوجوان قسمہ کے ہاتھوں لگ گیا، جو جانے کیسے ملت نگر کی طرف آنکلا تھا۔

قسمہ نے اسے دیکھا تو تقریباً چیخا — ''کون ہے تو اور یہاں کیا کر رہا ہے؟''

''میں تمہاری طرح ہی ایک انسان ہوں بھائی، نام سے میں پارس کمار ہوں۔'' اس نے بڑی شائستگی سے جواب دیا۔

''کہاں رہتا ہے تو —، قسمہ نے گرجدار آواز میں پوچھا۔''

''اس اور... دھرم نگر میں!''

''تو تو یہاں کیا لینے آیا ہے؟''

''بس یوں ہی چلا آیا!''

''تجھے کیا معلوم نہیں — تیرے میرے علاقے بٹے ہوئے ہیں!''

''بھئی مجھے کسی محلے یا علاقے سے کیا لینا دینا ہے۔'' پارس بولا۔ ''بھگوان کی دھرتی پر آدمی کہیں بھی آجا سکتا ہے۔''

''کیا کہا تو نے — قسمہ اس پر برس پڑا... کی دھرتی پر... ! ابے جس جگہ تو کھڑا ہے نا، وہ ہماری

زمین ہے کسی ایشور بھگوان کی نہیں۔ چل تجھے تیرے بھگوان کے پاس بھیجتا ہوں—" اتنا کہہ کر قسمہ نے اس کے گریبان کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا اور کھینچتے ہوئے ایک طرف لے جانے لگا۔ وہ بغیر کسی مزاحمت کے اس کے ساتھ ہولیا...!

قسمہ اسے بستی کی اوٹ میں ایک کوٹھری کے اندر لے گیا۔ اس کے پیچھے ایک دولڑکے ہولیے۔ کوٹھری کے اندر وہ اس کے گھنے بال کو اپنی مضبوط مٹھی میں کستا ہوا بولا۔ "تیری کوئی آخری خواہش ہے تو بتا دے کیونکہ آج کی رات تو اپنے بھگوان...! اس نے وہاں پہرے پر دولڑکے بٹھا دیئے۔

شام ڈوبنے لگی تو رات کے جھینگر تیز نم ہواؤں میں عجیب سی کہانیاں کہنے لگے۔ ایک بڑے سے گھر میں فیصلہ ہوا۔ "ہم نعمان کی موت کا بدلہ لیں گے۔ وہ وقت خود بہ خود آ گیا ہے جس کا ہمیں بے صبری سے انتظار تھا۔

رات نے پہلی کروٹ لی۔

قسمہ اور اس کے ساتھ کوٹھری کے دروازہ پر پہنچے تو وہاں مستعد لڑکوں میں سے ایک نے دروازہ کھول دیا۔ باہر کی ہلکی مدھم روشنی کھلے دروازہ ہو کر اندر در آئی۔

وہ کوٹھری کے اندر پرسکون انداز میں فرش پر دراز تھا... قسمہ کے ہمراہیوں نے اس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ دیے اور منہ پر ایک سفید پٹی چسپاں کردی۔ اس پر تاہم اس نے اُف تک نہ کی، بس انہیں سفید اجلی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

جب دور فضا میں ایک ساتھ سیکڑوں آوازیں امتیازی نعرے بلند کرنے لگیں تو ملت نگر کو یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ دھرم نگر کے لوگوں کو پارس کی بھنک مل گئی ہے اور سب کے سب بلوا کے ارادے سے بستی کی اور گھسے آ رہے ہیں۔

ان لوگوں کے سامنے ایک غیر یقینی صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ وہ لوگ فوراً ایک حتمی فیصلے کو پہنچے۔ جبھی کئی پولس گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی وہاں آ لگیں— پولس کے جوان، رائفل لیے گھیرا ڈالنے لگے اور کچھ رائفل بردار بلوا کے ارادے سے آئی ہوئی بھیڑ کو روکنے کے غرض سے آگے بڑھ گئے۔

مرتعش وحشت ناک آوازوں کو سن کر ان لوگوں نے اپنی اپنی تلواریں سونت لی تھیں۔

"ملت نگر کے لوگوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے گھر سے باہر نہ نکلیں ورنہ گولی ماردی جائے گی۔" شہر کا ایس پی، امرکانت ماتھ پیس پہ بول رہا تھا۔ "اور بلوائیوں کو ہوشیار کیا جاتا ہے کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھوں میں نہ لیں، آرڈر نہ ماننے والے کو شوٹ کردیا جائے گا اور ملت نگر کے لوگ سن لیں کہ ہمارے معتبر ذرائع کے مطابق پارس کمار آپ کے قبضے میں ہے۔ اگر میرے دس گننے تک پارس کمار کو ہمارے حوالے نہ کیا گیا تو ہمارے لوگ ایک ایک گھر کی تلاشی لیں گے۔"

اِدھر قسمہ نے وقت کی سنگینی کو پڑھ لیا تھا۔ اس نے فوراً تہیہ کرلیا کہ وہ اپنے لوگوں کو اس یکا یکی عذاب

سے بچالے گا، بھلے ہی اسے جیل کیوں نہ جانا پڑے۔ اس نے یکبارگی اپنے ہمراہیوں سے کہا۔ ''اپنے لوگوں میں جاکر کہہ دو کہ وہ اپنے اپنے گھروں میں بند رہیں، میرے اشارے اور حکم کے بغیر باہر نہ نکلیں۔'' پھر اس نے خود ہی اپنے ہاتھوں سے پارس کے ہاتھ پاؤں کی رسی اور منہ کی پٹی کھول دی اور پارس سے وا ہوائے — ''تو تو تقدیر کا بڑا بجار نکلا۔ بے شک موت سے پہلے کوئی نہیں مرتا۔ چل میرے ساتھ چل!!''

معاً فضا میں ایک بلند آواز ابھری۔ ''ایس پی صاحب، میں بستی کا سردار قسمہ بول رہا ہوں۔ پارس میری تحویل میں ہے اور محفوظ ہے۔ میں اسے آپ کے پاس لے کر آرہا ہوں۔''

اب وہ دونوں ایس پی امرکانت کے پاس کھڑے تھے، ٹارچ کی روشنی میں وہ دونوں کو استفہامیہ نظروں سے گھور رہا تھا۔ ''تم میں پارس کمار کون ہے؟'' قسمہ پاس کھڑے پارس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا — ''یہ ہے پارس کمار...! اور میں سردار قسمہ ہوں۔ میں نے قصاص لینے کے واسطے اسے اپنے یہاں رکھا تھا۔ میں ان لوگوں کو یہ بتا دینا چاہتا تھا کہ جب تم اپنی بستی اور علاقے میں کسی مسلمانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو بھلا ہم کیسے اپنی بستی میں کسی غیر مسلم کو برداشت کریں، ایس پی صاحب پارس کا میرے سوا کوئی اور قصوروار نہیں، آپ خوشی سے مجھے گرفتار کر سکتے ہیں!

''جناب، یہ بات نہیں، پارس نے بڑی دھیر جتا سے کہا۔ ''مجھے معلوم پڑتا ہے میرے دوست قسمہ کا ماتھا پھر گیا ہے۔ جبھی سے یہ بے سر پیر کی باتیں کیے جارہا ہے۔ واستو میں آج رات میں اس کے ہاں کھانے پر آمنترت تھا۔ کھانے پینے اور پھر بات چیت میں یہ پتہ ہی نہ چل پایا اور دور بھاگیہ سے رات ادھک ہوگئی۔ اس لیے میں یہاں ٹھہر گیا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ہم سبھوں کو ایسی گمبھیرا ستھتی کا سامنا کرنا پڑے گا، جناب پلیز مجھے اپنا ماؤتھ پیس اور چونگا دیجیے تاکہ میں اپنے لوگوں کو بتا سکوں کہ میں یہاں اپنے متر کے گھر آیا ہوا ہوں اور بالکل سرکھچت ہوں۔

ایس، پی امرکانت نے بھی اپنی خاموشی کو رات کے اندھیرے میں ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے یوں توڑا جیسے وہ سب کچھ سمجھ کر بھی مطمئن ہے۔

اب نعرے کی آواز ماند پڑگئی تھی۔ ایس پی امرکانت کے ساتھ پارس جب کار میں بیٹھ گیا تو اس نے کار کے ہیڈ لائٹ کی روشنی میں قسمہ کو دیکھا اور اپنے ہاتھ کو باہر ہوا میں لہرایا۔ ''قسمہ جارہا ہوں دوست! ایشور نے چاہا تو پھر ملیں گے، اچھا شبھ راتری!

''شب بخیر پارس، شب خیر!'' یہ وہ آواز تھی جو قسمہ کے رندھے ہوئے گلے سے نکلی اور پوری بستی میں پھیل گئی۔

ہیرا پرا بزار میں رہا چھار لپٹائے
بیتک مورکھ چل گئے پارکھ لیا اٹھائے
— کبیر

یہ عہد فکشن کا ہے—
اور فکشن کی تنقید... ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے
اردو فکشن کی لجنڈ قرۃ العین حیدر سچ کہتی ہیں کہ ''فکشن کا شعبہ، سنجیدہ تنقید سے محروم ہے۔'' فکشن کی تفہیم اور تجزیے کے لیے جس ذہن رسا اور منطقی معروضی نظر کی ضرورت ہے، وہ ہمارے عہد میں خال خال ہے۔ فکشن کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا جارہا ہے، تنقید اتنی ہی سمٹتی اور سکڑتی جارہی ہے۔ بس فہرست سازی اور اسم شماری تک محدود ہوکر رہ گئی ہے ہماری افسانوی تنقید، جب کہ نیا افسانوی منظرنامہ اور جدید روائی تخلیقی کینوس، روز، روشن سے روشن تر ہوتا جارہا ہے۔ ایسی سچویشن میں نئے تنقیدی تناظرات میں نئے تخلیقی امکانات اور تازہ بشارتوں کی تفہیم اور تجزیے کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ 'استعارہ' نے اسی کے پیش نظر 'فکشن نمبر' شائع کیا جسے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں شامل چالیس افسانوں کا انتخاب اور تجزیہ اب الگ سے کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔ مشمولہ افسانوں کا تجزیہ، نئی نسل کے تخلیقی ناقد راشد انور راشد کی جاں گسل محنتوں کا ثمرہ ہے۔ راشد انور راشد نے بالکل تازہ ترین تنقیدی طریق کار سے ان افسانوں کا جائزہ لیا ہے اور افسانوں کے باطن میں مخفی مفاہیم روشن کیے ہیں۔ اس تجزیے میں سوچ کی تھکن، بوڑھی آنکھوں کی کم نگہی، نہیں بلکہ تازہ نگاہی نظر آئے گی۔ مجھے امید ہے کہ نئی افسانوی کائنات کی تفہیم اور قدر شناسی میں اس کتاب سے کافی مدد ملے گی۔ اس سے تخلیقی ابعاد روشن ہوں گے اور نئی طرفیں بھی کھلیں گی...

حقانی القاسمی